آدم خور کا تعاقب

(مہم جوئی، فرار اور انسانی عزم و ہمت کی لازوال داستانیں)

انتخاب

طارق اسمٰعیل ساگر

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز
الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور
فون 7223584-0300-4125230

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	.....	آدم خور کا تعاقب
انتخاب	.....	طارق اسمٰعیل ساگر
ناشر	.....	مسعود مفتی
		سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور
مطبع	.....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
پروف ریڈنگ	.....	زاہد ملک
سن اشاعت	.....	اکتوبر 2008ء
قیمت	.....	=/200 روپے

.....ملنے کے پتے.....

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز

الحمد مارکیٹ، 40۔اُردو بازار، لاہور

فون 7223584-0300-4125230

ادارہ علم وعرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔اللہ کے فضل وکرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔(ناشر)

ترتیب

1	عورت اور جنگل	مونیکا مارٹن	05
2	کالا لنگڑا	سحر جان	19
3	بدروح	سلور ہیکل	24
4	گنیش مہاراج	ابوالفضل صدیقی	29
5	ہاتھی کا انتقام	پروفیسر احمد الدین مارہروی	38
6	ناگن	چمن علی غوری	48
7	جال	ڈی آر۔ شرمن	51
8	شب خون	ابوالفضل صدیقی	65
9	مدھیا نور کی عفریت	سحر جان	75
10	آدم خور کا تعاقب	راؤ رستم علی خان	83
11	ناگ کی موت	ریڈیارڈ کپلنگ	91
12	انعام	راجا سجاول خان	100
13	پہاڑوں کی گود میں	شمس الحسن فاروقی	104
14	دست بدست	ابو سہیل قریشی	113
15	جنگل کا قانون	سید رفیق حسین	117
16	چنار گڑھ کا چیتا	حاکم الدین	127
17	ریچھ کی بدمعاشی	حاکم الدین	130
18	سندر بن کا آدم خور	شوکت ھاشمی	134
19	پاگل شیرنی	راؤ رستم علی خان	139

عورت اور جنگل

رات خاصی جا چکی تھی..... باہر جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا..... کبھی کبھار دور..... بہت دور سے کسی شیر کے دہاڑنے یا بندروں کے لگاتار چڑ چڑانے کی مدہم آوازیں کان میں آتیں۔ اس روز خلافِ معمول میری طبیعت بڑی پریشان تھی..... بار بار اپنے شوہر کی طرف دھیان جاتا جو اچانک مجھے جنگل میں اکیلا چھوڑ کر نیروبی جا چکا تھا..... وہاں سے اس نے ابھی تک کوئی اطلاع نہ دی تھی..... انہی خیالوں میں گم تھی کہ دفعتاً مقامی عورتوں کے زور زور سے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے بین کرنے سے معاً یہ شبہ ہوا جیسے جنگل میں چڑیلیں رو رہی ہوں..... دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بے اختیار میرا ہاتھ اس رائفل کی طرف بڑھ گیا جو میں ہمیشہ بھر کر اپنے سرہانے رکھ لیا کرتی تھی۔ اتنے میں اردلی اندر آیا۔ میں نے اس دوران میں تیل سے جلنے والے لیمپ کی بتی اونچی کر دی تھی۔ اردلی ہندوستان کا رہنے والا تھا اور ہم اسے کرمو کہتے تھے۔ میں نے دیکھا وہ تھر تھر کانپ رہا ہے اور اس کے منہ سے آواز نکل نہیں رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ صرف اتنا کہہ سکا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک بڑا درندہ گیم ڈیپارٹمنٹ کے انچارج شوکی ناگا کی نوجوان لڑکی اٹھا لے گیا ہے..... لڑکی نے درندے کے جبڑے سے آزاد ہونے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ میں جھونپڑی کا اندرونی بانس آ گیا جو چھت کو سہارا دینے کے لیے لگایا گیا تھا۔ لڑکی اس بانس سے الجھی اور درندہ گھبرا گیا۔ تاہم جاتے جاتے اس نے لڑکی کو ادھیڑ دیا اور اب اس کی خون میں نہائی ہوئی لاش بستی کے کھلے میدان میں پڑی ہے۔

ایک لمحے کے لیے میرا ذہن سن ہو گیا..... میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس علاقے میں کوئی درندہ یوں انسانوں پر حملہ کر سکتا ہے..... گیم ڈیپارٹمنٹ کا انچارج شوکی ناگا، خود اچھا خاصا تجربہ کار شکاری تھا جس کی ساری زندگی انہی خطرناک جنگلوں میں گزر گئی تھی..... میں نے کرمو سے پوچھا شوکی ناگا کہاں ہے۔ اس نے بتایا وہ اپنے دفتر میں کچھ کام کر رہا تھا اور لڑکی اپنی جھونپڑی میں اکیلی تھی۔ درندے نے جھونپڑی کے گرد پہلے دو تین چکر لگائے اور ایک جگہ سے گھاس پھوس اکھاڑ کر اندر آنے کی کوشش کی۔ لڑکی سمجھی کوئی چھوٹا موٹا جنگلی جانور ہے، چنانچہ وہ لکڑی کا دروازہ کھول کر اسے دیکھنے باہر نکلی، بس اسی وقت درندے نے اسے دبوچ لیا۔

میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور شوکی ناگا کی نوجوان لڑکی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا، مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ مامیرا، اب اس دنیا میں نہیں..... اس کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی۔ بے حد تندرست اور خوش مزاج۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ انگریزی زبان فر فر بولتی تھی..... مقامی عورتوں کے برعکس اسے صاف ستھرا رہنے اور اچھے اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا..... ان دنوں مامیرا کی شادی قبیلے ہی کے ایک ایسے نوجوان کے ساتھ طے پا رہی تھی جو گیم ڈیپارٹمنٹ کے سابق انچارج جامی بھارا کا اکلوتا بیٹا تھا اور نیروبی کے کسی کارخانے میں ملازمت کرتا تھا۔

میں نے رائفل سنبھالی اور بستی کی جانب چلی..... جوں جوں آگے بڑھتی گئی۔ عورتوں کے چلا چلا کر بین کرنے کی آوازیں بلند ہوتی

گئیں.....شوکی ناگا کی جھونپڑی میں داخل ہوئی تو وہاں کئی مشعلیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں اور دروازے کے باہر مامیرا کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔

مامیرا کو اس عالم میں دیکھ کر میری آنکھیں بھی تر ہو گئیں۔ ایک جیتی جاگتی، ہنستی کھیلتی نوجوانی کا یہ انجام کس قدر بھیانک تھا! مامیرا کی بوڑھی ماں کی حالت تو دیکھی نہ جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہو۔ مامیرا کا باپ شوکی ناگا اس قاتل کی تلاش میں جا چکا تھا۔ جس نے اس کے چھوٹے سے گھرانے کی خوشیاں چھین لی تھیں۔ وہ نہایت نڈر اور تجربہ کار شکاری تھا، اس لیے سب لوگ یقین سے کہہ سکتے تھے کہ درندہ اب اپنے انجام سے بچ نہ سکے گا۔

گھنے جنگل کے تقریباً وسط میں یہ بستی دورِ جدید کی تمام آسائشوں اور سہولتوں سے قطعی محروم تھی۔ صرف مخروطی طرز کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں تھیں۔ کوئی بھی درندہ، چرند یا آدمی ان دیواروں کو چیر کر اندر آ سکتا تھا۔ دیواریں کیا تھیں، گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکاڑ کا مجموعہ تھیں۔ جنگل درندوں سے پٹا پڑا تھا۔ شیر، چیتے، جنگلی کتے اور بلیاں اس کثرت سے تھیں کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں انہیں کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے بستی کے اِرد گرد گھومتے پھرتے دیکھا جا سکتا تھا۔ بعض اوقات یہ جانور کھانے کی چیزیں اُٹھا کر لے جاتے۔ تاہم انہوں نے ابھی تک کسی انسان کو اپنا نوالہ نہیں بنایا تھا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ کسی درندے نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی جو اس بستی کے باشندوں اور جنگل کے درندوں کے مابین عرصہ دراز سے امن کی علامت کے طور پر موجود تھا۔ جب میرے شوہر ولیم رابرٹ مارٹن نے کینیا کی سرزمین پر پہلی بار قدم رکھا، تبھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مستقل طور پر یہیں ڈیرے ڈال دے گا۔ اس کا کہنا تھا اس قدر پُرسکون، خوب صورت اور آرام دہ جگہ دنیا میں کم ہی ملے گی۔ پہلے تو میں اپنے شوہر کے اس ارادے سے خاصی پریشان ہوئی، لیکن بعد ازاں تجربے اور مشاہدے نے بتایا کہ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اس جنگلی بستی میں کوئی چور تھا نہ ڈاکو۔ کسی کو کسی سے عداوت تھی نہ مخاصمت۔ یہاں اخبارات کا وجود نہ تھا، جنہوں نے کرۂ ارض کے کروڑوں افراد کی زندگیاں اجیرن بنا رکھی تھیں۔ یہاں وہ تمام نام نہاد آسائشیں نہ تھیں جن کے شکنجوں میں انسان نے خود کو جکڑ رکھا ہے۔ ہوائی جہاز تھے، نہ موٹر کاریں۔ گھنے جنگلوں کے اندر کوسوں میل پیدل ہی چلنا پڑتا تھا۔ ولیم اس موقع پر موجود ہوتا تو شوکی ناگا کا مامیرا کے قاتل کی تلاش میں ہاتھ بٹاتا اور دونوں مل کر اس کا خاتمہ کر دیتے، لیکن وہ نیروبی جا چکا تھا اور کچھ خبر نہ تھی، کب واپس آئے گا۔ شوکی ناگا کے لیے جوان بیٹی کی یوں ہلاکت بہت بڑا واقعہ تھی اور آدھی رات کو جنگل میں درندے کا تعاقب کرنا اسی کا حوصلہ تھا۔ وہ یہاں کے ایک ایک درخت، ایک ایک جھاڑی اور ایک ایک جانور سے خوب آگاہ تھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں سے کوئی شے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی۔

مامیرا کی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ درندے نے اس کی گردن چبا ڈالی تھی۔ مامیرا کی سیاہ لمبی گردن سے اس وقت بھی آہستہ آہستہ خون رس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان میں ابھی تک ویسی ہی چمک دمک تھی جیسی اس کی زندگی میں تھی۔ اس کا منہ کھلا تھا اور سفید سفید موتیوں جیسے دانت شعلوں کی روشنی میں چکا چوند پیدا کر رہے تھے۔ کالے چہرے پر سفید دانت کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوتے ہیں.....ایک بار تو مجھے بھی جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے رائفل ایک طرف رکھی اور مامیرا کی لاش کے نزدیک بیٹھ گئی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ درندے کے جبڑے سے آزاد ہونے کے لیے اس نے پوری قوت صرف کر دی تھی۔ اس کا ایک بازو جسم سے تقریباً الگ ہو چکا تھا۔ پیٹ اور سینے پر بھی گہرے گھاؤ آئے تھے۔ سب سے

بڑا نمایاں زخم گردن پر تھا۔ درندے کا پنجہ مامیرا کی گردن پر پڑا تھا اور اس کی شہ رگ کٹ گئی تھی۔

درندہ، مامیرا کو اُٹھا کر لے جانے میں ناکام رہا تھا، اس لیے یقینی بات تھی کہ وہ سخت جھلایا ہوا اور مشتعل ہوگا۔ ایسے عالم میں مردم خور درندوں کی فطرت یہ ہے کہ وہ شکار سے زیادہ دور نہیں جایا کرتے اور آس پاس ہی کہیں چھپ کر موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ شوکی ناگا، درندوں کی اس فطرت سے اچھی طرح آگاہ تھا اور اسی لیے وہ درندے کی کھوج میں نکل گیا۔ میں اس وقت کچھ نہ کر سکتی تھی۔ میں نے حفاظتی انتظامات کے سلسلے میں تمام آدمیوں کو ہدایت کی کہ وہ رات کا بقیہ حصہ جاگ کر گزاریں اور مشعلیں روشن رکھیں، مامیرا کی جھونپڑی کے اردگرد خاردار جھاڑیاں لا کر جمع کر دیں کہ وہ درندہ اگر آس پاس موجود ہو تو دوبارہ آسانی سے جھونپڑی کے اندر داخل نہ ہو سکے، مامیرا کی لاش یہاں سے اٹھوا کر کسی دوسری جگہ لے جائیں۔ اس کے بعد میں اپنے گھر واپس آ گئی۔ یہ گھر میرے شوہر نے مقامی باشندوں کی مدد سے بنوایا تھا اور اس کی دیواریں، کھڑکیاں، دروازے سب لکڑی کے تھے۔ چھت البتہ گھاس پھوس ہی کی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ دو چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل یہ گھر لکڑی کے چھ چھ فٹ اونچے ستونوں کے سہارے کھڑا کیا گیا تھا اور اس تدبیر کے کئی فائدے تھے۔ پہلا یہ کہ حشرات الارض گھر میں داخل نہیں ہو سکتے تھے اور دوسرا یہ کہ درندوں سے بھی محفوظ تھا۔

☆☆☆

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچایئے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

گھر واپس آ کر میں بستر پر لیٹ گئی اور اردلی سے کہہ دیا کہ وہ باہر اس چبوترے پر سو جائے جو پچھلے کمرے کے ساتھ زمین سے کوئی دس بارہ فٹ کی اونچائی پر بنایا گیا تھا اور جہاں ہم صبح یا شام کے وقت بیٹھ کر ناشتہ کیا کرتے تھے۔ بستی والوں کو میں نے سمجھا دیا تھا کہ جونہی شوکی ناگا واپس آئے، مجھے اطلاع کر دیں۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ صبح تک واپس آ جائے گا اور درندے کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوگا۔

بستر پر لیٹے لیٹے مجھے یاد آیا کہ دو ماہ قبل بھی ایسی ہی واردات اس بستی سے جنوب کی جانب سات آٹھ میل دور ہوئی تھی اور جنگل سے گزرتے ہوئے چند آدمیوں پر ایک قوی ہیکل شیر نے حملہ کر دیا تھا۔ دو آدمی تو درخت پر چڑھ گئے، جبکہ تیسرا بدنصیب شیر کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس واردات سے خاصی سنسنی پھیلی، پھر معلوم ہوا کہ اس درندے کو مزید وارداتیں کرنے سے پہلے ہی ہلاک کر دیا گیا ہے۔ اس اطلاع سے لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا، مگر تازہ واردات سے یہی اندازہ ہوتا تھا، کہ وہ شیر ہلاک نہیں ہوا اور اب اپنی جگہ بدل کر وہ اِدھر آ چکا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور درندہ اس حرکت کا مرتکب ہوا ہو۔ ایسے حالات میں مجھے ولیم کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ صبح ہوتے ہی ولیم کو نیروبی اطلاع بھجواؤں گی۔ ولیم نے نیروبی روانہ ہوتے ہوئے مجھے ہدایت کی تھی کہ جنگل کے اندر اکیلی نہ جاؤں اور شوکی ناگا کے مشورے برابر سامنے رکھوں۔ مجھے دراصل چھوٹے موٹے پرندے شکار کرنے کا بڑا شوق تھا اور اس ضمن میں کئی مرتبہ میں اکیلی بھی جنگل کے اندر تک نکل جاتی تھی۔ دو تین مواقع ایسے آئے کہ درندوں سے مڈبھیڑ ہوئی، لیکن اس سے پہلے کہ میں گولی چلاؤں، درندے خود ہی راستہ چھوڑ کر دوسری جانب چلے جاتے۔

صبح سورج نکلتے ہی کرموکو چند آدمیوں کے ساتھ قریب کی دوسری بستی میں ہاتھی لانے کے لیے بھیجا۔ میں نے سوچا تھا ہاتھی پر سوار ہو کر جنگل میں جاؤں گی۔ قریبی بستی بھی وہاں سے آٹھ نو میل دور تھی اور کرموکو وہاں تک پہنچنے اور واپس آنے میں دو گھنٹے لگتے۔ تعجب اس پر تھا کہ شوکی ناگا واپس نہیں آیا تھا اور جوں جوں وقت گزر رہا تھا، تشویش اور خوف کی لہر برابر پھیلتی جا رہی تھی۔ مامیرا کی لاش زمین میں گڑھا کھود کر دبا دی گئی۔

دوپہر تک کرمو واپس آیا اور اپنے ساتھ ایک قوی الجثہ اور سدھایا ہوا ہاتھی بھی لایا، جو پانچ سال پہلے گیم ڈیپارٹمنٹ نے ایک مقامی شکاری سے خریدا تھا اور شکاری نے اسے جنگل سے اس وقت پکڑا جب وہ بہت چھوٹا تھا۔

شوکی ناگا کے واپس نہ آنے سے تشویش میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ میں نے کرموکو اپنے ساتھ لیا، دونوں شکاری کتے اس کی تحویل میں دیے اور ہاتھی پر سوار ہو کر جنگل کے اندرونی حصے کی طرف روانہ ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگل میں تن تنہا نکلنے کا یہ پہلا موقع تھا، ورنہ اس سے پہلے ہمیشہ میرے ساتھ ولیم یا کوئی اور محافظ ضرور ہوتا تھا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتی گئی، دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ گنجان درختوں کی شاخوں اور پتوں میں چھپے ہوئے ہزاروں پرندے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ جنگل کی زندگی پوری طرح بیدار تھی۔

دفعتاً ہاتھی چلتے چلتے رک گیا اور سونڈ اٹھا کر بے تحاشا چنگھاڑنے لگا۔ مہاوت نے اسے آگے بڑھانے کی کوشش کی، لیکن ہاتھی پیچھے ہٹنے لگا..... میں نے چیخ کر کرموکو فوراً کتے چھوڑ دینے کو کہا۔ دونوں کتے بجلی کی طرح دوڑے اور جنگل میں غائب ہو گئے۔ ہاتھی بدستور چنگھاڑ رہا تھا اور اس کی خوفناک آواز سے جنگل کی زمین تھرا رہی تھی۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ ہاتھی کا یوں بدحواس ہونا معمولی بات نہ تھی۔ یقیناً کوئی درندہ آس پاس ہی چھپا ہوا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل سے اردگرد کی جھاڑیوں پر نگاہ دوڑائی اور پھر اسے دیکھ لیا۔ وہ ایک قدآور اور خوبصورت چیتا تھا جو مجھ سے

کوئی ساٹھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس کی کھال کا رنگ جھاڑیوں کے رنگ میں کچھ اس طرح شامل ہو گیا تھا کہ عام حالات میں اس کا نظر آنا محال تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں..... وہ بے حس و حرکت جھاڑیوں میں یوں دبکا ہوا تھا جیسے اس میں جان ہی نہ ہو۔ میں نے رائفل سے اس کا نشانہ لیا اور فائر کرنے ہی والی تھی کہ وہ جھاڑیوں میں سے نکلا اور سیدھا ہاتھی کی طرف آیا۔ اسی لمحے میری رائفل نے شعلہ اگلا۔ گولی چیتے کو لگی، وہ فضا میں کئی فٹ اونچا اچھلا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ میں نے دوسرا فائر کیا، اس مرتبہ نشانہ چوک گیا۔ چیتا چند سیکنڈ زمین پر لوٹ پوٹ ہونے کے بعد اٹھا اور دھاڑتا ہوا جنگل میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی اور پھر یوں لگا جیسے ان میں اور چیتے میں لڑائی ہو رہی ہو۔ ان کی آوازوں میں زخمی چیتے کی آواز نمایاں تھی۔ میں نے مہاوت سے کہا، ہاتھی کو آگے بڑھاؤ۔ اس نے ہاتھی کو آگے بڑھایا تو وہ چل پڑا۔ اس اثنا میں کرموا ایک درخت پر پناہ لے چکا تھا۔ یکا یک میں نے اپنے عقب میں کچھ کھڑ بڑ کی سی آواز سنی، مڑ کر دیکھا تو چار پانچ مقامی باشندے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے تھامے اور کمر کے ساتھ بڑے بڑے کلہاڑے باندھے دوڑے آ رہے تھے۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ سب کے سب گیم ڈیپارٹمنٹ کے ملازم تھے اور شوکی ناگا کے ماتحت کام کرتے تھے، جس وقت مامیرا کو درندے نے چیر پھاڑ دیا تھا' یہ لوگ بستی میں نہ تھے اور اب غالباً واپس آئے تو انہیں اس حادثے کی خبر ہوئی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ایک چیتا شدید زخمی ہو کر بھاگا ہے اور ممکن ہے اس نے مامیرا کو ہلاک کیا ہو۔ اس کے علاوہ شوکی ناگا کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ وہ کہنے لگے، اسی کی تلاش میں وہ آئے ہیں۔

ان مقامی شکاریوں کے آنے سے میرا حوصلہ بلند ہو گیا' لیکن اب مجھے اپنے کتوں کی بھی فکر تھی۔ انہوں نے یقیناً چیتے کو گھیر لیا تھا۔ ابتداء میں تو چیتے اور کتوں کی ملی جلی آوازیں آتی رہیں' پھر بند ہو گئیں۔ اس سے یہ اندازہ کرنے میں دقت نہ ہوئی کہ چیتے نے دونوں کتوں کو مار ڈالا ہے۔ میں نے کرموکو بستی میں واپس جانے کا اشارہ کیا اور اسی طرف ہاتھی کو بڑھایا جدھر چیتا زخمی ہو کر بھاگا تھا۔ مقامی شکاری ہر طرح مستعد اور چاق و چوبند تھے اور مجھے پوری امید تھی کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہیں۔

کوئی تین فرلانگ دور ایک چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے کے قریب مجھے دونوں کتوں کی ادھڑی اور نچی ہوئی لاشیں مل گئیں۔ آس پاس خون بڑی مقدار میں بکھرا ہوا تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ کتوں اور چیتے کے مابین خاصی زبردست جنگ برپا ہوئی ہے اور چیتا چونکہ پہلے ہی زخمی تھا، اس لیے کتوں نے اسے مزید زخم پہنچائے ہوں گے۔ میں نے ہاتھی سے اتر کر اس مقام کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ مقامی شکاریوں نے بتایا کہ اس خون کے ساتھ ساتھ چیتے کے بدن سے بہنے والا خون بھی شامل ہے۔ کتوں کا خون سیاہی مائل سرخ تھا اور زمین پر جہاں جہاں گرا، وہیں جم گیا تھا..... جبکہ چیتے کا خون خالص، گہرا سرخ اور کسی قدر پتلا تھا اور ابھی تک جما نہ تھا۔ یہ خون بہت زیادہ تھا اور مشرقی جانب ٹیلے کے گرد گھوم کر جنگل کے اس حصے تک چلا گیا تھا جہاں دن کے وقت بھی گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے شکاریوں سے پوچھا ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ ان سب کا ایک ہی جواب تھا کہ چیتے کو ڈھونڈنا ضروری ہے، ورنہ زخمی ہونے کے بعد اس درندے کا مستقل طور پر آدم خور بن جانا لازمی ہوگا۔

اب میرے سامنے بیک وقت تین دشوار ترین مراحل تھے۔ اول اس درندے کو ڈھونڈنا، جس نے مامیرا کو ختم کیا تھا۔ دوم اس چیتے کو مارنا جو زخمی ہو کر بھاگا تھا اور جنگل میں کہیں چھپ گیا تھا۔ تیسرا کام شوکی ناگا کا کھوج لگانا تھا اور یہ پہلے دونوں کاموں سے کہیں زیادہ اہم تھا۔

شوکی ناگا کے ایک نائب نے مجھے بتایا کہ جنگل میں مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی بستی ملانو نام کی آباد ہے۔ شوکی ناگا کے اکثر رشتے دار وہاں رہتے ہیں، ہوسکتا ہے وہ وہاں چلا گیا ہو۔ اس کی یہ بات سن کر مجھے کسی قدر اطمینان ہوا اور نامعلوم درندے اور زخمی چیتے کا خیال چھوڑ کر شوکی ناگا کو تلاش کرنے کا فیصلہ کیا وہ مل گیا تو درندے سے نمٹنا آسان ہو جائے گا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ مقامی شکاری پیدل تھے اور میں ہاتھی پر سوار۔ مجھے کچھ اچھا نہ لگا کہ وہ اتنی دور پیدل چلیں، چنانچہ میں نے ہاتھی کو واپس بستی بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ رائفل کے علاوہ میرے پاس بھرا ہوا ایک ریوالور اور زائد کارتوس بھی تھے۔

جنگل کے اندر پیدل چلنے کا یہ پہلا اتفاق تھا اور تھوڑی دیر بعد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ ہاتھی کو واپس بھیج کر میں نے غلطی نہیں، سخت حماقت کی ہے۔ ہر قدم پر خاردار جھاڑیاں راستہ روکتی تھیں اور کہیں کہیں درخت اتنے گنجان تھے کہ آگے جانے کے لیے لمبی گھاس میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ ہر لمحے خطرہ تھا۔ کوئی چھپا ہوا درندہ یا سانپ نکل نہ آئے۔ مقامی باشندے پوری طرح چوکنے ہو کر آگے آگے جا رہے تھے اور راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔ کچھ دور تک تو زخمی چیتے کے خون کے نشانات نظر آتے رہے، پھر وہ شمال کی طرف مڑ کر جھاڑیوں میں اس سلسلے میں داخل ہوئے جن کے اندر گھسنا محال تھا۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد ہم نے مشرق کی جانب اپنا سفر دوبارہ شروع کیا۔ ملانو بستی کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں، لیکن چلتے چلتے ٹانگیں شل ہو چکی تھیں اور تھکن کے مارے برا حال تھا اور بستی کے دور دور آثار نہ تھے۔ مجھے وہم ہوا کہ شاید ہم راستہ بھول کر کسی اور طرف جا نکلے ہیں، مگر شکاریوں نے یقین سے کہا کہ ہم راستہ نہیں بھولے اور صحیح سمت میں جا رہے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ہم نے دس میل کا فاصلہ اور طے کر لیا تھا۔ جنگل کے اندر خاصی خنکی اور تاریکی تھی اور ایک ایسا ہولناک سناٹا کہ خواہ مخواہ روح کانپتی تھی۔ راستے میں دو مقامات ایسے آئے جہاں سے گزرتے ہوئے ہم نے شیر کے غرانے کی آواز سنی۔ معلوم ہوا کہ قریب ہی ایک ندی بہتی ہے اور وہاں جنگل کے درندے، چرندے اور پرندے سب اپنی اپنی پیاس بجھانے آتے ہیں۔

ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ فی الوقت شیر سے مڈبھیڑ اچھی نہ ہوگی۔ لہٰذا راستہ بدلنا ضروری ہے۔ یوں بھی ہم سب اتنے خستہ اور تھکے ماندے تھے کہ شیر تو بڑی بات ہے، اس وقت معمولی سے لگڑ بگے کا مقابلہ بھی نہ کر سکتے تھے، اس لیے ایک لمبا چکر کاٹ کر مشرق کا رخ کرنا پڑا۔ جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے، جنگل صاف اور کھلا ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں جھاڑیاں اور لمبی گھاس کثرت سے نہ تھی اور آسمان پر چمکتے ہوئے سورج کی شعاعیں آسانی سے جنگل کے اندرونی حصے تک پہنچ رہی تھیں۔

دفعتاً میرے ساتھی اپنی اپنی جگہ رُک گئے اور جانوروں کی طرح منہ فضا میں اٹھا اٹھا کر کچھ سونگھنے لگے۔ ان کی یہ حرکتیں میرے لیے حد درجہ دلچسپ اور حیرت خیز تھیں۔ یقیناً وہ کسی جانور یا آدمی کی بو پا رہے تھے۔ چند لمحے وہ شکاری کتوں کے مانند ادھر ادھر گردنیں اٹھائے تیزی سے گھومتے رہے۔ کبھی آگے بڑھتے کبھی پیچھے آ جاتے۔ انہوں نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ بھی کیا بلکہ ایک درخت کے تنے کے عقب میں چھپ جانے کی ہدایت کی۔ میں اس وقت ان لوگوں کی پُراسرار حرکتوں سے اس قدر مرعوب ہو چکی تھی کہ بغیر سوچے سمجھے ان کے احکام کی تعمیل کر رہی تھی۔ یکا یک ایک شکاری کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخیں نکلیں۔ پھر اس کا طاقتور بازو جنبش میں آیا۔ لمبا مضبوط نیزہ اس کے ہاتھوں سے نکلا اور سنسناتا ہوا

ایک جھاڑی کی طرف گیا۔ عین اسی لمحے شیر کی گرج سے جنگل کانپ اٹھا۔ وہ خوب صورت اور جوان شیر تھا اور نہ جانے کب سے جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں اس شکاری پر حملہ کیا جس نے اس کی طرف نیزہ پھینکنے کی جرأت کی تھی۔ شکاری اس وقت بالکل تنہا تھا اور شیر کے اچانک حملے سے اس قدر سراسیمہ ہوا کہ بے چارہ ذرا بھی حرکت نہ کر پایا۔ میں نے دیکھا شیر نے دائیں پنجے سے اسے نیچے گرا دیا اور اس کی گردن اپنے جبڑے میں دبا کر دو تین بار اسے زور سے جھٹکے دیئے کہ اس کے منہ سے آواز ہی نہ نکل سکی اور وہ وہیں مر گیا۔ اس دوران میں بقیہ شکاری انتہائی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیر کو چاروں طرف سے گھیر چکے تھے۔ ان کے نیزے اٹھے ہوئے تھے جن کی انیوں کا رخ شیر کی جانب تھا۔ شکاریوں کی آنکھیں لال لال تھیں، اور میں نے دیکھا کہ ان میں اور ایک وحشی جنگلی درندے میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔

شیر سخت غیظ و غضب میں بپھرا ہوا تھا اور چند سیکنڈ تک وہ ایک ہی دائرے میں گھومتا اور گرجتا رہا۔ شکاری بے خوفی سے اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ پھر ان سب کے بازو بیک وقت فضا میں بلند ہوئے اور چار نیزے ایک ہی لمحے میں شیر کا بدن چھیدنے کے لیے سنسناتے ہوئے گئے۔ ایک نیزہ شیر کی گردن میں پیوست ہو گیا اور دوسرا اس کی پسلیوں میں لگا، بقیہ دو نیزے سامنے درخت کے تنے میں جا لگے۔ شیر نے شکاریوں کی طرف جست لگائی، لیکن ان کی پھرتی اس بلا کی تھی کہ وہ اب چمکدار پھلوں والے کلہاڑے سنبھالے ہوئے درندے کا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ میں اپنی جگہ وحشت زدہ یہ منظر دیکھ رہی تھی اور اگرچہ میرے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔ تاہم مجھ میں اتنا حوصلہ ہی نہ تھا کہ شیر پر فائر کر سکتی۔ شیر نے اچھل کر ایک اور شکاری کو دبوچ لیا۔ درندے کے جسم میں دو نیزے پیوست تھے۔ اس کی گردن اور پسلیوں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے، لیکن اس نے کوئی کمزوری نہ دکھائی اور دوسرے شکاری کو آناً فاناً اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ وہ بدنصیب کلہاڑے سے ایک وار بھی نہ کر سکا، جبکہ تینوں شکاری شیر پر ٹوٹ پڑے اور پھر آدمیوں اور درندے میں ایسی خوفناک خون ریز جنگ کا آغاز ہوا جسے میں مرتے دم تک فراموش نہ کر سکوں گی۔

☆☆☆

ایم اے راحت کے جادوئی قلم سے خوف و اسرار میں لپٹا ہوا دہشتناک ناول

معصوم چڑیل

قیمت 400 روپے

دو جلدوں میں مکمل

شیر پر کلہاڑوں کے پے در پے وار پڑنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ ایک شکاری نے پوری قوت سے کلہاڑا شیر کی کھوپڑی پر مارا۔ شیر نے اسی وقت جست لگائی اور کلہاڑے کا وار اس کی کھوپڑی پر پڑنے کے بجائے شانے پر پڑا۔ خون کا تیز تیز فوارہ شیر کے شانے سے اچھلا اور یہ اتنا تیز تھا کہ وار کرنے والا سیاہ فام شکاری، درندے کے خون میں نہا گیا۔ وزنی کلہاڑے کا تیز دھار پھل شیر کے دائیں شانے میں گہرائی تک اُتر چکا تھا، مگر درندہ بھی موم کا بنا ہوا نہ تھا۔ اس کے تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اتنے مہلک اور گہرے زخم کھانے کے باوجود اس کا دم خم ابھی تازہ ہے۔ اس نے اُچھل کر حملہ آور کو منہ میں دبا لیا اور تین چار جھٹکے دیئے جس سے شکاری کی گردن دھڑ سے تقریباً الگ ہی ہوگئی۔ اپنے تیسرے ساتھی کا بھیانک انجام دیکھ کر بقیہ دو شکاریوں پر ہیبت طاری ہوگئی اور وہ بھاگ کر جھاڑیوں میں جا چھپے۔ میں سمجھ چکی تھی کہ وہ اپنی قدیم روایات کے مطابق شیر کو کوئی ایسی بدروح سمجھ رہے ہوں گے جو کسی حالت میں بھی مر نہیں سکتی۔

ان دونوں کو راہِ فرار اختیار کرتے دیکھ کر میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔ میں نے کئی بار رائفل سیدھی کر کے شیر کی کھوپڑی کا نشانہ لینے کی کوشش کی، مگر میرے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے اور میں ایک بھی فائر نہ کر پائی۔ شیر اس وقت تک شکاری کی لاش کو دبوچے خونی کھیل کھیلنے میں مصروف تھا، حالانکہ دو نیزے ابھی تک اس کی گردن اور پسلیوں میں پیوست تھے۔ میرے اندازے کے مطابق شیر کا خاصا خون بہہ چکا تھا۔ تاہم حیرت یہ تھی کہ اس کے اندر تھکن یا خستگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ میرا اور شیر کا درمیانی فاصلہ مشکل سے تیس چالیس فٹ کا ہوگا اور چونکہ میں ایک بڑے درخت کے وسیع تنے کی آڑ میں دبکی کھڑی تھی، اس لیے اس کی نگاہ ابھی تک مجھ پر نہ پڑی تھی۔ ادھر میرا یہ عالم کہ دہشت سے لرزاں و ترساں اور ایک بھی فائر نہ کرنے کے قابل مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ شیر نے جونہی مجھ کو دیکھا آناً فاناً میری طرف لپکے گا اور.....اس سے آگے کچھ سوچنا میرے لیے محال تھا۔ ذہن اور جسم کی تمام قوت مفلوج ہوتی جا رہی تھی۔ میری جگہ کوئی عورت تو درکنار، نڈر سے نڈر اور تجربے کار سے تجربے کار مرد شکاری بھی ہوتا تو اس کی کیفیت مجھ سے کچھ مختلف نہ ہوتی۔ میری نظروں کے عین سامنے تین آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں اور انہیں شیر نے ہلاک کیا تھا اور اب میری باری تھی۔ میں نے درخت کی بلندی پر نگاہ دوڑائی۔ اس کا تنا خاصا بڑا تھا اور پہلی شاخ جس پر میں اگر چڑھنے کی لائق ہوتی، زمین کی سطح سے کم از کم دس بارہ فٹ اونچی تھی۔ اس کے علاوہ درخت پر چڑھنے کے لیے جس پھرتی، چستی اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھ میں سرے سے موجود نہ تھی۔ ایک ایک ثانیہ موت اور زندگی میں فاصلہ کم کر رہا تھا اور مجھے جلد فیصلہ کرنا تھا کہ شیر کا تر نوالہ بن جانا ہے یا جان بچا کر واپس بستی تک پہنچنا ہے۔

شیر غرا غرا کر انسانی لاشوں کو نوچتا اور بھنبھوڑتا رہا۔ اس کے طیش کی کوئی انتہا نہ تھی۔ رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ اس پر نقاہت طاری ہو رہی ہے۔ اس کے جسم کے تین مختلف حصوں سے خون کی نالیاں سی بندھی ہوئی تھیں اور بیس پچیس فٹ کے دائرے میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو انسانوں اور درندے کے ملے جلے خون سے تر نہ ہو چکی ہو۔ اتنے میں میرے بائیں ہاتھ پھیلی ہوئی لمبی لمبی گھاس میں سے کئی گیدڑ ہو ہو کرتے نکلے اور تیزی سے دوڑتے ہوئے دوسری جانب کی جھاڑیوں میں گم ہوگئے۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی اور بڑا جانور ان گیدڑوں کے تعاقب میں ہے۔ اس مشاہدے نے میرا خون ہی خشک کر کے رکھ دیا۔ عین اس لمحے میرے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر گری اور شیر نے گھوم کر اِدھر دیکھا، اس کی آنکھیں انگاروں کی

طرح دہک رہی تھیں۔ وہ آخری مرتبہ پوری قوت سے دہاڑ کر میری طرف بڑھا۔ اس وقت خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مجھ میں کہاں سے حوصلہ اور ہمت پیدا ہوئی۔ میں نے فوراً جھک کر اپنی رائفل اُٹھائی اور شیر کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ فائر کے دھماکے سے جنگل کی فضا ایک لمحے کے لیے کانپی۔ دوڑتا ہوا شیر فضا میں کئی فٹ اونچا اُچھل کر زمین پر اُلٹا گرا اور تڑپنے لگا۔ میں نے اس مرتبہ دوسرا نشانہ لیا اور اس کی کھوپڑی میں گولی اُتار دی۔ میرا اور شیر کا اس وقت درمیانی فاصلہ بارہ چودہ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ یہ گولی کارگر ثابت ہوئی۔ شیر کا جسم کچھ دیر تھرتھراتا رہا، پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔

درندے کی گرج اور فائروں کے دھماکوں سے جنگل کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ ہزاروں پرندے چیختے چلاتے آسمان پر چکر کاٹنے لگے۔ میں نے خود کو پسینے میں شرابور پایا اور جب ہوش و حواس ذرا ٹھکانے لگے، تب اونچی آواز میں ان دو مقامی شکاریوں کو پکارنا شروع کیا جو درندے کے ہاتھوں جانیں بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مجھے یقین تھا، وہ زیادہ دور نہ گئے ہوں گے اور کسی درخت پر چڑھ کر شاخوں میں چھپنے کے بعد شیر کے مرنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے ان دونوں پر بڑا غصہ آ رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ جس طرح وہ مجھے شیر کے منہ میں دھکیل کر اور اپنی جانیں بچا کر بھاگے ہیں، وہ جرم بہرحال ناقابلِ معافی ہے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ دونوں بری طرح سہمے اور گھبرائے ہوئے نمودار ہوئے۔

میں نے اس موقع پر انہیں ڈانٹنا ڈپٹنا مناسب خیال نہ کیا اور صرف اتنا کہا کہ انہیں کم از کم اپنے ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر نہ جانا چاہیے تھا۔ انہوں نے مرے ہوئے شیر کے جسم سے دونوں نیزے نکالے اور اپنے تیسرے ساتھی کا نیزہ اور کلہاڑا بھی سنبھال لیا۔ شیر کی لاش کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ وہ اسے ابھی یونہی پڑا رہنے دیں گے اور بعد میں موقع پا کر بستی کی طرف اُٹھا لے جائیں گے۔ میں نے کہا جنگلی جانور شیر کی لاش نوچیں کھسوٹیں گے اور یوں کھال خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہتر ہے، اسے کسی نہ کسی طرح ابھی اُٹھا کر لے چلو، مگر انہوں نے معذوری ظاہر کی اور مجھے اشارے سے سمجھایا کہ شیر کا وزن پانچ سو پونڈ سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔ اتنے بھاری وزن کا اُٹھانا دو آدمیوں اور ایک عورت کے لیے ناممکن ہے۔ بدبختوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اس پر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ نیزہ اور کلہاڑا ان قدیم افریقی وحشی قبائل کے دو کارآمد اور ضروری ہتھیار تصور ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی مہارت اور مشق حیرت انگیز ہے۔ اگرچہ زمانے کے ساتھ ساتھ انہیں بندوق اور رائفل چلانے کا ڈھنگ بھی آ گیا ہے، لیکن بیشتر قبائل نیزے، کلہاڑے اور چھرے ہی پر زیادہ بھروسا کرتے ہیں۔

میں نے اس قوی ہیکل شیر کی لاش کا نزدیک جا کر اچھی طرح معائنہ کیا۔ اسے قریب سے دیکھ کر بھی بدن پر لرزہ طاری ہوتا تھا۔ ایسا بڑا اور مہیب شیر میں نے پورے افریقہ میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران میں دوبارہ نہیں دیکھا۔ میرا گمان تھا کہ یہ وہی درندہ ہے جس نے پچھلی شب شوکی ناگا کی جوان بیٹی مامیرا کو ہلاکت سے دوچار کیا اور کچھ عجب نہیں کہ اسی درندے نے جنگل میں بعد ازاں موقع پا کر شوکی ناگا کو بھی مار ڈالا ہو۔

اسی وہم کے زیر اثر میں نے ان دونوں شکاریوں کو ڈانٹ کر حکم دیا کہ وہ آس پاس کے علاقے میں اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھیں، مجھے یقین ہے کہ شوکی ناگا کا پتہ نہ ملا تو میں ان دونوں کو فائر کر کے اسی طرح مار ڈالوں گی جس طرح شیر کو مارا ہے۔ یہ دھمکی خاصی کارگر ثابت ہوئی۔ خوف اور بدحواسی ان دونوں کے چہروں سے عیاں تھی۔ وہ فوراً میرے سامنے سجدے میں گر گئے اور گھاس میں اپنی ناکیں رگڑنے لگے۔

میں ایک محفوظ مقام پر جا بیٹھی اور دونوں شکاری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ سورج ڈوبنے

میں ابھی پورے دو گھنٹے باقی تھے اور اس وقفے میں بستی واپس بھی پہنچنا تھا۔ مزید ایک گھنٹہ گزر گیا اور جنگل میں تاریکی تیزی سے قدم جمانے لگی۔ مجھے اپنی حماقت پر پھر غصہ آنے لگا۔ فرض کرو، وہ دونوں واپس نہ آئے تب میں کیا کروں گی؟ بستی یہاں سے بہت دور نہیں تو قریب بھی نہیں۔ اور پھر اتنے بھیانک جنگل میں بڑھتی ہوئی تاریکی میں تن تنہا ایک عورت کا سفر..... راہ میں کوئی جان لیوا حادثہ پیش آ سکتا تھا۔ اس احساس ہی سے میرا ذہنی توازن درہم برہم ہونے لگا اور میں اسی وقت اپنی جگہ سے اُٹھ کر چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ شکاری جب مجھے وہاں نہ پائیں گے تو ڈھونڈنے کے لیے وہی راستہ اختیار کریں گے جو بستی کی طرف جاتا ہے۔

ابھی میں پچاس ساٹھ قدم ہی چلی تھی کہ عقب سے دونوں شکاری بھاگتے ہوئے آئے۔ وہ مسلسل چلا رہے تھے۔

''وہ مل گیا..... وہ مل گیا.....''

''وہ وہاں ہے جہاں بھوتوں کا ڈیرہ ہے..... وہ آ نہیں سکتا..... وہ مر چکا ہے.....''

میں پتھر ہو گئی۔ ''کیا تم لوگ شوکی ناگا کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

انہوں نے بیک وقت اثبات میں گردنیں ہلا دیں۔ ''ہاں..... شوکی ناگا..... بے چارہ..... مر گیا ہے.....''

اس مقام سے کوئی دو میل دور، شمال مشرقی حصے کی جانب جہاں چھوٹے بڑے پہاڑی ٹیلے کثرت سے تھے اور جن میں ہزاروں لاکھوں چمگادڑیں صدیوں سے رہتی آئی تھیں۔ ایک ٹیلے کے پاس شوکی ناگا کی ننگ دھڑنگ لاش پڑی تھی۔ میں نے دیکھا، درندے نے اس کی گردن نوچ کر پرے پھینک دی تھی اور نچلا آدھا دھڑ سارے کا سارا ہڑپ کر لیا تھا۔ سرخ رنگ کی ایک جیکٹ وہیں ادھڑی اور پھٹی ہوئی ایک جھاڑی کے اوپر لٹک رہی تھی اور یہی جیکٹ دور سے دیکھ کر ان دونوں آدمیوں نے شوکی ناگا کا سراغ لگایا تھا۔ اس کی لاش نہایت خراب حال میں میری نگاہوں کے سامنے پڑی تھی اور مجھے یقین نہ آ رہا تھا کہ ایک ہی رات میں یہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اچھا خاصا ایک گھرانا اُجڑ کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ درندے نے عقب سے شوکی ناگا کو اچانک آن دبوچا، ورنہ وہ آسانی سے زیر ہونے والا شخص نہ تھا۔

شیر نے شوکی ناگا کی لاش کے چند اجزا سے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد اسے وہیں چھوڑ دیا تھا اور پھر گیدڑوں نے دعوت اُڑائی۔ لاش کے ان بچے کھچے حصوں پر بے شمار مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور گوشت خور، بڑی بڑی سیاہ رنگ کی چیونٹیاں بھی اپنا کھاجا خوب وصول کر رہی تھیں۔ لاش متعفن ہو چکی تھی اور میں وہاں چند منٹ سے زیادہ کھڑی نہ رہ سکی۔ میری آنکھوں میں شوکی ناگا جیسے شخص کا یہ بھیانک انجام دیکھ کر آنسو آ گئے۔ دونوں شکاری بھی غم زدہ تھے ایک تو اس وجہ سے کہ ان کے تین ساتھی اس درندے نے مار ڈالے تھے اور چوتھا شوکی ناگا تھا۔ بہر حال میں نے ان سے کہا کہ وہ لاش کے اوپر خشک پتے اور شاخیں ڈال دیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ کہہ کر میں واپس مڑی اور اسی لمحے ایک دل دوز چیخ فضا میں گونجی۔ یہ چیخ ان دونوں آدمیوں میں سے کسی ایک کے حلق سے نکلی تھی۔ میں نے دیکھا ایک شکاری گھاس میں گرا ہوا بُری طرح تڑپ رہا ہے اور دوسرا بھاگ کر پرے جا کھڑا ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہا، لیکن دوسرے شکاری نے چلا کر مجھے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ اگر میں پیچھے ہٹنے میں چند سیکنڈ کی بھی تاخیر کرتی تو آج یہ داستان لکھنے کے لیے دنیا میں نہ ہوتی۔

کیا دیکھتی ہوں کہ ایک زبردست سیاہ ناگ نے گھاس میں سے اپنا پھن باہر نکالا اور گرے ہوئے شکاری کے اوپر جھومنے لگا۔ اس کے پھن کی چوڑائی ایک فٹ سے کسی طرح کم نہ ہوگی اور اندھیری رات کی طرح اس کا رنگ تھا۔ سیاہ پھن پر دو ننھی ننھی سفید آنکھیں کوڑیوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ وہ بار بار سرخ لمبی زبان نکال کر گرے ہوئے شکاری کو ڈنگ مارتا اور پھر پھن لہراتا ہوا جھومنے لگتا۔ اس مہیب ناگ کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کا کاٹا ہوا تو پانی بھی نہ مانگا کرتا..... میں نے کمر سے بندھا ہوا ریوالور نکالا اور احتیاط سے ناگ کے پھن کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی صحیح جگہ لگی، پھن میں سے خون ابلنے لگا۔ ناگ وہیں شکاری کی لاش پر گرا اور تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر زخمی پھن پٹخنے کے بعد مر گیا۔

سانپ کے ختم ہونے کے بعد میں نے جھک کر مرے ہوئے شکاری کا جائزہ لیا۔ اتنی ہی دیر میں اس کا پورا بدن نیلا پڑ چکا تھا۔ گردن کی رگیں اتنی پھول چکی تھیں جیسے ابھی پھٹ جائیں گی۔ آنکھیں حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں اور ہونٹوں کے دونوں کناروں سے زردی مائل رقیق مادہ سا بہہ رہا تھا۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی۔ اس بے چارے میں زندگی کی معمولی سی رمق بھی موجود نہ تھی۔ چار آدمی جنگل میں عین میری آنکھوں کے سامنے مارے جا چکے تھے اور اب میرے علاوہ ایک آدمی رہ گیا تھا۔ اس احساس ہی سے کلیجہ پھٹنے لگا کہ کیا ہم دونوں بھی زندہ سلامت اس بھیانک جنگل سے نکل کر بستی تک پہنچ پائیں گے یا راستے ہی میں ہلاک ہو جائیں گے۔

ایک بار پھر میں نے شوکی ناگا کی لاش کا معائنہ کیا اور اس مرتبہ یہ انکشاف ہوا کہ اس کی موت شیر کے باعث واقع نہیں ہوئی، بلکہ ادھر سے گزرتے ہوئے اسی مہیب سانپ نے اسے ڈسا اور جب شوکی ناگا مر گیا، تب جنگلی جانوروں نے اس کے گوشت، خون اور ہڈیوں سے اپنی بھوک پیاس بجھائی۔ سورج اب غروب ہونے کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا اور ہمیں جلد سے جلد بستی میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ چنانچہ میں نے ڈرے اور سہمے ہوئے شکاری سے کہا کہ وہ راہبری کے فرائض انجام دے اور جس قدر جلد چل سکتا ہو، اتنا جلد راستہ طے کرے، ورنہ زندہ بچ کر یہاں سے جانا محال ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس آخری شخص نے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیئے۔ اسے راستوں کے پیچ و خم سے بھی اچھی آگاہی تھی اور اگرچہ اندھیرا بڑی سرعت سے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ تاہم بستی کے آثار ہمیں دور سے ہی نظر آنے لگے۔ جلتی ہوئی مشعلوں نے ہمیں بتایا کہ اب ہم خطرے سے باہر نکل چکے ہیں۔ بستی میں لوگ ابھی تک ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب چار شکاریوں اور شوکی ناگا کے مارے جانے کی بری خبر بستی والوں کو دی گئی تو ان کا کیا حال ہوا۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشک بار نہ ہوا اور کوئی دل ایسا نہ تھا جس سے آہیں نہ اُٹھ رہی ہوں۔

میں دن بھر کی تھکی ماندی تھی، اس لیے بستر پر لیٹتے ہی غفلت کی گہری نیند سو گئی۔ یکا یک اپنے مکان کے اِرد گرد خوفناک آوازوں کے بلند ہونے سے آنکھ کھل گئی۔ احساس ہوا کہ مکان کے نیچے کوئی جانور لکڑی کے وہ ستون اپنے دانتوں اور پنجوں سے اُدھیڑنے کی کوشش کر رہا ہے جو مکان کو سہارا دینے کے لیے بنائے گئے تھے۔ وہ کوئی زبردست شیر یا چیتا تھا۔ وہ کبھی زور سے گرجتا اور کبھی ہلکی ہلکی سی آواز میں غرانے لگتا۔ یقیناً وہ بھوکا تھا اور اب غذا کی تلاش اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ میں نے آہستہ سے سرہانے رکھی ہوئی رائفل اٹھائی اور دبے پاؤں بستر سے نکل کر کھڑکی کی طرف گئی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر میں نے باہر جھانکا تو پہلے تو کچھ نظر نہ آیا، پھر ایک قدرآور شیر کا ہیولا سا دکھائی دیا۔ وہ اس جھونپڑی کے نزدیک کھڑا تھا جہاں ہم اپنے شکاری کتے باندھا کرتے تھے۔ دونوں کتے جنگل میں مارے جا چکے تھے اور اب ہمارے گھر کی رکھوالی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے خیال

کیا کہ شیر اس وقت کتوں کی بو پر آیا ہے اور اب یقیناً مایوس ہو کر لکڑی کا ستون نوچ رہا ہے..... جی میں آیا کہ اس پر فائر کروں، مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ بستی کی جانب نگاہ دوڑائی تو فضا میں اجالا سا ہو رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ بستی والوں نے آگ کے الاؤ بڑی تعداد میں روشن کر رکھے ہیں اور یہ روشنی اس آگ کی تھی۔ یہ لوگ اگر الاؤ نہ جلائیں تو جنگلی درندے ان کا امن و سکون مستقل طور پر حرام کیے رکھیں۔ آگ کے ان الاؤں اور جلتی ہوئی مشعلوں کے باوجود گزشتہ شب ایک درندہ، مامیرا کو ہلاک کر کے چلا گیا تھا۔

میں اپنے بستر پر واپس جانے ہی والی تھی کہ معاً مجھے کرمو یاد آیا..... دل فرط خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ بے اختیار میں نے کرمو کو آوازیں دینا شروع کیں، لیکن جواب میں شیر کی آواز ہی سنائی دی۔ کرمو وہاں نہیں تھا..... اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جھونپڑی کے اندر تھا۔ مجھے کرمو پر تاؤ آنے لگا..... ولیم کے جانے کے بعد میں نے اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ جھونپڑی میں مت سوئے، لیکن اس نے ایک نہ مانی..... یہ شیر یقیناً کرمو کی تاک میں تھا۔

اُدھر میں نے شیر پر اندھا دھند فائر کیے، ادھر کرمو اور شیر کی ملی جلی چیخوں سے قیامت برپا ہو گئی۔ درندہ میری ناک کے عین نیچے سے کرمو کو اُٹھا کر لے جا چکا تھا۔ فائروں کی آوازیں بستی والوں کے کانوں تک بھی پہنچیں اور ادھر سے دس پندرہ آدمی ہاتھوں میں جلتی مشعلیں اور نیزے سنبھالے دوڑتے ہوئے آئے، لیکن اب ان کا آنا نہ آنا برابر تھا۔ گیا ہوا کرمو واپس نہ آ سکتا تھا۔ اس کی موت پر میں بُری طرح روئی۔ وہ ہمارا نہایت پرانا اور خدمت گزار ملازم تھا۔

اگلے روز میں ہاتھی پر سوار ہو کر نزدیکی قصبے تک گئی اور ولیم کو فوراً واپس آنے کا تار دیا۔ دو گھنٹے انتظار کرنے کے بعد اس کا جوابی تار آیا۔ اس میں درج تھا کہ وہ فوراً آ رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی ولیم نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں جنگل کے اندر نہ جاؤں۔ مگر کرمو، مامیرا اور شوکی ناگا کی اموات نے غم و غصے سے میرا برا حال کر دیا تھا۔ ولیم کے انتظار کی تاب ہی نہ تھی اور میں یوں بھی اسے دکھانا چاہتی تھی کہ جو کام مرد کر سکتے ہیں، وہ عورتیں بھی بخوبی کر کے دکھا سکتی ہیں۔ دن کا بڑا حصہ میں نے کرمو کی تلاش میں گزارا، لیکن آدم خور اسے مکان سے دور نہ لے گیا تھا۔ مشکل سے وہ سو گز دور گیا ہوگا کہ بھوک نے اسے آگے جانے سے روکا۔ اس نے وہیں ایک درخت کے نیچے کرمو کی لاش میں سے کچھ حصہ ہڑپ کیا اور اسے جھاڑیوں میں چھپا کر چلا گیا۔ میں نے کرمو کی لاش وہیں پڑی رہنے دی اور رات اس درخت پر شیر کا انتظار کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ یہ یقینی بات تھی کہ رات کسی وقت شیر دوبارہ کرمو کی لاش پر آئے گا۔ سرِ شام ہی میں نے تیاریاں مکمل کیں اور ضروری سامان سے لیس ہو کر درخت پر چڑھ گئی۔ یا یوں کہیں کہ مقامی باشندوں نے مجھے درخت پر چڑھنے اور شاخوں کے اندر چھپ کر اطمینان سے بیٹھنے میں مدد دی۔

جب سب لوگ چلے گئے اور جنگل پر ہو کا عالم طاری ہوا تو میرے اعصاب جھنجھنا اُٹھے۔ گیدڑوں اور بندروں کی ملی جلی آوازیں ایک مرتبہ شروع ہوئیں تو پھر ختم ہونے میں نہ آئیں۔ ان آوازوں سے بہر حال ایک فائدہ ضرور پہنچتا ہے اور وہ یہ کہ درندے کی آمد کا بروقت علم ہو جاتا ہے۔ درخت یا مچان پر بے حس و حرکت گھنٹوں بیٹھنا سہل نہیں۔ یہ بے حد تکلیف دہ عمل ہے جس میں سب سے زیادہ زور اعصاب پر پڑتا ہے اور بعض اوقات شکاری فریب نظر کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے مچھروں اور خونخوار چیونٹیوں سے محفوظ رہنے کے لیے بدن پر بدبودار خاص قسم کا محلول مل لیا

تھا۔اس کے باوجود مچھروں اور چیونٹیوں نے مجھے بڑا پریشان کیا۔آدھی رات گزر چکی تھی اور آدم خور شیر کا دور تک نام ونشان نہ تھا۔میں نے تھکن دور کرنے کے لیے تھرماس میں سے گرم گرم قہوہ نکال کر پیا اور تازہ دم ہوگئی۔یکا یک میں نے کچھ فاصلے پر عجیب سی آہٹ سنی۔دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔میں نے آہستہ سے تھرماس ایک طرف رکھا اور رائفل اُٹھالی۔آنکھیں اندھیرے سے خاصی مانوس ہو چکی تھیں۔تاہم غور سے دیکھنے کے باوجود مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔میں صبر واستقلال سے اسی آواز کی دوبارہ منتظر رہی اور جیسا کہ توقع تھی،تھوڑی دیر بعد وہی آہٹ دوبارہ سنائی دی،مگر اس مرتبہ قریب سے آئی تھی۔یوں لگا جیسے درندہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہو۔میں اپنے بدن کو حرکت دیئے بغیر محض گردن کی جنبش سے اپنے اِرد گرد دیکھ رہی تھی اور پھر میری نگاہوں سے وہ چھپا نہ رہ سکا۔درخت کے عین سامنے طویل فاصلے تک پھیلی ہوئی قد آدم جھاڑیوں کے اندر دو مشعلیں روشن تھیں جو وقفے وقفے سے دائیں بائیں اور آگے پیچھے حرکت کر رہی تھیں۔میں نے وقت ضائع کیے بغیر ان دونوں آنکھوں کے درمیانی حصے کا نشانہ لیا اور لبلبی دبادی۔فائر کا دھماکہ ہوا اور وہ دونوں روشن مشعلیں غائب ہوگئیں۔میرا خیال تھا یہ اگر شیر یا چیتا ہے اور زخمی ہو چکا ہے تو گرج گرج کر آسمان سر پر اُٹھالے گا،لیکن خلاف توقع کسی شیر یا چیتے کی آواز جنگل میں نہ گونجی۔مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں فریب سمع وبصر کا شکار ہوئی اور حقیقت میں میں نے کوئی آواز سنی نہ کسی کی روشن روشن آنکھیں دیکھیں۔

کوئی پندرہ منٹ بعد طے شدہ منصوبے کے عین مطابق بستی کی طرف سے دس بارہ مسلح آدمی ہاتھوں میں مشعلیں تھامے ادھر آئے۔انہوں نے مجھے درخت سے اُتارا۔میں نے سب ماجرا بیان کیا۔میری نشاندہی پر وہ لوگ جھاڑیوں میں گئے۔وہاں بے شک کسی جانور کا خون بکھرا ہوا تھا،مگر وہ جانور وہاں موجود نہ تھا۔البتہ فاصلے پر وہ ہمیں پڑا ہوا دکھائی دیا،اسے دیکھتے ہی میری ہنسی نکل گئی۔وہ آدم خور شیر کی خالہ،ایک جنگلی بلی تھی اور میری رائفل کی گولی نے اس کی کھوپڑی پاش پاش کر ڈالی تھی۔بہرحال،مجھے اپنے نشانے پر اعتماد ضرور ہوگیا۔چونکہ اب جنگل میں خاصا غل غپاڑہ مچ رہا تھا،اس لیے یہ بات کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ آدم خور اچانک نکل آئے گا۔ہم سب بستی کی طرف واپس جارہے تھے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی درندہ آہستہ آہستہ ہانپ رہا ہو۔یہ آواز سنتے ہی سب چوکنے ہوگئے۔میں نے رائفل کندھے سے اُتار کر ہاتھ میں لے لی۔جھاڑیوں کے اندر یقیناً کوئی ذی روح چھپا ہوا تھا اور اس نے ہمیں پیشگی خبردار کر دیا تھا۔یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی قضا سر پر کھیل رہی تھی اور خود مجھے احساس نہ تھا کہ یہ شکار کس قدر آسان ثابت ہوگا۔

مقامی آدمیوں نے اپنے نیزے جھاڑیوں کے اندر تاک تاک کر پھینکے۔یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔شیر غیض وغضب کی تصویر بنا اپنی کمین گاہ سے برآمد ہوا۔اسی لمحے میری رائفل نے بیک وقت دو شعلے اگلے اور اس کے ساتھ ہی پانچ چھ نیزے ان جنگلی قبائلیوں کے بازوؤں سے چھوٹے اور شیر کے جسم میں گڑ گئے۔دونوں گولیوں میں سے ایک گولی اس کی پیشانی پر لگی اور دوسری پیٹ میں۔شیر ہولناک دہاڑ کے بعد الٹ کر زمین پر گرا اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔قبائلیوں نے رہے سہے نیزے بھی اس کے بدن میں اُتار دیئے اور اس سے پیشتر کہ میں تیسرا فائر کروں،انہوں نے کلہاڑے سے مار مار کر شیر کی تکا بوٹی کر ڈالی۔

یہ میری زندگی کا پہلا آدم خور تھا جسے میں نے زمین پر کھڑے کھڑے ہلاک کیا،اگرچہ اس کی ہلاکت میں مقامی باشندوں کا بھی بڑا حصہ

تھا۔ شیر کے تفصیلی معائنے سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ اسی نے مامیرا کو مارا تھا اور بعد ازاں یہی درندہ کرمو کو جھونپڑی میں سے اُٹھا کر لے گیا۔ جنگل میں جو شیر ہلاک ہوا تھا، وہ آدم خور تو نہ تھا۔ تاہم اس نے تین مقامی باشندوں کو جس تیزی اور تندی سے دست بدست جنگ کے بعد مارا، وہ بجائے خود ناقابلِ معافی جرم تھا۔ صبح صادق کی روشنی مشرقی اُفق پر پھوٹ رہی تھی جب ہمارا قافلہ آدم خور شیر کی لاش اُٹھائے بستی کے اندر داخل ہوا اور اس لمحے میں نے پہلی بار مامیرا کی ماں کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ دیکھی جو اس حقیقت کی غماز تھی کہ ایک عورت کے خون کا بدلہ ایک عورت ہی نے لیا اور اس طرح مرد پر ثابت کر دیا کہ عورت بھی جنگل کی حکمران بن سکتی ہے۔

قلمکار کلب پاکستان

- .....اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ مختلف موضوعات پر لکھ سکتے ہیں؟
- .....آپ اپنی تحریریں ہمیں روانہ کریں، ہم ان کی نوک پلک سنوار دیں گے۔
- .....آپ شاعری کرتے ہیں یا مضمون و کہانیاں لکھتے ہیں؟
- .....ہم انہیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔
- .....آپ اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کرانے کے خواہشمند ہیں؟
- .....ہم آپ کی تحریروں کو دیدہ زیب و دلکش انداز میں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
- .....آپ اپنی کتابوں کی مناسب تشہیر کے خواہشمند ہیں؟
- .....ہم آپ کی کتابوں کی تشہیر مختلف جرائد و رسائل میں تبصروں اور تذکروں میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

اگر آپ اپنی تحریروں کے لیے مختلف اخبارات و رسائل تک رسائی چاہتے ہیں؟

تو..... ہم آپ کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کے مواقع دینا چاہتے ہیں۔

مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

قلمکار کلب پاکستان

0333 222 1689

qalamkar_club@yahoo.com

کالا لنگڑا

صاحب! صاحب! کالا، لنگڑا.....چار کتے مر گئے ہیں.....اس پر گولی اثر نہیں کرتی'' شنکر نے یہ الفاظ بُری طرح ہانپتے ہوئے کہے۔ جانے کہاں سے دوڑا آ رہا تھا۔ ذرا ٹھہر کر لیکن بدستور خوف زدہ سی کیفیت میں اس نے مجھے بتایا کہ آج صبح چند فوجی سپاہی پاس کے گاؤں میں آئے تھے، انہوں نے گاؤں کے آدمیوں کو ساتھ لیا اور جنگلی سور ختم کرنے کی مہم شروع کر دی۔ گیہوں کے کھیت میں شبہ ہوا کہ سور چل رہا ہے۔ فوجی کھیتوں کے اِرد گرد پھیل گئے اور دیہاتیوں کو غل مچانے کو کہا۔ بہت سے دیہاتی کھیت میں داخل ہوئے اور ہنکارا شروع کر دیا۔ ایک سیاہ رنگ کا بڑا سا سور لیٹے لیٹے اُٹھ بیٹھا اور اس نے ایک دیہاتی پر حملہ کر دیا۔ وہ آدمی کئی فٹ ہوا میں اُچھلا۔ اس کی چیخ سنائی دی پھر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ چند ایک آدمیوں کی نگاہ سور کی جسامت اور رنگ پر پڑی تو سب چیختے چلاتے ہوئے کھیت سے بھاگ اُٹھے۔۔۔ ''کالا لنگڑا۔ کالا لنگڑا۔'' سور کھیت سے نکل کر ایک فوجی سپاہی پر حملہ کرنے کو بھاگا۔ فوجی کے پاس اچھی بھلی بندوق تھی لیکن وہ گھبرا کر پیٹھ کے بل گر پڑا۔ البتہ گرتے گرتے گولی چلا دی جو سور کو تو نہ لگی لیکن اس کے اپنے افسر کی ٹانگ کے پار ہو گئی۔ یہ میجر قریب ہی کہیں کھڑا تھا۔

فوج کے سپاہی اپنے زخمی میجر کو اُٹھا کر شکار سے منہ موڑ گئے اور جاتے جاتے دیہاتیوں سے کہہ گئے کہ اگر تم لوگ اس سور کو ہلاک کر دو تو تمہیں انعام ملے گا۔ کالا سور ان سپاہیوں سے ڈرے بغیر اطمینان سے چلتا ہوا نشیب میں اُتر کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ یہ واقعہ صبح کے دس بجے پیش آیا۔ موقع پر ایک سو کے لگ بھگ دیہاتی کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح موجود تھے۔ اور دو کے پاس تو بارہ بور کی بندوقیں تھیں۔ ان کے درمیان طے پایا کہ اس درندے کو آج ختم کر کے ہی دم لو۔ چنانچہ بندوقوں سے مسلح افراد کو جنگل میں بھیجا گیا اور دیہاتی خود باہر کھڑے شور کرتے رہے لیکن بندوقوں والے دونوں آدمیوں کو جنگل میں گھسنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ان کے کتے شکار کے تعاقب میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد کتوں کی چیخیں سنائی دیں اور پتہ چلا کہ کالے سور نے چار کتوں کو ہلاک کر دیا ہے اور باقی زخمی ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے۔

اس واقعہ کی اطلاع مجھے ساڑھے تین بجے شام کو ملی۔ فروری کا مہینہ تھا۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ مجھے اپنے دوست موہن کے گاؤں آئے دس روز ہو چکے تھے۔ وہ مکھیا کا بیٹا تھا جب میں پہلے روز گاؤں آیا تھا تو موہن نے بتایا تھا کہ ایک کالے رنگ کے سور نے بڑا اودھم مچا رکھا ہے۔ موہن کے بیان کے مطابق اس کی اگلی ٹانگ خود موہن کی گولی سے زخمی ہوئی تھی اور اب وہ لنگڑا ہو گیا تھا۔ قد و قامت کے لحاظ سے بھی یہ سور دوسروں سے بہت بڑا تھا۔ چند ہفتوں سے اس نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور کئی آدمیوں کو ہلاک اور زخمی کر چکا تھا اسے ہلاک کرنے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن سب ناکام رہیں۔ ایک ہندو تھانے دار کا بیٹا تلوار لے کر اس درندے کو ہلاک کرنے گیا تھا لیکن پھر جنگل میں اس کی چیخ و پکار سنائی دی، جا کے دیکھا تو وہ زخمی پڑا تھا۔ سور کا کہیں نام و نشان نہ تھا اور اس شکاری کی تلوار بھی لاپتہ تھی۔

میری بھی اس سے ملاقات ہوئی۔ بلا مبالغہ ساڑھے چھ فٹ قد کا پہلوان نما آدمی تھا۔ مجھ سے بڑی حقارت سے مخاطب ہوا (اس کے تن و توش کے لحاظ سے میں بالکل بچہ معلوم ہوتا تھا) اس نے پوچھا۔ ''کیا تم نے اس سے پہلے کبھی جنگلی سور دیکھا بھی ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ جنگلی سور کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں، اب اسے بھی دیکھ لوں گا۔ موہن کو اس کا لہجہ بُرا لگا اور اس نے قدرے غصے سے کہا۔ ''یہ شکاری ہیں اور ابھی چند ماہ پیشتر شیر کو ہلاک کر چکے ہیں''۔ یہ سن کر اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور کہنے لگا''۔ اٹھارہ برس کے لڑکے سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ اس کالے سور کو مارے گا۔ بہتر ہے کوشش نہ کرنا۔''

اس درندے کے متعلق چند باتیں مشہور تھیں۔ مثلاً یہ کہ اس نے جنگل میں ایک قلعہ مخصوص کر رکھا ہے اور کوئی آدمی اس قلعے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ بھی مشہور تھی کہ اگر کسی نے زور سے کہہ دیا کہ ''کالا لنگڑا جا رہا ہے''۔ تو وہ باہر نکل آتا تھا اور وہ اس آدمی کو ہلاک کر دیتا تھا اور بعض تو یہ بھی کہتے تھے کہ وہ کوئی شرشرار یا کسی ظالم بادشاہ کی بدروح ہے۔

میرے نزدیک یہ محض مبالغہ اور وہم تھا، میں دوسرے دن ہی قلعہ نما جنگل میں داخل ہو گیا۔ واقعی جنگلی سوروں کے لیے اس سے زیادہ مناسب آرام کی جگہ ملنا مشکل تھی۔ گھٹنے گھٹنے پانی، دلدل میں گھنی جھاڑیاں اور دب کے اونچے اونچے پودے تھے۔ ایک قدم بھی چلنا محال تھا۔ میں تقریباً دو گھنٹے وہاں گھومتا رہا لیکن کالے لنگڑے سے ملاقات نہ ہو سکی اور واپس آ گیا۔ اگلی صبح موہن کو ساتھ لے کر دریا میں مرغابیوں کے شکار کے لیے چلا گیا۔ 12 بجے تھک کر لوٹ آئے تو معلوم ہوا کہ کالے لنگڑے نے گاؤں کے ایک اور نوجوان کو زخمی کر دیا ہے اور نوجوان بے ہوش ہے، میں اسے دیکھنے چلا گیا۔ دیہات کی عورتیں اور بچے سب وہاں جمع تھے۔

زخمی کو دیکھا تو پتہ چلا کہ تقریباً تمام جسم پر گہرے زخم ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہوش میں آ کر اس نے آنکھیں کھولیں تو چیخنے لگا۔ وہ آیا۔ وہ آیا۔ میں مر گیا۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔ اس کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے زخمی کو ہسپتال جانے کا مشورہ دیا اور خود دل ہی دل میں عہد کرتا ہوا لوٹ آیا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر لنگڑے کو ختم کر دوں گا۔ زخمی کے چھوٹے بھائی سے معلوم ہوا کہ حسب معمول دونوں بھائی کھیت میں گھاس لینے گئے جب کھیت میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کالا لنگڑا تقریباً بیس گز کے فاصلے پر جا رہا تھا۔ زخمی ہونے والے جوان نے شور کر دیا۔۔۔ ''کالا لنگڑا، کالا لنگڑا''۔

لنگڑے سور نے رخ بدل لیا اور چنگھاڑ کر حملے کے لیے دوڑا اور ذرا سی دیر میں اس نے اس آدمی کی ہڈی پسلی ایک کر دی اور پھر مزے سے چلتا ہوا پناہ گاہ میں داخل ہو گیا۔ اس وقت اور بھی چند آدمی وہاں موجود تھے لیکن اس منظر کو دیکھ کر سب اس قدر دہشت زدہ ہو گئے اور کچھ بھی نہ کر سکے اور اپنی جانیں بچانے کی فکر میں رہے۔

دوسرے ہی دن میں نے ڈبل بیرل گن سنبھالی اور لنگڑے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کسی حد تک خوف زدہ بھی تھا۔ سارا دن کھیتوں اور جنگل میں گھومتا رہا لیکن کالا لنگڑا نہ ملا۔ اسی طرح پانچ دن گزر گئے لیکن لنگڑے کی شکل نظر نہ آئی۔ کچھ ایسا شک ہونے لگا جیسے وہ چلا گیا ہے لیکن کبھی کبھی یہ خیال بھی بُری طرح پریشان کرتا کہ جب اس سور کو اتنی تمیز ہے کہ وہ کالا لنگڑا سنتے ہی کہنے والے پر حملہ کر دیتا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ مجھے دیکھ کر چھپ جاتا ہو اور سمجھ لیتا ہو کہ یہ دیہاتی نہیں اور خاموشی سے دبک جاتا ہو؟

چھٹے روز میں نے تلاش ترک کر دی اور انتظار کرنے لگا کہ دیکھوں اب کب نظر آتا یا کسی پر حملہ کرتا ہے۔ لیکن اسی شام کو اطلاع ملی کہ کالا لنگڑا پھر دیکھا گیا ہے۔ میں فوراً بندوق لے کر جنگل کی طرف چل پڑا۔ اس کے چھپنے کی جگہ گاؤں سے تین میل دور تھی۔ بیچ میں گہری کھائی تھی اور چاروں طرف اونچے اونچے بند تھے یعنی اس کی پناہ گاہ کا علاقہ نشیب میں تھا۔ ایک میل دور سے ہی گولیاں چلنے کی آواز میرے کانوں میں آنے لگی۔ پتہ چلا کہ کچھ لوگ صبح سے کالے لنگڑے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں لیکن کوئی گولی اس پر اثر نہیں کرتی وہ سامنے آتا ہے اور جب اس پر گولی چلتی ہے تو بڑے اطمینان سے جنگل کی طرف چلا جاتا ہے۔ وہاں پہنچا، عجیب منظر دیکھا۔ بلند جگہ پر تقریباً ڈیڑھ سو آدمی کھڑے شور مچا رہے تھے۔ کتے بھی پوری قوت سے ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ نیچے نشیب میں دو آدمی بندوقیں تھامے کھڑے سامنے جھاڑیوں میں فائر کر رہے تھے۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ سور سامنے کی جھاڑیوں میں ہے۔ میں نے بلندی سے جائزہ لیا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ درندہ جنگل میں ہو سکتا ہے، کیونکہ کتے اس کی بو پر پوری طرح بھونک رہے تھے لیکن جنگل کا یہ ٹکڑا کم و بیش ایک مربع میل میں پھیلا ہوا تھا اور اس میں ایک درندے کو تلاش کرنا آسان نہ تھا۔ شام بھی گہری ہونے والی تھی۔ میں نشیب میں اُتر گیا اور ان دونوں شکاریوں سے فائرنگ بند کرائی۔ وہ اناڑی تھے جو کارتوس چلا رہے تھے۔ حیرت ہے کہ اس کے بعد یہ فوجی پھر کبھی سور کے شکار کو نہ آئے۔ ایک ہی میجر کو زخمی کروا کر انہوں نے ساری مہم ترک کر دی تھی۔

میں محتاط ہو کر جھاڑیوں میں داخل ہو کر تقریباً پندرہ منٹ گھومتا رہا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ میں نے موہن کے کتے کو بلا لیا، اس ایک کتے کو دیکھ کر اور کتے بھی اُتر آئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے کسی کتے کی خوفزدہ سی بھونکنے کی آواز آئی۔ بھونکنے کا انداز بتا رہا تھا کہ کتا سخت خطرے میں ہے۔ میں بھاگتا ہوا کتے کی آواز کی طرف گیا لیکن پانی اور کیچڑ کی وجہ سے تیز چلنا آسان نہ تھا۔ میں دلدل سے نکل کر خشک زمین پر چلا گیا جہاں سرکنڈوں کی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ اچانک کتے کی دلدوز چیخ سنائی دی اور کتا میرے سامنے ہوا میں کئی فٹ اوپر اُچھلا اور گرا، پھر گلا گھونٹنے کے خراٹے سنائی دیئے اور پھر خاموشی۔ کالا لنگڑا ایک اور کتے کو ختم کر چکا تھا۔

میں بہت تیزی سے آگے بڑھا لیکن اچانک رُک گیا۔ بائیں ہاتھ پر کالا سور کھڑا تھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے اطمینان سے نشانہ لیا، لبلبی دبانے ہی لگا تھا کہ دائیں طرف سے خوفناک پھنکار سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر ادھر دیکھا، میری رگوں میں خون جم گیا۔ ایک سیاہ ناگ تقریباً چھ سات فٹ کے فاصلے پر کنڈلی مارے بیٹھا تھا اور آہستہ آہستہ پھن اُٹھا رہا تھا۔ اس کے سر پر سفید سا (V) کا نشان نظر آ رہا تھا۔ وہ شیش ناگ تھا جسے میں اچھی طرح جانتا پہچانتا تھا۔

غنیمت یہ ہوا کہ سور نے مجھے نہ دیکھ لیا ورنہ مجھ پر حملہ کر تا دیتا۔ سانپ کو دیکھ کر میرا بندوق والا ہاتھ خود بخود ڈھیلا ہو گیا اور بندوق کندھے سے اُتر کر بغل میں آ گئی۔ اس میں میرے ارادے کو قطعاً دخل نہ تھا۔ میں سور سے بالکل غافل ہو گیا اور ناگ کو دیکھنے لگا۔ اس وقت خوف کے مارے مجھے بھی شک ہونے لگا کہ یہ کالا لنگڑا کوئی شرشرار یا بدروح ہے جس کی حفاظت کے لیے ناگ آ نکلا ہے۔

ناگ نے ہلکی سی پھنکار لی اور سر کو زمین سے بلند کر کے میری طرف دیکھا۔ میں کسی سحر زدہ کی طرح ناگ کی طرف دیکھنے لگا۔ ناگ پھن کو پھیلا کر آہستہ آہستہ اوپر اُٹھ رہا تھا۔ تقریباً تین فٹ بلند ہو کر اس نے جسم سیدھا کیا۔ بار بار زبان کو باہر نکالتا اور اندر کرتا، جیسے ہر سانپ کیا کرتا ہے۔

میں ٹکٹکی باندھے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ مجھ پر مدہوشی چھا گئی اور میں خود سے غافل ہو گیا۔ اب حالت یہ تھی کہ میں بغیر پلکیں جھپکائے ناگ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک میں یوں ہی کھڑا رہا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی قوت مجھے ناگ کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اسی حالت میں میرا دایاں قدم اُٹھا اور آگے بڑھ گیا جوں ہی قدم آگے بڑھا، ناگ نے جھوم کر پھن اور پھیلایا اور پیچھے کی طرف سر ہٹا کر ترچھا ہو گیا اور پھر ایک خوف ناک پھنکار.....اور اس پھنکار نے میری جان بچالی۔ پھنکار سنتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے میں سوتے میں چونک پڑا ہوں۔ اب تمام حالات تیزی سے دماغ میں گھوم گئے۔ ایک طرف سور کھڑا ہے اور دوسری طرف ناگ۔ میں درمیان میں کھڑا ہوں۔ آس پاس کوئی بھی نہیں، جو میری مدد کرے۔ میں اب ہوش میں تھا اور تیزی سے سوچ رہا تھا کہ پہلے سور کو ماروں یا ناگ کو دراصل کام دونوں مشکل تھے اور دونوں میں سے کوئی بھی مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ پہلے ناگ کو ختم کر لوں کیونکہ یہ زیادہ خطرناک ہے لیکن مجھے یہ چیز خاصی پریشان کر رہی تھی اور اس سے پہلے تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ اگر چھرے اکٹھے ناگ کی گردن میں لگیں گے تو ٹھیک ہے ورنہ پھیلے ہوئے چھرے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے بلکہ وہ زخم کھا کر بھی پلک جھپکتے مجھ پر حملہ کر دے گا۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ میں اب ناگ کی آنکھوں میں نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس سے نظریں چرا رہا تھا کیونکہ میری آنکھوں میں اتنی قوت ہی نہ تھی جو ناگ کی نگاہوں میں جھانکتا۔ اگر ناگ چاہتا تو بڑی آسانی سے مجھے ڈس لیتا کیونکہ میرے قدم بڑھانے سے اب فاصلہ اور کم ہو گیا تھا پھر اتنا وقت بھی نہ تھا کہ میں بندوق بغل سے نکال کر کندھے پر لاتا اور نشانہ لے کر گردن پر فائر کرتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ تھا کہ بندوق ہلتے ہی ناگ حملہ کر دے گا۔

میرا جسم کانپنے لگا۔ لبلبی پر انگلی، میں بھی ارتعاش تھا۔ میں خود محسوس کر رہا تھا کہ اگر چند سیکنڈ کی بھی دیر ہوئی تو میں ختم ہو جاؤں گا۔ آخر ہمت کر کے میں نے فیصلہ کر لیا کہ پھر ناگ کی آنکھوں میں جھانکوں اور جب وہ میرے چہرے کی طرف تمام توجہ سے دیکھے تو آہستہ سے بندوق کا رُخ اس کی طرف پھیر دوں۔ میں نے جھکی ہوئی پلکیں اُٹھائیں، ناگ کی آنکھوں میں دیکھا۔ نگاہیں ملیں تو ناگ نے سسکاری سی لی۔ میرا رواں رواں کانپ اُٹھا لیکن ہمت کر کے میں نے آہستہ سے ناگ کی طرف رُخ موڑ دیا لیکن وہی ہوا جس کا خوف تھا، بندوق ہلتے دیکھ کر ناگ نے زور سے پھنکار لی، پھن تھوڑا پیچھے کیا اور جست کرنے کی پوزیشن لے لی۔ خوف سے میری سانس رُک گئی۔ آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور معلوم نہیں کس طرح لبلبی دب گئی۔ ایک دھماکہ ہوا اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ سانپ اچھل کر چار فٹ پیچھے جا گرا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ گردن آدھی سے زیادہ اُڑ گئی تھی۔ شاید میں نے ہوش میں ہی فائر کیا تھا لیکن کچھ یاد نہیں۔

اسی لمحہ سور کی آواز سنائی دی۔ میری پیٹھ اس کی طرف تھی، خدا جانے مجھ میں اتنی قوت اس وقت کہاں سے آ گئی کہ میں نے کھڑے کھڑے چھلانگ لگائی اور کئی فٹ دور جا گرا۔ چھلانگ نے میری جان بچالی۔ سور نے حملہ کر دیا تھا لیکن وار خالی گیا۔ وہ آگے نکل گیا۔ اب میں چوکنا تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن ٹانگیں تو اب بھی ناگ کی دہشت سے کانپ رہی تھیں۔ میں نے بیٹھے بیٹھے سور کی طرف دیکھا جو گھوم کر مجھ پر دوبارہ حملہ کرنے آ رہا تھا۔ میں نے بندوق کاندھے پر رکھ کر نشانہ لے لیا، جوں ہی سور کا منہ میری طرف مڑا میں نے آنکھ پر فائر کر دیا۔ چھروں کا

گروپ آنکھ میں سے گزر کر کھوپڑی میں چلا گیا۔ سور وہیں بیٹھ کر چنگھاڑنے لگا۔ یہ میری فتح کی علامت تھی لیکن پھر بھی احتیاطاً میں نے خالی کارتوس نکال کر دو نئے بھر دیئے لیکن سور نہ اُٹھ سکا۔ اس کی چیخوں نے کتوں کو متوجہ کر لیا تھا اور اب سارے کتے اس پر پل پڑے تھے۔ دیہاتی بھی بھاگے آ رہے تھے۔ میں پھر ناگ کی طرف متوجہ ہوا، اس نے سر پٹخنا بند کر دیا تھا البتہ اس کا پچھلا حصہ اب بھی ہل رہا تھا۔ اتنی دیر میں سب لوگ پہنچ گئے اور جب وہ میرے قریب آئے اور سانپ کو دیکھا تو ایک دیہاتی نے لکڑی ہلتے ہوئے ناگ پر ماری۔ مجھے ایک سپیرے کی بات یاد آ گئی تو میں نے دیہاتی کو وہ لکڑی پھینک دینے کو کہا۔ اس نے عجیب نظروں سے دیکھا اور لکڑی پھینک دی۔ لکڑی کا ایک سرا سانپ پر گرا۔ دوسرے ہی لمحے لکڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ یہ شیش ناگ تھا۔

دیہاتی کالے لنگڑے کو گھسیٹ کر باہر لے گئے اور مردہ جسم پر لاٹھیاں اور کلہاڑیاں مار مار کر خوش ہوتے رہے۔ سوائے میرے فائر کے نشان کے باقی جسم بے داغ تھا۔ اس کے حملہ کرنے کے دانت آٹھ آٹھ انچ لمبے اور انتہائی تیز تھے۔

.....❁.....

شکنجہ

شکنجہ ناول پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ہمارے ہاں گذشتہ کچھ سال سے ''ٹریک ٹو ڈپلومیسی'' کا غلغلہ کچھ زیادہ ہی زور شور سے مچایا جا رہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ محبتوں کے جو زنگ آلود دروازے حکومتیں نہیں کھول سکیں وہ شاید عوام بلکہ عوام بھی نہیں دانشور خواتین و حضرات اپنی مساعی سے کھولنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن..... اس ٹریک ڈپلومیسی کی آڑ میں کیا گھناؤنا کھیل رچایا جا رہا ہے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں ''بھولے بادشاہوں'' کو کس کس طرح اپنے جال میں پھانستی ہیں اور ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

ایک اور بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ پاکستان اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے کی ذمہ داری ''را'' پر ڈال دیتا ہے۔ یہ بات کس حد تک سچ ہے؟ کس حد تک جھوٹ؟ شاید ان سوالات کے جواب بھی آپ کو اس ناول کے مطالعے سے مل جائیں۔ محبتوں کی آڑ میں منافقتوں کا دھندہ کون چلا رہا ہے؟ دشمن کی سازش کیسے انجام پاتی ہے اور اس سازش کا شکار ہم انجانے میں کیسے بن جاتے ہیں میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول کتاب گھر کے **ایکشن ایڈونچر جاسوسی** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

بدروح

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنے تار میں مجھ سے انسانیت کے نام پر اپیل کی کہ میں فوری طور پر دیوبان روانہ ہو جاؤں اور وہاں کے باشندوں کو اس بلائے بے درماں سے نجات دلاؤں جو ایک آدم خور چیتے کی شکل میں ان پر نازل ہو گئی ہے۔

میں نے اپنے کیمپ کا ساز و سامان اسی روز اپنے ملازموں کے ہمراہ دیوبان روانہ کر دیا۔ اگلے روز میں خود بھی دیوبان پہنچ گیا۔ دیوبان پہنچ کر ابھی میں اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے اُترنے بھی نہ پایا تھا کہ رونے پیٹنے کی بلند اور رنجیدہ صداؤں نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی۔ دیوبان وسطی ہندوستان (سی پی) کی اُجڑی پجڑی اور بنجر سی پہاڑیوں کے دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ان پہاڑیوں پر جا بجا کانٹے دار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ غار موجود تھے جہاں درندے آسانی سے پناہ لے سکتے تھے۔ دیوبان کے اِردگرد دو دو چار چار میل کے فاصلے پر اسی قسم کے کچھ اور بھی دیہات تھے جن میں کچے مکانات تھے بلکہ زیادہ تر گھاس پھوس اور بانس سے بنائی ہوئی جھونپڑیاں تھیں۔ ان دیہات میں کول قوم کے لوگ آباد تھے جو تمام تر ان پڑھ اور تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھے۔ یہ لوگ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ رکھتے یا معمولی کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔

میرے دریافت کرنے پر میرے ملازمین نے مجھے بتایا کہ آج صبح یہاں سے کوئی ایک میل دور بکریاں چرانے والی ایک بیوہ عورت کے دس بارہ سالہ بچے کو ایک چیتا اُٹھا کر لے گیا اور ابھی تک اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ میں نے گھوڑے کو یوں ہی چھوڑا اور اسی وقت گاؤں کے اندر چلا گیا وہاں مرد عورتوں اور بچوں کا ایک ہجوم جمع تھا اور یہ سب لوگ بے اختیار رو رہے تھے۔ ان میں سب سے بلند رونے کی آواز اس عورت کی تھی جو چیتے کا شکار ہونے والے لڑکے کی ماں تھی۔ میرے وہاں پہنچتے ہی ان لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور مجھ سے فریاد کی کہ میں اس چیتے کا کھوج لگا کر اسے اپنی گولی کا نشانہ بنا ڈالوں۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ پہلے رونا دھونا بند کر دیں اور پھر مجھے بتائیں کہ یہ واقعہ کب اور کیسے رونما ہوا۔ میری ہدایت پر وہ لوگ کچھ چپ ہوئے لیکن لڑکے کی ماں پھر بھی رو رہی تھی اور کسی طرح خاموش ہونے میں نہ آ رہی تھی۔

اس غم ناک حادثے کا عینی شاہد اسی گاؤں کا کوئی سولہ سترہ سال کا ایک نوجوان تھا جو اس لڑکے کے ہمراہ خود بھی بکریاں چرا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ میں اور وہ لڑکا آج صبح یہاں سے ایک میل پرے بکریاں چرانے کے لیے گئے۔ ہم لوگ بکریاں چرا رہے تھے کہ لڑکے کو پیاس محسوس ہوئی اور وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر واقع تالاب سے پانی پینے کے لیے چلا گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ قریبی جھاڑیوں میں سے ایک چیتا نکلا اور بکریوں کے ریوڑ میں سے گزرتا ہوا لڑکے کی طرف بڑھا۔ میرا ابھی تک یہ خیال تھا کہ وہ بکری اُٹھائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے کسی بکری کو نہیں چھیڑا بلکہ لڑکے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے لڑکے پر چھلانگ لگا دی جو حالات سے بے خبر تالاب کے کنارے پر بیٹھا ہوا پانی پینے میں مصروف تھا۔ اس کی گردن پکڑی اور لڑکے کو گھسیٹتا ہوا جس طرح سے آیا تھا، اُسی طرح واپس جھاڑیوں میں گھس گیا۔ یہ واقعہ کچھ اتنی تیزی

سے پیش آیا کہ میں گھبراہٹ میں لڑکے کو اس خطرے سے خبردار بھی نہ کر سکا اور پھر مارے ڈر کے وہاں سے گاؤں میں بھاگ آیا۔

لوگوں نے مجھے مزید بتایا کہ اس درندے کو اس علاقے میں آئے ہوئے کوئی تین ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور اس عرصے میں وہ پندرہ کے قریب مرد، عورتوں اور بچوں کی جانیں لے چکا ہے۔ اس کے حملوں کا زیادہ تر نشانہ وہ لوگ بنے جو رات کو اپنے کھیتوں میں سوئے ہوئے ہوتے تھے یا پھر جن کے مکان اور جھونپڑیاں جنگل کے کنارے واقع ہوتی تھیں۔ جھونپڑیوں کی گھاس پھونس اور مٹی سے بنی ہوئی دیواروں میں اپنے پنجوں سے سوراخ کرنا، اس کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اس کا پہلا نشانہ ایک عورت تھی جو رات کو اپنے کنبے کے دوسرے افراد کے ہمراہ اپنی جھونپڑی میں سو رہی تھی۔ چیتا آیا۔ اس نے حسب معمول دیوار میں سوراخ کیا اور جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ پہلا انسان جو چیتے کے قابو آیا وہ یہی عورت تھی۔ چیتے نے اس عورت کا منہ اپنے منہ میں لینا چاہا تو عورت کے بال اس کے منہ میں آ گئے۔ اس نے عورت کو بالوں سے پکڑ کر باہر نکالنا چاہا، لیکن اس عرصے میں عورت جاگ اُٹھی اور اس کی چیخ و پکار سے گھر کے دوسرے افراد بھی بیدار ہو گئے۔ چیتے نے گھبرا کر عورت کو چھوڑ دیا اور خود باہر نکل آیا۔ عورت کو اگرچہ اس نے بالوں سے پکڑا تھا، تاہم پھر بھی اس کے کئی دانت عورت کی کھوپڑی پر لگے۔ اس کے دانتوں کا زہر اس قدر مہلک ثابت ہوا کہ وہ عورت اگلے دن دوپہر کو فوت ہو گئی۔

چیتا اب تک حملے رات کی تاریکی میں کرتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے روزِ روشن میں بکریاں چرانے والے لڑکے کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔ دیوبان میں اس کی یہ دوسری واردات تھی۔ ورنہ گاؤں کے لوگوں کی اطلاع کے مطابق اس کی وارداتوں کا زیادہ زور یہاں سے چھ میل دور اجھارا نامی گاؤں پر تھا جہاں اس کے ہاتھوں مرنے والوں کی تعداد چھ تک پہنچ چکی تھی۔

میں ان حالات کو سن کر اپنے کیمپ میں واپس آ گیا۔ میرے گھوڑے پر زین ابھی تک کسی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی رائفل سنبھالی اور اس نوجوان اور گاؤں کے چھ سات دوسرے آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے کر لڑکے کی لاش کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ لڑکے کی ماں نے بھی ساتھ چلنے کی ضد کی چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ مجھے گاؤں والوں کا غیر ہمدردانہ اور بزدلانہ رویہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اب تک لڑکے کی لاش کی تلاش میں نہیں نکلا تھا۔ ہم جلدی ہی تالاب کے کنارے پہنچ گئے وہاں لڑکے کے گھسیٹے جانے کے آثار موجود تھے چنانچہ ان کی مدد سے ہمیں لڑکے کی لاش تک پہنچنے میں کوئی خاص دقت پیش نہ آئی۔ چیتے نے لڑکے کی لاش کو ایک خشک نالے میں ایک جھاڑی کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ اس نے لڑکے کی ٹانگ کا کچھ حصہ کھا لیا تھا۔ باقی لاش موجود تھی لیکن اس کا حلیہ بُری طرح بگڑ چکا تھا۔

لاش کی حالت جیسی بھی تھی لیکن مامتا کی ماری ماں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ وہ تیزی سے لاش کی طرف بڑھی پھر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ لاش کو اُٹھا کر اس نے اپنی گود میں رکھ لیا۔ کبھی وہ اس کا منہ چومتی اور کبھی دھاڑیں مار مار کر روتی۔ یہ دلدوز منظر دیکھ کر ہم سب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بلاشبہ ایسا دردناک منظر میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ بہرحال میں نے اس عورت کو صبر کی تلقین کی اور بڑی مشکل سے اسے خاموش کرایا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں آج رات کو لڑکے کی لاش کے قریب ایک مناسب درخت پر بیٹھ کر چیتے کا انتظار کروں۔ گاؤں کے لوگوں کے سامنے

جب میں نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تو انہوں نے بڑی خوشی سے مجھے اس بات کی اجازت دے دی لیکن لڑکے کی ماں نے نہ مانی۔ میں نے اسے دس روپے (اس وقت کے تقریباً دو صد روپے) کا نوٹ بھی دینا چاہا اور یہ بھی بتایا کہ آج اس درندے سے انتقام لینے کا شاندار موقع ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں اسے آج ہی ختم کر ڈالوں لیکن اگر وہ آج نہ مارا گیا تو اس امر کا خدشہ ہے کہ پھر گاؤں کا کوئی آدمی اس کا نشانہ بن جائے لیکن وہ عورت اتنی ضدی ثابت ہوئی کہ اس نے دس روپے قبول کیے اور نہ میری کسی دلیل پر کان دھرے۔ وہ بار بار رو کر کہہ رہی تھی کہ میرے بچے کو میرے گھر لے چلو، میں اسے یہاں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ بہرحال یہ ماں کی ممتا تھی اور اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ عورت اپنے لڑکے کی لاش لے کر چلی گئی۔ اب چیتے کے انتظار میں میرا یہاں بیٹھنا لاحاصل تھا، پھر بھی میں جھٹپٹے کے وقت تک وہاں بیٹھا رہا لیکن جیسی توقع تھی وہی ہوا، چیتا نہ آیا۔ میرا خیال ہے کہ یا تو اس نے مجھے وہاں دیکھ لیا یا پھر اس کی چھٹی حس نے اسے متوقع خطرے سے خبردار کر دیا تھا۔

رات کو کھانے کے بعد جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن کوئی دو گھنٹے کے بعد ہی گیدڑوں کی مخصوص چیخ و پکار نے مجھے جگا دیا۔ گیدڑ یہ خوف زدہ آوازیں اس وقت نکالتے ہیں جب وہ کسی شیر یا چیتے کو جنگل میں چلتا پھرتا دیکھتے ہوں۔ میں اُٹھ بیٹھا، اپنی بندوق سنبھالی اور کیمپ کا چکر لگانے کے لیے باہر نکل گیا۔ میں نے ماحول پر ایک نظر ڈالی، ملازمین کو ہوشیار رہنے کی تلقین کی اور واپس آ کر سو گیا۔ رات بغیر کسی ناخوشگوار واقعہ کے گزر گئی۔ لیکن صبح میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چیتا اس رات ایک دفعہ نہیں بلکہ دو دفعہ ہمارے کیمپ کے اِردگرد پھرتا رہا لیکن خیریت رہی۔

لڑکے کی موت کے بعد چند دن تک علاقے میں امن رہا لیکن ایک ہفتہ بعد بدقسمت موضع اجھارا سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ چیتا پھر وہاں ایک آدمی کو اپنا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ شخص آدھی رات گئے پیشاب کرنے کے لیے باہر نکلا تھا کہ پھر اس کو لوٹنا نصیب نہ ہوا۔ بدقسمتی سے چیتا اس وقت باہر موجود تھا، وہ فوری طور پر اس شخص پر حملہ آور ہوا اور اسے نیچے گرا لیا۔ گرنے کی آواز سن کر اس کا ساتھی ایک جلتی ہوئی لکڑی لیے جھونپڑی سے باہر نکلا، اسے دیکھتے ہی چیتا فرار ہو گیا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ چیتا اپنے شکار کو یوں چھوڑ کر چلا گیا۔

چونکہ اس واقعے کی اطلاع مجھے کافی تاخیر سے ملی تھی۔ اس لیے میں نے موضع اجھارا جانا بے سود سمجھا اور دیوبان ہی ٹھہرا رہا۔ اب چاندنی راتیں شروع ہو گئی تھیں۔ ایک رات میں اور میری اہلیہ کیمپ کے باہر کرسیوں پر بیٹھے چاندنی کا لطف اُٹھا رہے تھے کہ میں نے اپنے سامنے کھلے میدان میں ایک چیتے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ میں فوراً لپک کر اُٹھا اور خیمے میں گھس کر پہلا ہتھیار نکال لایا جو ایک رائفل تھی جس سے میں رات کو شکار نہیں کر سکتا تھا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اسی رائفل سے چیتے پر فائر کیے لیکن ناکام رہا۔ چیتا الٹے پاؤں پھرا اور تیزی سے بھاگتا ہوا ہمارے کیمپ کی پشت پر واقع ایک نالے کی طرف چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑا لیکن وہ نالہ پار کر کے اس کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیوبان کا چکر لگا کر آیا تھا لیکن جب وہاں اسے کچھ نہ ملا تو قسمت آزمائی کے لیے ہماری طرف آنے کا ارادہ کیا۔

میرا خیال تھا کہ یہ آدم خور چیتا ابھی ہمارے علاقے میں ہے۔ اس لیے میں نے اگلی شام کو اپنے کیمپ سے کچھ فاصلے پر ایک مچان بندھوائی اور اس کے بالکل قریب ایک درخت کے نیچے ایک بکری بھی بندھوا دی۔ آدھی رات کے قریب جب میں مچان پر کچھ غنودگی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ میں نے بکری کی اچھل کود کی آوازیں سنیں، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی جانور اس پر حملہ آور ہو چکا ہے۔ میں نے اسی وقت نشانہ لیا اور گولی چلا

دی۔ گولی کا چلانا تھا کہ یک دم خاموشی چھا گئی۔ میں نے سیٹی بجائی اور تھوڑی دیر میں میرے آدمی لالٹین لے آئے۔ حملہ کرنے والا درندہ ایک لگڑ بگڑ تھا جس نے ہماری بکری کے نرخرے کو اپنے دانتوں میں سختی سے دبایا ہوا تھا اور اسی عالم میں اپنی جان بھی کھو بیٹھا تھا۔

اس واقعے کے دو روز بعد میں شام کو گھوڑے پر سوار چلا آتا تھا کہ میرے ساتھی کول نے مجھے ایک چیتا دکھایا جو ہم سے کوئی دو سو گز پر ایک پہاڑی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا، میں نشانہ لے رہا تھا کہ چیتا اُٹھ کھڑا ہوا۔ شاید اس کا ارادہ ادھر ادھر چھلانگ لگانے کا تھا لیکن میری رائفل چل چکی تھی۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ پلٹ کر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ ہمارا خیال تھا کہ آج ہم نے آدم خور کو زیر کر لیا ہے لیکن جب ہم پہاڑی پر پہنچے تو معلوم ہوا، یہ تو اوسط قد کی مادہ ہے جس کے متعلق پورے کیمپ کی رائے تھی کہ یہ ہرگز آدم خور نہیں ہے کیونکہ آدم خور جسمانی لحاظ سے بڑے قد و قامت کا بتایا گیا تھا۔ ابھی ہم اس معاملے پر غور ہی کر رہے تھے کہ اگلے روز ہمیں یہ اطلاع موصول ہوئی کہ موضع اجھارا کا ایک لڑکا گم ہو گیا ہے۔ یہ لڑکا اپنے چھ سات ہم عمر لڑکوں کے ہمراہ جنگل میں سوکھی لکڑیاں چننے کے لیے گیا ہوا تھا کہ وہیں گم ہو گیا۔ ہر چند اس کو تلاش کیا گیا مگر اس کا کوئی نشان نہ ملا۔ ہاں ایک جگہ کچھ خون ضرور پڑا ہوا ملا۔

لڑکے کے گم ہو جانے کی خبر مجھے اسی روز بعد از دوپہر مل گئی اور میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر موضع اجھارا روانہ ہو گیا۔ اجھارا سے میں نے تین آدمی ہمراہ لیے جو مجھے اس جنگل میں لے گئے جہاں سے لڑکا گم ہوا تھا۔ ہم اس مقام پر بھی گئے جہاں لڑکے کا خون پڑا ہوا ملا تھا لیکن جا بجا کانٹے دار جھاڑیوں کی وجہ سے یہ تعین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ درندہ لڑکے کی لاش کو کدھر لے گیا ہے۔ ہم پریشان ہو کر لوٹ رہے تھے کہ میں نے قریبی پہاڑی کے اوپر گدھوں کو چکر لگاتے دیکھا، ان کی موجودگی سے میرا یہ شبہ قوی ہو گیا کہ ہو نہ ہو لڑکے کی لاش یہیں کہیں پہاڑی پر موجود ہے۔ چنانچہ ہم لوگ پہاڑی کی طرف روانہ ہو گئے، میں سب سے آگے آگے پہاڑی پر چڑھ رہا تھا کہ مجھے کچھ پتھروں کے گرنے کی آواز آئی جونہی میں نے اس طرف دیکھا، ایک چیتا بجلی کی طرح ایک چٹان سے کودا اور جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ ہمیں چیتے کو دیکھ کر یہ یقین تو ہو گیا کہ اب ہم لڑکے کی لاش کے قریب آن پہنچے ہیں۔ لیکن آدمیوں کی نفری انتہائی کم ہونے کی وجہ سے ہم اس وقت چیتے سے دو دو ہاتھ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے لڑکے کی لاش کی تلاش جاری رکھی اور جلدی ہی اسے پا لیا۔ لڑکے کی لاش دو بڑی چٹانوں کے درمیان پڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ صحیح و سالم تھا لیکن سینے میں ایک بڑا سوراخ تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ہاتھوں اور ٹانگوں کا گوشت بھی درندے نے کھا لیا تھا۔ بہر حال یہ منظر بے حد دلخراش تھا لیکن ہمیں دیکھنا پڑا۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ لڑکے کی لاش کو اُٹھا لیں اور گاؤں چلیں کیونکہ اب سورج بھی غروب ہوا چاہتا تھا۔ تمام راستے میں یہی سوچتا رہا کہ اس درندے کو کیسے قابو کیا جائے کیونکہ وہ روز بروز دلیر ہوتا جا رہا تھا اور مرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے اجھارا کے لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر یہ صورتِ حال یونہی قائم رہی تو پھر وہ سب کے سب اس گاؤں کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اقدام سے حکومت کی بدنامی ہوتی تھی۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ مجھے چند دن کی مہلت اور دیں۔

اگلی صبح ایک سب انسپکٹر پولیس جو ہندو تھا، ہمارے کیمپ میں آیا چونکہ پچھلے دنوں موضع اجھارا میں چیتے کے ہاتھوں کئی آدمی مارے جا چکے تھے، اس لیے وہ پولیس رپورٹ تیار کرنے کے لیے وہیں جا رہا تھا۔ مجھے اس سرکاری ملازم کی باتیں سن کر حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ اس نے بتایا

کہ یہ چیتا دراصل کوئی بدروح ہے جو چیتے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس لیے مجھے چاہیے کہ میں اس کا بالکل پیچھا نہ کروں بلکہ واپس چلا جاؤں ہو سکتا ہے کہ کل کلاں کو مجھے اس سے نقصان پہنچے یا میرا کوئی آدمی اس کے ہاتھوں مارا جائے۔ تھانے دار کی بیہودہ باتوں کا مجھ پر تو کیا اثر ہونا تھا۔ بہر حال وہ چلا گیا۔

میرا کیمپ وہیں لگا رہا اور اگلا ہفتہ پورے کا پورا بغیر کسی حادثے کے خیریت سے گزر گیا۔ میں حیران تھا کہ چیتا کہاں گیا۔ ایک شام کو میں معمول کے مطابق سیر کو نہیں نکلا بلکہ کیمپ کے باہر ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ میرا سائیس ہانپتا کانپتا بھاگا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے ایک چیتے کو ہمارے کیمپ سے کوئی سو گز دور آموں کے درختوں کے جھنڈ سے گزر کر نالے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے، میں نے اس سے زیادہ کچھ اور نہیں سنا، فوراً اُٹھا اور اپنے خیمے سے اعشاریہ تین سو پچھتر مین سچر رائفل سنبھالی اور اس طرف دوڑ پڑا۔ جس طرف کی نشاندہی سائیس نے کی تھی۔ نالے کے کنارے پہنچ کر مجھے ایک مرتبہ تو کچھ نظر نہ آیا لیکن دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ نالے کے دوسرے کنارے کے پس پشت پہاڑی ڈھلان پر ایک چیتا آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا اوپر چڑھ رہا ہے۔ اگرچہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا، تاہم اس کے باوجود اس نے اپنی چال میں کوئی پھرتی یا تیزی نہیں دکھائی۔ خوش قسمتی سے اس کے آس پاس کوئی جھاڑی بھی نہیں تھی جہاں وہ پناہ لے سکتا۔ حالات بڑے سازگار نظر آ رہے تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ آج چیتا مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ میں نے بڑے اطمینان سے نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میرے فائر نے درندے کو گرا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک فائر اور کیا جس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور چیتا اب زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

میرے فائروں کی آواز سنتے ہی گاؤں کے لوگ بھی دوڑتے ہوئے وہاں آ گئے۔ چیتے کو جا کر دیکھا تو سب کی یہ متفقہ رائے ہوئی کہ وہی آدم خور چیتا ہے جو اس علاقے کے لوگوں کے لیے بلائے جاں بنا ہوا تھا۔ بس اب کیا تھا، دیہاتیوں نے جوش مسرت سے میری ''جے'' کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ فوراً ہی ایک تندرست و توانا کول میرے نزدیک آیا اور ہم لوگ ایک جلوس کی شکل میں اپنے کیمپ پہنچے۔ یہ خبر جلد ہی قریبی دیہات میں پہنچ گئی اور چیتے کو دیکھنے دکھانے کا سلسلہ اگلے روز تک جاری رہا۔ اس کے بعد میں نے اس کی کھال اتروالی۔ یہ رات میں نے دیوبان میں گزاری اور اگلی صبح وہاں سے روانہ ہو گیا۔

روانہ ہونے سے پیشتر میں نے گاؤں کے نمبردار کو اپنے کیمپ میں بلایا اور اسے نصف درجن پوسٹ کارڈ جن پر میں نے اپنے قلم سے اپنا پتہ لکھا ہوا تھا، دیئے اور اسے ہدایت کی کہ وہ ہر ہفتے مجھے ایک پوسٹ کارڈ ارسال کرتا رہے کہ میں نے واقعی صحیح آدم خور کو مارا ہے اور اب ان کے علاقے میں کوئی آدم خور دیکھنے میں نہیں آ رہا ہے۔ نمبردار نے چھ ہفتوں تک میری ہدایت کی تعمیل کی اور مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میں نے صحیح آدم خور کو مارا تھا۔ مجھے یہاں ایک افسوس بھی ہے اور وہ یہ کہ میری اس ہندو تھانے دار سے ملاقات نہ ہو سکی جس نے اس آدم خور کو بدروح قرار دیا تھا۔ ملاقات ہوتی تو میں اسے بتاتا کہ میں نے اس بدروح کو مار ڈالا ہے۔

.....❁.....

گنیش مہاراج

گنیش مہاراج سو برس سے اوپر عمر پا گئے تھے پھر بھی پہاڑ کے پہاڑ بنے ہوئے تھے اور پہاڑ بھی کائی سے ڈھکا ہوا۔ کالا چمڑا کسی زمانے میں سنگ موسیٰ کی چٹان کی طرح دمکا کرتا ہوگا۔ اب تو بھورا بھورا سیاہی مائل مٹیالا سا ہو گیا تھا اور دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اوپر سے نیچے تک میلی جھولی پڑی ہوئی ہے، جس کی شکنوں میں ڈھیروں دھول بھری ہوئی ہے۔ ننھی ننھی گول گول آنکھیں اور بھی اندر جا پڑی تھیں اور دونوں جانب کنپٹیوں کے گڑھے بہت نمایاں اور گہرے ہو گئے تھے۔ کسی زمانے میں جو دانت چیرنے، پھاڑنے، اکھاڑنے میں غضب ڈھایا کرتے تھے، ان میں ایک تو جڑ سے ٹوٹا ہوا تھا اور دوسرا کھٹل ٹھنڈ کی طرح میلا میلا زردی مائل تڑخا ہوا آگے کو سینگ کی طرح نکلا ہوا تھا، اور یہ بھی بے کار سا بوجھ تھا، خود ہی جب کسی قابل نہ رہے تھے اور اپنے اوپر آپ ہی بوجھ تھے تو یہ کیا کرتا۔ اور اب تو ان حالوں کی پہنچ گئے تھے کہ منہ کے اندر داڑھیں بھی کھٹلی پڑ گئی تھیں اور چبانے تک سے معذور تھے۔

ساری عمر ہمالیہ اور شوالک کے دامن میں بڑی بہادری کے ساتھ سرداری کی تھی اور اپنے زمانے میں بڑے بڑوں کا، اور اپنے سے سوائے ڈیوڑھوں تک کا سکہ نہ جمنے دیا تھا اور اب تو پیری اور صد عیب، ہاتھ پاؤں جواب دے گئے، گوشت تو رہا نہیں، پاؤں نے ہڈیوں اور کھال کا بوجھ لے کر چلنے سے انکار کر دیا، کولہوں اور ٹانگوں کے جوڑ چلتے میں چٹخ چٹخ کر فریادی کرتے، اور نگاہ تو خیر پیدائش سے کوتاہ ہوا کرتی ہے، سونگھنے کی قوت بھی گر گئی اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ پیٹ کا دوزخ تو بھڑک بھڑک کر ایندھن مانگتا اور منہ کے دانت دشمن ہو گئے، کھاتے میں داڑھیں دکھتیں اور چبانے میں اندر کی کھال دب جاتی، جبڑوں کی حرکت بھی ڈانوں ڈول سی ہو گئی تھی، نرم غذا تو آسانی کے ساتھ ہاتھ نہ آتی اور سخت کاٹے نہ کٹتی۔ پھر ننھی ننھی آنکھیں اندر ہی اندر گھما کر بل کھا کے مٹ مارتے۔ ایک روز ایک نیا پٹھورا ساتھ والی سے ٹھٹھولیں کرتا چل رہا تھا اور کچھ وہ بات تو مدتوں سے نہ تھی، پھر بھی بڑ بھس تھی، یا شاید یوں ہی جیسے حسب عادت بڑے بوڑھے لڑکوں کو گھرکتے چلتے ہیں۔ ذرا شوں کر کے ڈانٹ سا دیا، اور وہ نالائق سیدھا ہو گیا، اور اس کے سیدھے ہوتے ہی چودھراہٹ کی پھونک نکل گئی۔ گنیش مہاراج نے بڑے زور سے پھٹی ہوئی گردن میں ڈانٹ بتائی، مگر ڈانٹ کے ساتھ وہ ناخلف تو اُلٹا بھڑ گیا اور اس کے بھڑتے ہی سب نوجوان اور ادھیڑ تک بھڑ گئے، اور نئی نویلیاں تو خوش خوش کھڑی تماشا دیکھتی رہیں اور ان کے تو جلے دل کے پھپھولے پھوٹ رہے تھے، مٹے بوڑھے کھوسٹ نے عمر بھر ساتھ والے کے ساتھ ایک ساعت سہانی نہ گزارنے دی تھی اور جب بہار پر ہوتیں تو غول سے بھٹک کر دور کہیں گھنے جنگل میں جہاں بڈھے کی لمبی ناک کام نہ کر سکے، دو چار دن کے لیے ساتھ بھاگ جایا کرتیں اور وہاں بھی ہر وقت دغدغہ لگا رہتا کہ کہیں خرانٹ سونگھ نہ لے، مگر اس وقت چار چھ ٹھنڈی بڑی بوڑھیاں جن سے اپنے زمانے میں واسطہ رہا تھا آڑے آ گئیں، ورنہ بڈھے کو مار ہی گرایا تھا، پھر بھی سوکھی ہڈیاں اچھی خاصی کٹ گئیں اور وہ تو خیریت گزری کہ پہلی جڈ بڈھا روک گیا اور کہیں دوسری جڈ

ہو جاتی اور نیچے آ جاتا تو پھر اٹھانے سے اُٹھ بھی نہ پاتا اور یہیں پڑے پڑے گدھ نوچ لیتے۔

چودھراہٹ کا طلسم ٹوٹتے ہی غول کی قیادت چھوٹ گئی اور چند روز تو روٹھے روٹھے سے دائیں بائیں لگے رہے، مگر مہاراج میں کچھ باقی تو تھا ہی نہیں جو ساتھ والیاں منا کر لاتیں، مفت میں گھیر گھار کے پڑے تھے۔ اور نئے پٹھوروں کے تیور بدستور بے ڈھب تھے، دوسرے تیسرے ہی روز مہاراج کو اندازہ ہو گیا کہ سیادت ہاتھ سے نکل گئی۔ جب ان میں سے ایک نے رہنمائی کرنی شروع کر دی اور پھر قیادت سنبھالی تو صبر آ گیا، مگر غول چھوڑتے بھی بن نہ پڑی۔ اترا شحنہ مردک نام۔

پون صدی سے غول کے آگے آگے چلنے والا غیور سردار اب تین سو گز پیچھے چلنے لگا! خیر یہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ آٹھ دس من وزن کا بھاری پیٹ ساتھ لگا ہوا تھا اور اس دوزخ کے اندر جو دو چار چھ من خس و خاشاک پڑ سکتا تھا وہ غول ہی کے سہارے لگے رہنے سے ممکن تھا مگر چند ہی روز میں یہ بات بھی ناقابلِ برداشت ہو گئی، خیر کچلا ہوا پس خوردہ اور روندی ہوئی جھوٹن کھا کر صبر کر لیا، اور سب سے آگے چلنے والے اور بہترین نرم شیریں تازہ غذا پر سب سے پہلے منہ ڈالنے والے سردار نے اس پر گزر کر لی، مگر اس کے ساتھ سب سے مکروہ چیز وہ بول و براز کے غلیظ ڈھیر ہوتے جو غول کے ساتھ ساتھ پیچھے چھوٹتے جاتے، چند ہی روز میں لمبی ناک والے مہاراج جی چھوڑ گئے، اور پھر مجبور ہو کر ان کا پیچھا بھی اور چھوڑنے کو تو غول چھوڑ گئے مگر چھوڑتے ہی آنکھیں کھل گئیں، مدتوں سے دوسروں کی ناک، کان اور آنکھ نے کام کیا تھا اور مہاراج نے مفت میں رہنمائی کی تھی اور بہترین مال مارا تھا، اعلیٰ سے اعلیٰ چارہ کھایا تھا اور نئی نئی سرزمینوں کی سیر کی تھی۔

غول کا پیچھا چھوڑ کر پتہ چلا کہ ہم کیا ہیں، نہ تو سو دو سو قدم تک اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں اور نہ میل دو میل کا سن سکتے ہیں اور خیر چار چھ میل کی سونگھ بھی لیں کہ نرم نرم نمکین نمکین پیڑ کا قطعہ کدھر ہے، میٹھی میٹھی ایکھ کے رس بھرے گنوں والے ہرے بھرے کھیت کون سی سمت ہیں تو پھر بھوک اور بڑھاپے میں دس پانچ کوس کا دھاوا مار کے وہاں پہنچنا کارے دارد، اور پھر گنے کے کھیتوں پر اکیلے دو کیلے کے بس کا کام بھی نہ ہوتا، کسان بڑی بھرپور چوکسائی کرتے، وہاں تو غول کے ساتھ ہی چھاپہ پڑ سکتا تھا اور وہ بھی ترکیب سے کٹیلی باڑھیں اور آرگڑے کر ڈک ڈک زمین پر سونگھتے چلنا اور پھونک پھونک کر قدم ڈالنا کہ کہیں گھاس پھونس سے ڈھکی کھائیوں اور گڑھوں میں نہ جا پڑیں جو کسان کاشت شدہ قطعوں کے قرب و جوار میں جنگلی جانوروں کی گزرگاہوں پر کھود دیتے ہیں۔ اب رہیں برگد گولر پیپل کی شاخیں، ان کا تروڑنا مروڑنا اور پھر چھیل کر اندر سے گری نکالنا، یہ تو ان کے لیے غول والے کیا کرتے تھے۔ دو ایک دن اس پر بھی کوشش کی، خیر، مگر پہلے تو محنت بہت زیادہ پھر یہ سخت غذا ان کے دانتوں کا روگ نہ تھی، سمجھ گئے کہ زندگی کے دن بہت تھوڑے باقی ہیں اور کسی دن گھل گھلا کر جہاں تہاں پسرے رہ جائیں گے مگر تقدیر کے لکھے کو کون مٹائے۔ مثل مشہور ہے ہاتھی جیے تو لاکھ کا مرے تو سوا لاکھ کا، ساری عمر ہاتھیوں کی سرداری کی تھی۔

آخر میں دیوتا بننا اور دودھ ملائی کھانا قسمت میں لکھا کر لائے تھے۔ کئی دن کے بھوکے ایک سمت آہستہ آہستہ بڑھتے چلے گئے اور چلتے چلتے شہر کی مضافات میں جا پہنچے اور ڈیرہ دون کے تو چاروں طرف گھنا جنگل لگا ہوا تھا۔ ایک دیہاتی راستہ کے کنارے شام کے وقت تھکے تھکائے گھنے درختوں کے جھنڈ تلے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے اور بیٹھ کر اچھی طرح سستا بھی نہ پائے تھے کہ شامہ نے تازہ دودھ کی خوشبو لے لی۔ پنکھا

سے کان جلدی جلدی ہلے اور سونڈ کی نوک ہوا میں لہرا لہرا کر خوشبو کی سمت کا تعین کرنے لگی، جب تک کچھ سنائی آوازیں کان میں پڑیں، میٹھی میٹھی اطمینان سے بڑھتی ہوئی آوازیں اور یکدم پانچ دیہاتنیں دودھ کی مٹکیاں سروں پر دھرے شہر کو جاتی سامنے آگئیں، بالکل ہی قریب، اتنی قریب کہ ایک ذرا کمر سے اچک کر اور سیدھی ٹانگیں آدھی کھڑی کر کے جو سونڈ بڑھائی تو ایک مٹکی سر پر سے سونڈ کی نوک میں پھنس گئی۔ سب نے حیرت اور خوف سے ایک چیخ لگائی اور گنیش مہاراج! کئی گھگھیائیں۔ بعض اپنی مٹکیاں آہستہ آہستہ سے اُتار کر اور کچھ چیخ کر الٹے پاؤں بھاگ گئیں۔ گنیش مہاراج نے اطمینان کے ساتھ پہلے سونڈ والی مٹکی سونت کر خالی کی، پھر دوسری مٹکیاں، اور پھر زمین پر چھلکا ہوا جتنا دودھ چوسنے کو ملا سونڈ سے جمع کر کر کے چوس گئے اور نہ معلوم کئی دن کے بھوکے پیاسے گنیش مہاراج کا برت دودھ سے کھلا، اور من بھر دودھ پی کر آنکھیں کھلیں، کان بھی تیز ہوئے اور ناک بھی سڑسڑائی..... صبح تک تمام دیہات میں افواہ پھیل گئی کہ گنیش جی نے درشن دیئے ہیں، اور گنیش جی نے یہاں سے ہٹ کر صبح کو دوسری پگڈنڈی پر درشن دیئے اور پھر شام کو تیسری سمت اور تیسرے روز لوٹ کر پھر پہلی جگہ پر آگئے۔ تین چار روز تو کچھ چھاپوں جیسی صورت رہی، مگر ہفتہ بھر بعد تو یہ چیز عقائد میں گھر کرنے لگی اور روز بروز عقیدہ راسخ تر ہوتا گیا۔ پہاڑی کے دامن کے بسویا بھولے دیہاتی گنیش درشن کے لیے چڑھاوا لے کر تلاش کرنے لگے، اور گنیش مہاراج کو دودھ پلانا سعادت ہوگئی۔ پھر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک چڑھاوے کے بعد گایوں، بھینسوں کا دودھ چند بلکہ سہ چند تک بڑھ جانے کی زریں افواہیں اور ساتھ ہی ساتھ کوتاہی کرنے میں اچھی بھلی دودھار گایوں اور بھینسوں کے خشک ہو جانے کی باتیں پھیلنے لگیں۔ بھلا اس جنگل میں ہاتھی کب نہیں رہتے تھے، مگر پہلے تو شہر سے دور دور رہا کرتے تھے اور پھر گھاس پات کھایا کرتے تھے۔ کہیں کہیں جب موقع مل جاتا، سال میں دو مرتبہ دھان، گنے، گیہوں، جوار کی فصل پر دھاوا مار دیتے، یہ سر سے دودھ اُتار کر پینے والی بات تو بڑے پرانے بوڑھوں کے تجربوں میں بھی نہ کبھی دیکھی نہ سنی تھی، لہٰذا بات راسخ تر ہوتی گئی اور شہر میں دودھ والوں کی دُکان تک پہنچی اور پھر سارے شہر میں گشت کر گئی۔ مقامی اخباروں تک نے گنیش درشن کے عنوان سے خبریں چھاپیں اور گنیش مہاراج کے ایسے دن پھرے کہ کبھی ان کے باپ دادا کے نصیب میں بھی نہ ہوئے تھے۔ جوں جوں دن بیتے چڑھاوے میں افزونی اور آسانی ہوتی گئی اور کبھی کبھی تو پیٹ سے اوپر آجاتا اور بچ رہتا۔ پھر تو گاؤں گاؤں باڑھے والوں نے اپنی اپنی باری اور اپنا اپنا دن مقرر کر لیا، تھن کے نیچے خالص دودھ اپنی باری پر چڑھاوے میں جاتا، گنیش مہاراج چاروں سمت دھاوا مارتے، کبھی پورب میں کبھی پچھم میں، کبھی شمال کی پہاڑیوں میں دودھ ان کے پیچھے پھرتا اور وہ دور سے سونگھ کر دودھ کی جانب بڑھتے، کبھی پگڈنڈیوں پر کبھی بڑی سڑک کے کنارے اور کبھی فار لیٹ کی سروس روڈ پر اپنا بریک فاسٹ لنچ ڈنر لگا ہوا پاتے اور کھا پی کر آرام کرتے۔

ایک روز شام کے وقت آرام کے ساتھ ایک دیہاتی پگڈنڈی پر لگے ہوئے تھے۔ دو عورتیں آگے پیچھے کھائی میں سے سر پر دودھ کی مٹکیاں لیے حسب معمول شہر کو جاتی ہوئی اوپر کو بڑھیں، نہ عورتوں کو ہی گمان تھا کہ اس وقت یہاں پر مہاراج درشن دیں گے اور نہ مہاراج ہی کو چڑھاوے کی کوئی اُمید تھی، مگر جب یکدم سامنے آگئیں تو مہاراج نے ویسے ہی بیٹھے بیٹھے سونڈ بڑھا کر مٹکی پکڑنا چاہی، یا تو عورت کی اونچائی کا اور اپنی سطح کا صحیح اندازہ نہ ہوا یا نہ معلوم کیا بات ہوئی، مٹکی کا موڑھا پھنسنے کے بجائے عورت کی گردن سونڈ میں پھنسی اور جب مہاراج نے مٹکی اُٹھائی تو عورت مع مٹکی کے اوپر اُٹھی چلی آئی، بس بمشکل بے چاری کے منہ سے پھنسی پھنسی بھنچی بھنچی آواز میں ''مہاراج گنیش'' نکلا اور جب تک ہاتھی کی سونڈ کی سبک گرفت

ڈھیلی ہوئی، آنکھیں اُبل آئیں اور زبان باہر نکل گئی اور جب گنیش مہاراج نے اسے زمین پر رکھا تو جان نکل چکی تھی، دوسری اپنی مٹکی پھینک کر بھاگ گئی۔ گنیش مہاراج عورت کے یوں بے حس و حرکت پڑا رہنے پر ذرا متعجب تو ہوئے، پھر اطمینان کے ساتھ دودھ پی پلا کر چلتے ہوئے۔

دوسرے ہی روز دور دور تک خبر پھیل گئی کہ گنیش مہاراج نے بھینٹ لے لی اور خیر چڑھاوا تو اور بات تھی، مگر بھینٹ کے خوف سے دیہاتیوں کے پتے پانی ہونے لگے۔ نت نئی افواہوں نے عام ہراس پھیلا دی، خوف کے ساتھ ساتھ چڑھاوے کی مقدار تو بڑھ گئی، مگر احتیاط بہت بڑھ گئی، دور سے رکھ کر چلے آتے۔ شہر سے مضافات اور دیہات میں اور دیہات سے شہر اور مضافات میں پہنچا کرتیں اور اب تو شہر سے شہر ایک محلّہ سے دوسرے محلّہ میں پہنچتیں۔ رات گنیش مہاراج نے بھرے بازار میں درشن دیئے۔ دودھ کی دکانوں کے ٹھٹھر اکھیڑ پھینکے، حلوائیوں کی بھینٹ لی اور کڑھائیوں کی کڑھائیاں اُبلتے دودھ کی سونت کر زمین میں دھنس گئے.....اور خیر شہر میں ہراس تو نہ پھیلنے پایا، مگر دودھ کا قحط ہو گیا کیوں کہ ڈر کے مارے سوگوالوں میں سے بمشکل پچیس دودھ لے کر شہر آنے کی ہمت کرتے، وہ بھی سر ہتھیلی پر رکھ کر اور شہر میں یہ افواہیں پھیلتیں کہ دودھ کہاں سے آئے، وہ تو سارے کا سارا گنیش مہاراج کے چڑھاوے میں چلا جاتا ہے، ساتھ ساتھ روزانہ ایک سوایک بھینٹ کی خبر بھی گشت کر جاتی۔

بہر حال بھینٹ والی بات تو صحیح تھی، ایک سوایک نہ سہی تو ایک بھینٹ تو لی ہی تھی۔ حکام ضلع شہر کے اندر دودھ کی کمی پر ہی پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ عورت کے مارے جانے سے باقاعدہ قانونی مشکل پیدا ہو گئی۔

محکمہ جنگلات والوں نے خونی ہاتھی کا اپنا علیحدہ فائل چلایا اور سرکاری عہدہ داروں کو تو ہر چیز کا سدباب کرنا تھا، خونی ہاتھی کا استیصال قدم قدم پر بدل جانے والی افواہوں اور ہراس کا خاتمہ، اور پھر شہر سے دودھ کی کمی کا دور کرنا.....محکمہ جنگلات اور عالی عہدہ داروں نے میٹنگ کی۔ بات عقائد کی حد تک اس وقت تک نبھتی ہے جب تک قانون کی زد میں نہ آ جائے۔ جنگلات کے قواعد کی رو سے ہاتھی کا شکار مدتوں سے ممنوع تھا، مگر جب ہاتھی خونی ہو جائے تو پھر وہ ہاتھی کب رہتا ہے اگرچہ جنگلات کے ماہر حیوانات اس مخصوص ہاتھی کی جبلت کو عام ہاتھیوں سے بالکل علیحدہ اور منفرد بتاتے تھے، بھلا کسی کتاب یا تجربہ میں یہ آیا تھا کہ ہاتھی دودھ پر باٹ مارے! خیر آدمی کے مار دینے کی تو ایک دو مثالیں پائی بھی جاتی تھیں اگرچہ یہ بھی ہاتھی کی جبلت کے منافی تھا، بہر حال عالی عہدہ داروں کو تو اپنا نظم و نسق برقرار رکھنا ہی تھا، دونوں نے مل کر ہاتھی کو مار دینے کا فتویٰ دے دیا۔ اور یہ ڈیوٹی محکمہ جنگلات والوں کی تھی کہ خطرناک جانوروں کا استیصال کریں، اگرچہ مقتول عورت کے ورثاء خون کا دعویٰ نہ کرنا چاہتے تھے۔

جب محکمہ جنگلات والوں نے معذوری ظاہر کی اور بتایا کہ گنیش مہاراج کے مقابلے میں انہیں دیہاتیوں حتیٰ کہ خانہ بدوشوں سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکتی تو پھر عالی عہدہ داروں نے ادھر توجہ کی۔ پہلے تو خود آپس میں نظر دوڑائی تو کمشنری بھر میں کوئی حاکم ایسا نظر نہ آیا جو ڈھنگ کے ساتھ ایک گولی ہاتھی تو ہاتھی جنگلی بکرے پر بھی چلا دے۔ پھر چھاؤنی کی جانب رُخ کیا، بڑے بڑے بال باندھی گولی مارنے والے کرنل، جنرل، میجر اور کپتان موجود تھے اور یہ نہیں کہ نرے چاند ماری ہی مارنے والے ہوں تھوڑا بہت شکار بھی کھیل لیا کرتے تھے، مگر ہاتھی اور وہ بھی خونی!.....اور اب تو خیر مفقود تھا۔ اگلے زمانے میں بھی چار چھ ضلعوں میں ایک آدھ ہوا کرتا تھا۔ یا وقت پر پرانے انگریز فوجیوں میں کوئی افریقہ برما کے جنگلوں کا کھیلا شوقین شکاری نکل آتا تھا۔ شہر تو شہر کمشنری بھر میں کوئی نہ نکلا اور چھاؤنی سے بھی جواب آ گیا اور قانونی ایکشن تو کوئی بھی صبر کر کے بیٹھ جانے کے لیے

نہیں لیا جاتا اور پھر یہ تو مسلسل خطرہ تھا، اور مستقل نقصان اور پیہم ہراس، لہٰذا حاکم ضلع کے سامنے پوری گتھی بن گیا، بہت نگاہیں ڈالیں، پولیس کے عہدے داروں سے مشورہ کیا اور ایک صورت نکل ہی آئی، شہر میں ایک کنبہ ایک معزول شدہ شاہی خاندان کے دس بارہ افراد کا ابھی بستا تھا، مگر بوڑھا تو بوڑھا اس خاندان کے جوان تک گوشہ نشین ہو چکے تھے اور ان میں سے ہر ایک قادر اور بڑا دلیر شکاری تھا، بڑے بڑے فوجی انگریزوں پر ان کی نشانہ بازی اور بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، لیکن اب تو برسوں سے ان کی بندوق کی گریس بھی نہ چھوٹی تھی اور شاید مہینے گزر جاتے اپنی کوٹھی کے کمپاؤنڈ سے باہر کی نوبت نہ آتی اور خاندانی پنشن پر جو حکومت کی معرفت پہنچا کرتی، گزر تھی۔

جب اپنے ساتوں آٹھوں ضلعوں میں کوئی آدمی نظر نہ آیا، محکمہ جنگلات والوں نے بھی جواب دے دیا۔ دیہاتی اور خانہ بدوش تک پہلو تہی کر گئے اور چھاؤنی سے بھی صدائے برنخاست سن لی تو حاکم ضلع نے مجبور ہو کر بوڑھے خان سے تحریک کی کہ اس موذی کے ظلم سے مخلوقِ خدا کو نجات دلائے۔

موذی کے ظلم سے مخلوقِ خدا کو نجات دلانے سے زیادہ بوڑھے خان کے اندر پرانا دبا ہوا شکاری والا جذبہ بھڑک اُٹھا۔ ویسے مدتوں سے بندوق نہ پکڑی تھی اور ہاتھی کے لیے بڑی اچھی پریکٹس کر کے جانے کی ضرورت تھی، مگر وقت بہت کم تھا۔ جلدی جلدی پروگرام بنایا، ساتھی تو کوئی باقی نہ تھا، بوڑھے خان کے بیٹے، پوتے، بھائی اور بھتیجے ایک سے ایک بڑھ کر قادر انداز تھے۔ سب ملا کر درجن بھر شکاریوں کی پارٹی بن ہی گئی۔ سب نے اپنی اپنی رائفلوں کی گریس صاف کرائی، نئے کارتوس حاصل کیے اور پرانے شکاری کپڑے نکالے۔ جنگل میں کچھ زیادہ اندر جانے کا تو پروگرام نہ تھا پھر بھی رہنمائی کے لیے آدمی تلاش کیے اور باوجود حاکم ضلع کی مدد کے دیہات سے ایک متنفس اس کے لیے تیار نہ ہوا، مجبور ہو کر کچھ کوتوالی کے کانسٹیبل اور دس پانچ مضافاتی تھانوں کے چوکیدار اور محکمہ جنگلات کے کچھ پٹرول اور دو ایک رینجر جمع کیے جن کے ذریعہ ہاتھی کی نقل و حرکت اور جبلت کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ گنیش مہاراج جنگل میں اندر زیادہ دور نہ جاتے، یہی شہر سے دس پانچ میل اِدھر اُدھر کہیں لگے رہتے، کبھی کبھی ذرا بڑھ کر دوپہر میں کسی پھیلے ہوئے چشمہ کے کنارے گھنے درختوں کی چھاؤں میں کیچڑ کائی میں جا پڑے اور کہیں گہرا پانی مل جاتا تو کسی جھیل میں دو چار غوطے لگا لیتے اور سونڈ بھر بھر پیٹ پر پھواریں چھوڑ لیتے اور نہا دھو کر اپنے وقت پر خوشبو لے کر دس پانچ میل کے اندر کہیں نہ کہیں اپنا چڑھاوا پا لیتے اور اب تو معتقدین بھانپتے رہتے اور راستہ پر مٹکیاں چن آتے۔

تاہم ہاتھی کا شکار ہے، کوئی ہرن چیتل، پاڑھے، نیلے کا کھیل نہیں ہے بھاری مگیم اور ایکسپریس کارروائٹ رائفلوں کے علاوہ ہاتھی کے شکار کے اور بہت سے لوازمات اور آداب ہیں۔ جس صبح کو جانے کا پروگرام تھا اس سے پیشتر رات میں خان اور اس کے ساتھی بیٹوں، پوتوں، بھائی، بھتیجوں میں مفصل مشورہ ہوا ہر ایک نے تجویزیں پیش کیں مگر اس ہاتھی کے شکار میں نہ ان تمام لوازمات کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور نہ وقت اور موقع تھا۔ نقل و حرکت اور ہانٹ دو دن سے معلوم ہی ہو رہی تھی اور جنگل دور اور نزدیک سب گھوما ہوا اور اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ خان اور اس کے چھوٹے بھائی کئی مرتبہ ہاتھیوں کا شکار کر چکے تھے۔ اپنے ہتھیاروں کی ضرب اور گولی لگانے کے پوائنٹ اچھی طرح جانتے تھے اور صرف گولی ہی لگانا تھی پھر سب سے بڑی آسانی یہ تھی کہ کوئی غول نہ تھا، ہاتھی اکیلا ہی تو تھا۔ بس ایک اکیلی دیوار پر ٹھکانے سے دو گولیاں جڑنی تھیں اپنی عمر میں ایسی دس پانچ دیواریں خان ڈھائے ہوتے تھا مگر کسی اعتبار سے انیس نہ ہوا تھا اپنے سب جوانوں سے زیادہ کڑیل بنا ہوا تھا اور پچھتر کی عمر میں پچیس سالہ

جذبہ رکھتا تھا مستقل مزاجی سے جو اس عمر کا تقاضا تھی مالا مال تھا اور بہادری کے ساتھ شکار کے داؤ پیچ ساری عمر کے عملی تجربے نے خان کی ضرب کو موت کا طمانچہ بنا دیا تھا، ویسے یہ بات نہیں ہے کہ سبھی مار لیے ہوں اب بھی دس پانچ پرانے ہاتھی جنگل میں ایسے زندہ ہوں گے جن کے کولہوں اور کوکھوں میں خان کی گولیاں پندرہ پندرہ بیس بیس برس پرانی گوتھیں بنی دھری ہوں گی۔

علی الصبح کچھ دور جانا بھی نہ پڑا یہی دس میل سوال کی ترائی میں اور خان نے تیقن کے ساتھ گنیش مہاراج کی نشست معلوم کر لی، اب پھر پارٹی میں مشورہ ہوا اور ایک لڑکے نے تجویز پیش کی کہ باقاعدہ شکار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، پہلے خان ایک دو گولی مار کر دور سے ہاتھی کی ایک یا دو ٹانگیں توڑ دیں پھر جب وہ مجبور جہاں کا تہاں پڑ جائے تو سب بڑھ کر قریب سے گولی مار دیں، قصہ ختم ہو۔

''مگر یہ تو بہت ہی ان اسپورٹنگ اور ہاتھی کے شکار کا سخت مذموم طریقہ ہے۔'' من چلے بوڑھے خان نے کہا۔

''لیکن دیکھئے، ہمیں تو استیصال کرنا ہے۔'' نوجوان بیٹا بولا۔

''تم کچے شکاری ہو، اور مجھ کو تو شکار کا جذبہ لیے جا رہا ہے۔ یہ شکاری کا کام نہیں، قصائی کا کام ہے جو تم بتا رہے ہو۔'' اور خان کے چھوٹے بھائی نے لقمہ دیا۔ ''یہ چیز شکار جیسے ارفع جذبے کے سخت منافی ہے۔''

''نہیں میرا مطلب یہ تھا کہ مخلوقِ خدا کو اس کی ایذا رسانی سے نجات ہو جائے اور قصہ ختم ہو۔''

''کیا کہنے میاں! سمجھنے کی بات ہے کہ انہوں نے اسپورٹس مین سمجھ کر ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا تو پھر ہمیں اسپورٹ کے تمام و کمال آداب برتنا چاہئیں۔ اور پھر میں یہ کیوں کروں ویسے میرے لیے کون سی مشکل ہے بس تم لوگ اپنی اپنی جگہ پر میری ہدایت کے مطابق لگے رہنا۔ ویسے موقع محل تم سب خود سمجھتے بھی ہو، لیکن جب تک میں اشارہ نہ دوں میرے شکار پر کوئی صاحب فائر نہ کریں خواہ میرے لیے خطرہ ہی کیوں نہ ہو اور پہلے تو اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔''

''ہوں ہمارا مطلب یہ ہے کہ بات بھی بن جائے اور خطرہ.....'' بھتیجا بولا۔

اور خان نے بات کاٹ کر کہا۔ ''میری زندگی کا شاید یہ آخری شکار ہو اور میں ایسا ریکارڈ کیوں چھوڑ دوں جو ساری عمر کے کرے دھرے پر پانی پھر جائے۔'' اور اپنے بوڑھے ملازم شہباز کی جانب داد طلب نظروں سے دیکھا جو چالیس سال خان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے بندوقوں کا پیر لیے ہاتھیوں، شیروں اور بھینسوں کے شکار میں سایہ کی طرح ساتھ لگا رہا تھا اور جس پر خان کے ساتھ بارہا موت جھپٹی تھی اور الٹ کر اوندھے منہ جا پڑی تھی اور بوڑھے شہباز نے آنکھ اور گردن کے اشارے سے بہادر آقا کی تائید کی، اگرچہ خود کبھی گولی نہ لگائی تھی اور بندوقیں ہی اٹھائی تھیں۔

دوپہر تک خان گنیش مہاراج کی آرام گاہ کے گرد محاصرہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گھنے درختوں کی چھاؤں میں کیچڑ پر لوٹیں لگاتے گنیش مہاراج تو میل بھر سے خطرہ کی بو سونگھ رہے تھے، اور اس بو کو تو ہاتھی خوب پہچانتا تھا۔ کتنے ہی بہادر ساتھی اس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اور خود گنیش مہاراج کے پھٹوں کولہوں اور کوکھوں میں دو چار آدھ آدھ پاؤں کی سوکھی گوتھیں گولیاں دبائے آج تک موجود تھیں، اور کچھ تفاصیل تو یاد نہیں تھیں بس خطرہ کا احساس جبلت پر طاری ہو گیا۔ ایک آدھ دھماکا تڑاخا دھکا پھر کٹ توڑ جلن اور پھر مہینوں پیپ خون اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور تکلیف اور پانچ

سوگز سے دوربینوں کی مدد سے بھانپ کر قرارداد کے مطابق خان کی پارٹی تین سمت میں بٹ گئی تھی چوتھی سمت اونچی پہاڑی ڈھلان تھا جس کی تلی پر یہ جوہڑ تھا جس میں گنیش مہاراج پڑے لوٹیں لگا رہے تھے اور شاور باتھ لے رہے تھے۔ اوپر جانے کا امکان نہ تھا۔ پارٹی تمام اپنے پرانے تجربہ کار ملازم کو ساتھ لیے بوڑھے گنیش مہاراج خان کے روبرو عین اس پامال شدہ راستہ پر چل رہی تھی جو گنیش مہاراج کے دوپہر کو نہانے کے لیے جانے کا اور سہ پہر کو اُٹھ کر آنے کا تھا، اور ہاتھی تو اپنے راستے کا بڑا پابند ہوتا ہے۔

گنیش مہاراج نے کیچڑ پانی کا ٹھنڈا مشغلہ چھوڑ کر لمبی سونڈ فضا میں چاروں طرف گھمائی۔ دائیں بائیں اور سامنے تمام فضا بارود کی بو سے رچی ہوئی تھی اور لمحہ بہ لمحہ تیز تر ہوتی جا رہی تھی، پہلے تو کھڑے ہو کر جلدی جلدی کان ہلائے اور ساتھ ساتھ ننھی ننھی آنکھیں حلقوں میں گھومیں، سامنے راستہ دیکھنے کی بہت کوشش کی، مگر کچھ نہ دکھائی دیا اور نہ سنائی دیا، ایک ٹیٹری بار بار دائیں سے بائیں اور آگے سے پیچھے بڑے زور سے چلاتی اوپر سے اُڑتی رہی اور یہ بھی آدمی کی موجودگی کا سگنل ہوا کرتا ہے، بو تیز اور واضح تر ہوگئی اور ٹیٹری جلدی پلٹ کر آنے لگی۔ بوڑھے گنیش مہاراج نے بھرپور خطرہ محسوس کیا اور قریب ہی اور پھر آگے پیچھے دائیں بائیں سونڈ گھما کر سونگھا اور پیچھے ڈھلان پر سے آتی ہوئی ہوا صاف سنگھائی دی اور اوپر کو بڑھنا اور پھر لپکنا شروع کیا جب خان جوہڑ سے تین سوگز کے فاصلے پر نمودار ہوا تو ہاتھی کو پہاڑی کے ڈھلان پر ایک جھلک لپکتے دیکھا۔

ایسے ڈھلانوں پر چڑھنا ہاتھی کی جبلت کے منافی ہے۔ خان سمجھ گیا کہ تینوں طرف سے خطرہ محسوس کر کے یہ رُخ اختیار کیا ہے اور ہماری پارٹی کی سیدھ بچا کر اور اوپر پہنچ کر دائیں بائیں کسی جانب کو مڑے گا، غرض جو منہ کا نوالہ سمجھ کر چلے تھے وہ بات نہیں ہے، اور جتنا ذکی الحس دودھ کی خوشبو لینے کے معاملہ میں واقع ہوا ہے، اس سے زیادہ دشمن کے پسینے اور رائفل کی بو لینے میں ہے۔

بھینٹ لینے کے بعد بھی گنیش مہاراج کو اندازہ نہ ہوا تھا کہ ان سے کتنی بڑی قانونی خطا سرزد ہوگئی ہے۔ اس لیے کہ بھینٹ کے بعد چڑھاوے زیادہ بھی ہوگئے تھے اور آسان بھی، وہ لوٹ کھسوٹ اور اچکے پن والی بات تو بالکل ہی جاتی رہی تھی، اب تو جدھر نکل جاتے زندگی دودھ ہی دودھ معلوم پڑتی، اس دوران میں کچھ نہ کچھ آدمیوں سے وحشت بھی کم ہوگئی تھی۔ وہ دوسری بات تھی کہ سہوا ایک کا گلا گھٹ گیا تھا، اور آج یہ بارود کی بو بڑے دنوں بعد ناک میں پہنچی تھی اور اس کے ساتھ بڑی مہیب یادیں اور تکلیف دہ واقعات وابستہ تھے۔

خان کی پارٹی جمع ہوگئی اور دوربینوں کی مدد سے مفرور شکار کے رُخ کا تعین کرنے کی کوشش کرنے لگی، مگر جھاڑیوں اور گھنے درختوں میں صحیح پتہ نہ چل سکا، مجبور ہو کر کچھ دور اوپر کی سمت کھوجوں پر چلے مگر اوپر پتھریلی زمین میں نشانات قدم تو نہ مل سکے۔ تاہم جھاڑیوں اور سبزے میں گذرتے ہوئے اس کا راستہ صاف معلوم ہوتا تھا۔ چلتے چلتے دوپہر سے سہ پہر اور پھر شام ہونے لگی۔ سورج مغرب کی چمکتی ہوئی پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا اور سائے لمبے لمبے ہو کر پڑنے لگے، جنگل میں شام کے وقت مخصوص آوازیں گونجنے لگیں۔ گھاٹیوں اور میدانوں میں تمام دن چگ کر ڈھلانوں پر پتھروں اور چٹانوں پر بسیرے لینے چکوریں اور مرغابیاں کڑکڑا، کڑکڑا کر جمع ہونے لگیں اور تھوڑے تھوڑے اڑان کے ساتھ تیز تیز لپکنے لگیں۔ بارہ سنگھے، چیتل، پاڑے اور جھانکم جنگل کے اندرونی حصوں سے نکل نکل کر کاشت شدہ علاقوں سے ملحق جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈوں میں آ گئے۔ بلند پرواز اور تیز پر طوطے تنگ کے تنگ بنا کر بسیرے کے لیے گھنے حصوں کی جانب اُڑنے لگے۔ شوالک رینج کے مشرقی ڈھلانوں کی

جانب بڑی سیاہی ہمالیہ کے سلسلے کی مشرقی پہاڑیوں سے پرے پھیلتے ہوئے مہیب دھندلکے سے غٹ پٹ ہوگئی اور خان کی پارٹی تیزی کے ساتھ ہاتھی کے کھوجوں پر چلتی رہی۔

ہاتھی تو جیسا خان کا خیال تھا کچھ دور ڈھال پر چڑھ کر اور خان کے داہنے ہاتھ والے ساتھیوں کے سروں پر سے تقریباً آدھ میل کے فاصلے سے گذرتا اوپر ہی اوپر مڑ گیا تھا۔ اب خان کی پارٹی نے رفتار تیز کر دی، سورج غروب ہو رہا تھا اور ہزاروں مربع میل میں پھیلی ہوئی ہمالیہ اور شوالک رینج کی وسیع وادی گم ہو جانا چاہتی تھی مغرب کے قریب کھوج ملنا شروع ہوئے جس سے ہاتھی کی رفتار مدھم ہونے کا سراغ ملتا تھا۔ تجربہ کار خان سمجھ گیا کہ بس اب زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ تھوڑی دور چل کر خان اور پوری پارٹی کی دوربینوں نے بھانپ لیا۔ تین طرف گھنا جنگل اور ایک جانب ڈھلوان پر ایک چھوٹا سا گاؤں اور نیچے درمیان میں ایک زرخیز کاشتہ میدان اور اس میدان کے بیچوں بیچ کھڑے گنیش مہاراج جھوم رہے ہیں۔ شام ہوتے دیکھ کر خان نے اپنی پارٹی کو جلدی جلدی تقسیم کیا، فرق صرف اتنا تھا کہ اب ایک جانب یعنی اسی ڈھلوان کی سمت گاؤں تھا جس سمت سے پہلے فرار ہوا تھا۔

پارٹی کو لگتے دیکھ کر اور گنیش مہاراج کو مارنے کے انتظامات دیکھ کر گاؤں والوں میں بے چینی پھیلی۔ پہلے سب کے سب گاؤں سے باہر جمع ہو گئے اور پھر ڈھلوان سے اتر کر میدان کی جانب بڑھنے لگے۔ بوڑھوں اور عورتوں نے نوجوانوں کو روکا کہ بارہ نہیں، بارہ ہزار بندوقیں آجائیں بھلا گنیش مہاراج کو مار سکتے ہیں۔ ''اور گنیش مہاراج تو گولی اُلٹی پھیر دیں''۔ کوئی بولا گنیش مہاراج کے بدن پر گولی گڑے گی ہی نہیں''۔

اب ہانکا بڑا مکمل ہو گیا، ساتھ ہی ساتھ کچھ ناقص بھی۔ میدان کے دو سمت سے خان، خان کی پارٹی بڑھی، اوپر سے گاؤں والوں کی چپقلش اور پھر شور ہوا اور مضر یہی رہا کہ گنیش مہاراج سامنے کو بڑھیں۔ اور سامنے سے خان اور خان کا پرانا تجربہ کار بندوق بردار ملازم شہباز آگے پیچھے بڑھ رہے تھے۔ جگہ جگہ میدان میں کھڑی ہوئی جھاڑیوں کی آڑ لیتے خان اور شہباز آگے پیچھے دونوں بڑھتے رہے۔

گنیش مہاراج کے معتقدین پیچھے تھے اور دشمن دائیں بائیں اور سامنے چار چار چھ چھ قدم لپک کر گنیش مہاراج قلعہ کے برج کی طرح ٹھہرتے، توقف کر کے فضا میں لمبی سونڈ لہرا لہرا کر سونگھتے اور اب تو ہر جانب دشمن ہی کی بو رچی معلوم ہوتی، پیچھے کے شور سے زیادہ خائف تھے، دائیں بائیں بو زیادہ گہری اور تیز تھی اور آدمی دکھائی دے جاتے اور سیدھا ہی بڑھنے میں عافیت سمجھ میں آئی اور خان ہاتھی کی جانب کو اور ہاتھی خان کی جانب کو بڑھ رہا تھا اور بہت جلد ڈھائی سو گز سے سامنا ہو گیا۔ قاعدے کے مطابق گولی چلانے میں گاؤں کی سیدھ بچانا چاہیے تھی۔ مبادا گولی ہٹ کر دیہاتیوں میں گرے، مگر خان کو اپنے ہاتھ پر بھروسہ تھا اور خالی جانے کا کوئی امکان نہ تھا پھر بھی اس سمت کو فائر کرنا قاعدے کے خلاف تھا۔

پچاس گز کا فاصلہ ادھر سے گنیش مہاراج نے ادھر سے خان نے آناً فاناً میں طے کر لیا۔ خان سائڈ لے کر کان کے گھگھوئے میں گولی مارنا چاہتا تھا اور ہاتھی ٹینک کی طرح سیدھا بڑھ رہا تھا۔ خان پینترے سے کاٹ کاٹ کر جھاڑیوں کی آڑ لے کر سائڈ لینا چاہتا تھا اور خان کے دس بیس گز اِدھر اُدھر ہوتے ہی ہاتھی اک ذرا ٹھٹک کر پھر سیدھا ہو جاتا تھا اور یہاں تک کہ جب معاملہ دو سو گز کے اندر آ لگا تو خان کو شست لے کر ایک گولی آنکھ پر چپکانی ہی پڑی، مگر کچھ تو ہاتھی جھوم رہا تھا، کچھ خان کی پریکٹس چھوٹی ہوئی تھی اور ہاتھ میں بھی وہ بات نہ رہی تھی کہ بال باندھی گولی مارے، بجائے آنکھ کے گولی بالشت بھر اوپر مستک پر پڑی، بھنا کر ایک پھرکی سی لی، بڑے زور سے کان جھٹکے، سونڈ لہرا کر پھر سیدھا ہو گیا اور رفتار کالی آندھی سی! گرج

کر بڑے زور سے دانت سیدھے کیے بڑھا اور چارج کیا اور رُخ بدلنے کی ایک اور کوشش میں خان نے تیزی سے پینترا سا بدلا اور کچھ جھاڑیوں کی آڑ پکڑ لی۔ اتنی دیر میں ہاتھی نے لپک کر پچاس گز اور لپیٹ لیے اور سو گز کے اندر موت سے آمنا سامنا ہوا، خان کو سائڈ نہ ملی، پھر آنکھ کی شست لے کر گولی کو دماغ تک پہنچانے کا راستہ تلاش کیا اور اب کی مرتبہ گولی ذرا ہٹ کر ایک جانب پڑی اور دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ پیشانی کی چٹان سی ہڈیوں میں چیپ ہو کر رہ گئی مگر گنیش مہاراج کی آنکھوں کے سامنے تیتیاں سی ناچ گئیں اور خود بھی ایک مرتبہ کو ناچ گئے مگر عاجز ہونے کے بجائے بارود کا بھڑکا ہوا پہاڑ بن گئے۔

سب کچھ اُلٹ پھینکنے اور ڈھا دینے کی تندی سے چنگھاڑ کر لپکے اور اب تو دشمن دو ڈگ میں دانت پر تھا، دوسری نال خالی کر کے خان نے شہباز کے ہاتھ سے دوسری رائفل لی اور خالی رائفل اس کو دی، اتنی دیر میں ہاتھی پچاس گز کے اندر بڑھ رہا تھا، پارٹی سمٹ کے اور بھی قریب آ گئی تھی اور پارٹی میں سے بعض محتاط شکاریوں نے آواز دی۔ ''پاؤں پر! پاؤں پر! یہ تو خان کو خود بھی سوجھ رہی تھی اور پاؤں کے چاروں ستون سے شروع سے آخر تک سامنے تھے اور اس سے بہت پیشتر پہلی گولی لگانے سے بھی پہلے خان ہاتھی کو بے کار کر سکتا تھا پہلی ہی جھلک پر ڈھیر ہو جاتا۔ پچاس گز کے اندر بھی خان سائڈ نہ لے سکا اور جب پچاس گز پر معاملہ آ گیا تو خان نے اتنے قریب سے اپنی خارا شگاف گولی کی ضرب کی شدت پر اُمید کر کے پھر فائر کیا۔ گولی پھر کھوپڑی کی چٹان پر رائیگاں ہی گئی۔ اب خان کی رائفل میں ایک کارتوس باقی تھا، پلٹ کر دیکھا تو شہباز اچھلا، کودا اور پینتروں سے دس گز دور ایک جانب علیحدہ ہو گیا تھا اور پھر رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ ہاتھی دس گز کے اندر خان پر سونڈ بڑھا بڑھا کر لپٹنے کے لیے لپکتا تھا اور شہباز خان تک پہنچنے کے لیے پینترے کاٹ رہا تھا۔

ادھر پوری پارٹی نے بڑے زور سے چلا کر کہا ''پاؤں توڑیئے! پاؤں توڑیئے!''

مگر خان نہایت اطمینان کے ساتھ پیچ و خم دے کر اور پینترے کاٹ کاٹ کر سونڈ کی نوک سے خود کو بچا رہا تھا اور قلعہ کا قلعہ خان پر دم اُٹھا اُٹھا کر اخیر جھپٹ کر رہا تھا اور چنگھاڑ چنگھاڑ کر سونڈ سے خون کا دھواں سا اُڑا رہا تھا، خان کو خطرہ میں سمجھ کر شہباز نے ایک دفعہ ہاتھی کو بڑے زور سے للکارا۔ گویا صریحاً اس کی بلا اپنے سر لے کر اسے موقع فراہم کرنے کی کوشش کی۔ ہاتھی اک ذرا ادھر متوجہ ہوا اور گھوم کر اس پر لپکا۔

سائڈ ملتے ہی خان نے کان کے گھگھوئے میں اخیر گولی لگائی اور گرتے گرتے شہباز ہاتھی کے چنگل میں تھا۔ گردن سے پکڑ سر سے اونچا ہوا میں گھمایا اور زمین پر دھم سے پٹخ دیا۔ اگلا پاؤں بڑھا کر پنڈلی دبائی اور دوسری پنڈلی سونڈ میں پکڑ کر جھر سے چیر دیا، پھر ایک چیتھڑا سونڈ میں دبا ہوا تھا۔ خالی رائفل ہاتھ میں لیے نہتے خان کی جانب رجوع ہوا اور یکدم دائیں بائیں سے چوبیس گولیوں کی باڑھ نے تڑتڑاتڑ سر سے پاؤں تک چھلنی کر دیا اور اڑا اڑا دھڑام قلعہ زمین پر آ رہا اور جب دونوں جانب سے دھوئیں اور گرد کو چیر کر پہنچے تو سونڈ کی لپیٹ میں بوڑھا خان دبا ہوا تھا۔ کولہو کے بیلوں میں لپٹا ہوا گنے کا پاتا سا۔

ہاتھی کا انتقام

جہاز کے بالائی عرشہ پر ایک آرام کرسی پڑی رہتی تھی اور ایک عمر رسیدہ اور دراز قامت انگریز روزانہ صبح 9 بجے اس پر آ کر لیٹ جاتا اور دوپہر کے کھانے تک ساکت وصامت آنکھیں بند کیے پڑا رہتا۔ کسی مسافر کو علم نہ تھا کہ وہ کون ہے، نہ کوئی اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا، نہ وہ خود کسی سے مخاطب ہوتا تھا۔ لیکن کپتان سے لے کر جہاز کے خلاصی تک اس کی انتہائی تعظیم کرتے اور اس فکر میں رہتے تھے کہ اس کی خدمت کا کوئی ادنیٰ سا موقع مل جائے۔

انسان فطرتاً راز جو ہے، میرے دل میں بھی گدگدی ہونے لگی کہ اس کا نام اور مقام معلوم کیا جائے، چنانچہ ایک دیرینہ ملازم سے اس کا تذکرہ چھیڑا ہی تھا کہ اس نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے میں کوئی مخبوط الحواس ہوں اور مجھے خود اپنے حال احوال کی خبر نہیں۔ کہنے لگا..... ''آپ کس دنیا کے باشندے ہیں کہ ہاتھیوں کے شہرہ آفاق شکاری کاریو سے ناواقف ہیں۔ ان کی عمر سو سے تجاوز کر چکی ہے لیکن یہ ابھی افریقہ سے دنیا کے خطرناک ترین ہاتھی کو ہلاک کر کے وطن واپس جا رہے ہیں۔

کاریو..... کاریو یہ نام میرے ذہن میں چٹکیاں لینے لگا۔ کان اس سے آشنا تھے۔ تحت الشعور میں اس کے متعلق کچھ عجیب سی داستان بھی موجود تھی، لیکن یادداشت کام نہیں کر رہی تھی۔ اس سوچ میں کھڑا تھا کہ بوڑھے نے آنکھیں کھولیں اور مجھے بالکل نزدیک دیکھ کر بول اُٹھا..... ''تمہاری کیا خواہش ہے؟'' اور نہ معلوم کیوں بلا ارادہ میرے منہ سے نکل گیا..... ''آپ سے انٹرویو لینا چاہتا ہوں'' حالانکہ اب جو میں غور کرتا ہوں تو اس ماحول میں یہ جملہ بالکل ہی مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔ میں کوئی اخبار نویس ہوں نہ کسی رسالہ کا ایڈیٹر، نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ انٹرویو کس طرح لیا جاتا ہے اور ایک شکاری سے کس قسم کے سوال کرنے چاہئیں۔ لیکن تیر بلا نشانہ لیے ہی کمان سے نکل چکا تھا۔ اب یہ اتفاق ہی ہے کہ ایک شاعر کی طرح جو اپنے اشعار سنانے کے لیے ہمیشہ مضطرب اور بے چین رہتا ہے۔ کاریو کو بھی اپنے کارناموں کی داستان بیان کرنے میں غیر معمولی لذت حاصل ہوتی تھی۔ میرا جواب سن کر اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں لیکن اس کے ہونٹ کھل گئے تھے۔ ان میں کچھ ارتعاش بھی تھا اور شاید زیر لب کچھ کہتا بھی جا رہا تھا۔ دراصل وہ اپنے خیالات کو مجتمع کر رہا تھا اور اس خیال میں تھا کہ کیا جواب دے۔ پندرہ منٹ اسی شش و پنج میں گزر گئے اور میں واپسی کے لیے مڑنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے آنکھیں کھولیں، میری طرف سے غور سے دیکھا اور پوچھا آپ کو ہاتھیوں سے کیا دلچسپی ہے۔ میرے پاس سوائے سچ کہنے کے کوئی جواب نہ تھا کہ میں جانوروں کے متعلق ایک کتاب لکھ رہا ہوں اور اس میں ہاتھیوں کا بھی ایک باب ہے، آپ کی مہیا کردہ اطلاعات سے اس میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر اس کے خشک لبوں پر قدرے مسکراہٹ نمودار ہوئی اور یہ کہا کہ اچھا تو شام کی چائے پر ملاقات ہوگی۔

دماغ کاریو کی شخصیت متعین کرنے کی جستجو میں برابر لگا رہا۔ اس کے متعلق کہاں اور کیا سنا تھا۔ کس کتاب یا رسالے میں اس کی تفصیل لکھی

تھی۔ ذہن ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر نظر آتا تھا۔ انگریزی کی مثل ہے کہ اطمینان سے سو جاؤ۔ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا، چنانچہ میرے ساتھ بھی یہ ہوا۔ خواب کے دوران ماضی کے اوراق اُلٹنے شروع ہو گئے۔ اور تاریخ کے پردوں پر 1920-21 کے وہ نظارے رونما ہونے لگے جب ہندوستان کا سکون آنجہانی گاندھی کی تحریک عدم تعاون سے پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں اخبارات نے برما میں جنگلی ہاتھیوں کی چیرہ دستیوں کے واقعات پر بھی تبصرہ شروع کر دیا۔ ان درندوں نے چاولوں کے کھیت تباہ کرنے اور انسان کشی کی مہم شروع کر رکھی تھی اور لطف یہ ہے کہ اگر کوئی سدھایا ہوا ہاتھی ان کو اس فعل قبیح سے باز رکھنے کی کوشش کرتا تو وہ اس کے بھی دشمن بن جاتے تھے۔ اس وقت بھی کاریو تھا جس کو ان خطرناک موذی جانوروں کی بیخ کنی کے واسطے مامور کیا گیا تھا۔ اور جس طرح گزشتہ جنگ عظیم میں بن غازی یا طبروق کی فتوحات پر خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ اسی طرح برما میں ہر خونی ہاتھی کی ہلاکت پر شادیانے بجائے جاتے اور چراغاں کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اس شکاری نے پوری سرزمین کو ان مہیب عفریتوں سے پاک کر کے ہیرو کا درجہ حاصل کر لیا۔ ان واقعات کو سالہا سال گزر چکے تھے۔ اور یادیں دماغوں میں دفن ہو چکی تھیں اور اس وقت کاریو مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے سکندریاہنی بال کا مردہ قبر سے نکل کر اپنی داستان حساب سنانے آ جائے اور جنگی ہاتھیوں کا ذکر چھیڑ دے۔

مجھے جانوروں سے فطری طور پر دلچسپی بھی ہے اور ان کے متعلق ایک مضبوط کتاب لکھنے کا عزم بھی جس کے لیے دور دراز سفر کر کے مواد بھی جمع کر رہا ہوں۔ اس لیے روئے زمین کے اس عظیم الجثہ حیوان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا جو زریں موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اس پر ایک طرف تو دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا لیکن دوسری طرف فکر بھی سوہان روح بنی ہوئی تھی کہ میری طرف سے کیا سوالات ہوں گے اور اگر وہ کاریو جیسے ماہر فن کی نظروں میں نہ جچے اور محض سطحی ثابت ہوئے تو وہ میرے متعلق کیا رائے قائم کرے گا اور ان کا جواب دینا پسند بھی کرے گا یا نہیں۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ میں نے کاغذ پنسل لے کر چند ایک باتیں نوٹ کیں لیکن پھر خود ہی انہیں مہمل گردان کر قلم زد کر دیا اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس کے پرزے پرزے کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ ادھر مطبخ کے داروغہ نے آ کر اطلاع دی کہ کاریو صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں اور کئی مرتبہ آپ کے متعلق دریافت کر چکے ہیں۔

ہر چہ باداباد کہہ اُٹھا اور اس کے کمرہ میں پہنچ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انٹرویو کے لیے میں نہیں بلکہ وہ تیار ہو رہا تھا، بے شکن استری کیا ہوا سمر سوٹ زیب تن تھا۔ جیب میں ہاتھی دانت کا بنا ہوا ایک پن لگا ہوا تھا جس پر سرخ یاقوت جگ مگ کر رہا تھا۔ نشست بھی بجائے آرام کرسی کے گدے دار صوفہ پر تھی، میز پر علاوہ سادہ چائے کے کچھ مٹھائیاں، کچھ بسکٹ، کچھ دیسی پکوان دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنی داستانِ حیات اور ہاتھیوں سے محاذ آرائی کے افسانے سنانے پر پوری طرح کمر بستہ ہے۔ مجھ سے تو اس نے بس ایک یہ سوال کیا کہ آیا آپ کا تعلق اسی پاکستان سے ہے جس میں چٹاگام کے پہاڑی جنگلات دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں اور جہاں پہلی جنگ عظیم کے بعد کئی مست ہاتھیوں کا شکار کیا تھا۔ ان میں سے تو ایک نے اپنی دانست میں گڑھا کھود کر مجھے زندہ دفن ہی کر دیا لیکن اگلے روز جب وہ میری قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا تو یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا ہوگا کہ قبر اکھڑی پڑی ہے اور مردہ غائب ہے۔ اس پر اس نے خود ہی ایک زوردار قہقہہ لگایا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس پیرانہ سال میں بھی اس کی زندہ دلی کتنی جوان ہے۔

میرے منہ سے نکل گیا کہ میں آپ کی داستانِ حیات سننے کا بے حد متمنی ہوں۔ وہ بھی گویا ادھار کھائے بیٹھا تھا، کہنے لگا۔ پہلی بات تو یہ سمجھ لیجئے کہ ہاتھی کا شکار کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لیے شیر کا دل پہلو میں ہونا لازمی ہے۔ اس پہاڑ جیسے جانور کے سامنے انسان کی ہستی پرکاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ذرا چوکے اور عدم آباد سدھارے میں نے اگر بالکل بچپن ہی میں ان سے گُر نہ سیکھے ہوتے تو اس وقت تک میری ہڈیاں بھی گل سڑ گئیں ہوتیں۔

ہوا یوں کہ میرے والد صاحب کو جب تجارت میں خسارہ ہوا تو لوگوں نے شہ دی کہ افریقہ جا کر ہاتھیوں کا شکار کریں اور ان کے دانت فروخت کر کے لکھ پتی بن جائیں۔ میری عمر اس وقت چودہ سال کی تھی، والدہ انتقال کر چکی تھیں۔ کوئی رشتہ دار ایسا نہ تھا جو مجھے اپنے ہاں رکھ لیتا، اس لیے مجھے بھی ہمراہ لینا پڑا۔ ہم لوگ افریقہ کے ایک گھنے جنگل میں پہنچے اور ایک جھونپڑی میں رہنے لگے۔

ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ والد صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب اس دنیا میں میرا کوئی سہارا نہ رہا۔ نیچے زمین اوپر آسمان مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ اگلے دن ہی ایک دلندیزی تاجر سے ملاقات ہو گئی جو پری ٹوریا سے گوا جایا کرتا تھا۔ میں اس سے منسلک ہو گیا۔ اس کے کچھ ساتھی اور ملازم شکاری بھی تھے۔ میں نے بھی بندوق سنبھال لی اور ہاتھی دانت اکٹھے کرنے شروع کر دیئے۔ آپ لوگوں کو کچھ بھی اندازہ نہیں کہ اس تجارت میں کتنا نفع ہے۔ میں نے چند روز میں اپنی حالت سنبھال لی اور مسٹر کہلانے لگا۔ اس زمانے کے افریقہ کا حال نہ پوچھئے، پناہ بخدا، ہم انگریز اپنے آپ کو خدائی ایجنٹ سے کسی طرح کم نہ سمجھتے تھے، لیکن یہاں آ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس براعظم میں تو شیطان کی حکومت ہے، کالے کلوٹے، موٹے موٹے ہونٹوں والے وحشی حبشی سردار مختلف علاقوں کے مالک تھے اور ان کی مرضی کے بغیر ہاتھی تو درکنار ایک چڑا مارنا بھی جان سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔ میں نے ان آنکھوں سے وہ نقشہ دیکھا ہے کہ یورپ کے سفید فام باشندے ان فرعونوں کے سامنے پیٹ کے بل چلنے پر مجبور تھے جس کے بعد طرح طرح کی خوشامد و تعلق سے انہیں ہاتھی کا شکار کرنے یا سونے کی کان کھودنے کی اجازت ملتی تھی۔ میں اس ذلت سے تو بفضل خدا محفوظ رہا اور حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ مجھے اس ذلت سے کبھی دوچار نہ ہونا پڑا۔ ہوا یوں کہ جس بستی میں ہمارا قیام تھا، اس سے بالکل ملحق ہی وہ جنگلات تھے جو ہر قسم کے جنگلی جانوروں شیر، چیتے، گلدار وغیرہ کے مسکن بنے ہوئے تھے۔ ان کی جب غذا کی تنگی ہوتی تو آبادی کا رُخ کرتے اور ہر طرف تہلکہ مچ جاتا۔ میرا نشانہ اس وقت تک سو فیصدی درست ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے جب دو راتوں میں تین موذیوں کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا تو انہوں نے اس طرف کا رُخ کرنا چھوڑ دیا۔ اس کے صلہ میں مجھے سردار قوم کی طرف سے اعزازی جام اور پھولوں کا تاج عطا ہوا جو آج بھی میرے عجائب خانہ کی زینت ہے۔ کون تھا جو مجھے شکار سے منع کرتا لیکن یہ نہ سمجھئے کہ اس سے میرا کام آسان ہو گیا۔ آپ کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا کہ ان گھنے جنگلات میں اس جیسے تن و توش کے جانور کا پتہ لگانا آسان نہیں ہوتا، حالانکہ ان کا ریوڑ بعض اوقات سو سوا سو جانوروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

☆☆☆

ایک روز ان عفریتوں کی جستجو میں نکلا تھا کہ دو خاتونوں کو بندوق لیے اس طرف آتے دیکھا، ان میں ایک نوجوان اور دوسری ادھیڑ عمر تھی۔ لڑکی کا نام ایستھر تھا۔ جسم مجسم اور آزاد جوانی کا زندہ مجسمہ، سنہری بال اور لبوں پر مستقل مسکراہٹ ہاتھ میں بندوق مہم جوئی کا پتہ دے رہی تھی۔ کون

کافر ہوگا جو دل نہ دے بیٹھے۔ میں پہلی ہی نظر میں اس شمع کا پروانہ بن گیا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ ایک مشنری پادری کا خاندان ہے جو انگلستان سے ان وحشیوں اور کافروں کو حضرت مسیحؑ سے روشناس کرانے آیا ہوا ہے۔ باپ تو اپنے مذہبی کاموں میں مصروف رہتا ہے اور بیٹی کو شکار کا شوق بجائے آبادی کے کشاں کشاں جنگل کی طرف لے جاتا ہے۔

ابتدائی گفتگو کے بعد طے ہوگیا کہ اگلے روز سے ساتھ ہی شکار کو چلا کریں گے، ماں بھی خوش ہوئی کہ اسے خواہ مخواہ جھاڑیوں میں گھس کر بدن کو لہولہان کرانے سے نجات مل گئی۔ ایستھر کی نظر کسی دوربین سے کم نہ تھی۔ زیر درختی جنگلات میں ہاتھی بڑی آسانی سے چھپ جاتے ہیں لیکن وہ انہیں ڈھونڈ نکالتی تھی اور میں کبھی ایک کبھی دو کا روزانہ شکار کر لیتا تھا، پھر شام تک ہم ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر پیار اور محبت کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ہاتھی دانت کی فروخت سے چند ہی روز میں میری مالی حالت اتنی مستحکم ہوگئی کہ میں نے پادری صاحب کو ان کی لڑکی کے لیے پیام دے دیا جو بلا پس و پیش منظور ہوگیا اور ہماری شادی اسی جنگل میں ہوگئی جہاں نہ رہنے کے واسطے گھر تھا، نہ سونے کے لیے مسہری۔ آخر یہ طے پایا کہ ایک ایسی موٹر خرید لی جائے جو سواری کا بھی کام دے سکے اور گھر داری کا بھی اور اسی کے ذریعے شہر سے سامان لا کر ایک مکان کی بنیاد ڈالی جائے جس میں ہمارے دن گل سدا بہار پر فضا ہوا میں آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ ایک سال کے بعد اس درخت کے سامنے جو آج بھی ہمارے عاشقانہ دورِ حیات کی یادگار کے طور پر موجود ہے۔ ایک چھوٹا سا خوب صورت بنگلہ تعمیر کر لیا اور ہم دونوں کی متفقہ کوششوں اور کاوشوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ بہت جلد مجھ کو ہاتھیوں کے شکار اور دانتوں کی تجارت میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگئی۔ افریقہ سے بیرونی دنیا میں ہماری ایجنسیاں کام کرنے لگیں لیکن افسوس۔

شکاری نے ایک گہری سانس لی، جس کے ساتھ ہی ایک آہ سی منہ سے نکلی اور چند منٹ کے واسطے بالکل خاموش ہوگیا، منہ رومال سے ڈھک لیا۔ ممکن ہے کہ امنڈنے والے آنسوؤں کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہو، لیکن جلدی ہی اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا اور داستان کا تانا بانا جس جگہ سے ٹوٹا تھا، اسے مربوط کر کے پھر کہنا شروع کیا۔

افسوس! ہمارے یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوئے، ہر طرح کے جتن کیے۔ حتیٰ کہ مقامی ملا سے جھاڑ پونچھ اور حبشی ڈاکٹر سے جادو ٹونکے کرانے میں بھی دریغ نہ کیا لیکن بچے کے نام پر چوہیا تک پیدا نہ ہوئی۔ ہم دونوں کی محبت اب ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کے اظہار میں صرف ہونے لگی۔ دونوں کو ایک ہی غم کھائے جا رہا تھا اور دونوں منافقانہ طور پر ایک دوسرے کو ڈھارس دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر یہ طلسم بھی چند روز میں ٹوٹ گیا۔ ایستھر نے شکار میں دلچسپی لینی چھوڑ دی اور اب مجھے تنہا ہی اور وہ بھی بادل ناخواستہ ہاتھیوں کی تلاش میں نکلنا پڑتا تھا۔ اس وقت تک جانور بھی چوکنا ہوگئے تھے اور دور ہی دور رہتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ کاروبار میں بھی خلل واقع ہونے لگا۔ دوسری طرف بیوی کو اولاد کا غم اندر ہی اندر کھانے لگا۔ اس کی صحت جو کسی زمانہ میں قابلِ رشک تھی، رفتہ رفتہ گرنے لگی۔ اور چند روز میں تو یہ حالت ہوگئی کہ اُٹھ کر پانی پینا بھی مشکل ہوگیا۔ میں نے بے انتہا اصرار کیا کہ شہر میں چل کر علاج کرائے مگر وہ یہ کہنے لگی کہ میں تو مرنا چاہتی ہوں اور میری آخری تمنا یہ ہے کہ اسی پیڑ کے نیچے دفن ہوں جس کے تلے ہماری محبت پروان چڑھی تھی۔ ہماری شادی کو بیس سال ہو چکے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کل کی بات ہو۔

☆☆☆

وہ تو چند روز میں رخصت ہوگئی لیکن میری دنیا تاریک کر گئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں آخر لعنت برکار شیطانی کہہ کر کاروبار کو سمیٹا اور جو کچھ جمع جتھا تھا، لے کر انگلستان کا رُخ کیا۔ چند روز گلیوں اور سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتا رہا۔ لوگ میرے نام اور کارناموں سے بخوبی واقف تھے۔ کوئی مجھ سے ہمدردی کرنے اور کوئی میرے کارنامے سننے آجایا کرتا تھا۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا، حتیٰ کہ برما میں جنگلی ہاتھیوں نے ایسے ہنگامہ مچایا کہ ہماری حکومت نے گاندھی کے شور و شر کو بھی پس پشت ڈال کر پہلے اس کے سد باب کی فکر کی اور محکمہ خارجہ نے بغیر مجھ سے پوچھے خود ہی طے کر لیا کہ اس اکھاڑے میں میرے بغیر کوئی پہلوان کامیاب نہیں ہوسکتا۔ حکومت کی طرف سے درخواست ہوئی کہ اس مہم پر چلا جاؤں اور انکار نہ کروں۔

ضروری سامان سفر تیار کیا اور ایک بار بردار جہاز سے روانہ ہو کر رنگون کی بندرگاہ پر جا اترا۔ برما کے متعلق کیا عرض کروں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ قدرت نے اس علاقہ کو ہاتھیوں ہی کے واسطے بنایا ہے۔ درمیان سے ایک بڑا دریا گزرتا ہے جس کے دونوں جانب گھنے جنگلات ہیں۔ بانسوں کی کثرت ہے جو اس دیو پیکر جانور کی مرغوب غذا ہے۔

ہاتھیوں کے غول اس طرح دندناتے پھرتے ہیں کہ شیر تک ان سے خائف رہتے ہیں۔ جب یہ کسی طرف کا رُخ کرتے ہیں تو ایک آزمودہ کار ہتھنی سب سے آگے سونڈ اوپر اُٹھائے ہوا میں دشمن کی بو سونگھتی ہوئی بڑھتی ہے۔ اس کے پیچھے کچھ تنومند توانا نر ہوتے ہیں۔ درمیان میں باقی ماندہ ہاتھی، ہتھنیاں اور عقب میں وہ حفاظتی دستہ ہوتا ہے جو خطرہ درپیش ہونے کی صورت میں پورے گلہ کا احاطہ کر کے ان کی حفاظت کرتا ہے۔

ایشائی ہاتھی اپنے افریقی بھائیوں سے جسامت میں کچھ چھوٹے ہوتے ہیں لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ بندر کے بعد اگر کوئی ہوشیار جانور کرۂ زمین پر موجود ہے تو وہ یقیناً ہاتھی ہے۔ اس کا دماغ عجیب طرح سے کام کرتا ہے اور مسائل تو اس طرح حل کرتا ہے کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کسی زمانہ میں ربع مسکون پر اسی کا راج تھا اور انسان اس کے سامنے چیونٹی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا کہ جب چاہے پاؤں سے کچل دے۔ دوست بنا کر تو اس سے جتنا چاہیے کام لے لیجئے۔ لیکن اس کی معمولی دشمنی بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ برما ہی کا ایک واقعہ ہے کہ مہاوت ہاتھی کو پانچ سیر کی موٹی موٹی روٹیاں کھلایا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ فیلبان نے کچھ آٹا بچا لیا، اور گھر لے گیا۔ اس پر ہاتھی کو اتنا تاؤ آیا کہ واپس آتے ہی اسے سونڈ سے پکڑ کر دو ٹکڑے کر دیا اور لاش کو گھسیٹ کر دریا میں پھینک آیا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ برما ہاتھیوں کا ملک ہے، اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے اور یہ تو کرۂ ارض کے سب سے بڑے جانور تھے، جو کچھ کرتے کم تھے۔ سرزمین ان کی اپنی تھی۔ انسان تو اس پر ناجائز طریقوں سے قابض ہو گیا تھا اور طرح طرح کی فصلیں اُگا رہا تھا۔ ان میں گنا اس کی مرغوب غذا تھی۔ اس لیے سب نے مل کر من حیث القوم طے کر لیا کہ اس فصل پر ان کی اجارہ داری ہوگی اور وہ کسی کو اپنے پاس پھٹکنے کی اجازت نہ دیں گے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ایک مستقل جنگ کی صورت میں رونما ہوا۔ جس میں انسان کی بری طرح شکست اور پسپائی ہوئی سینکڑوں جانیں ضائع ہوگئیں اور گھروں کی جو بربادی ہوئی اس کا تو شمار و قطار ہی نہیں۔ کیونکہ یہ کھیت کے مالکوں کا تعاقب کرتے اور ان کی جھونپڑیاں اُجاڑ کر واپس لوٹتے تھے۔ شہر کے تمام کارخانے بند ہوگئے۔ عام لوگ الگ پریشان تھے کہ اس مصیبت سے کس طرح نپٹا جائے۔

آخران کے خلاف جنگ کا ایک زبردست منصوبہ تیار کیا گیا۔ شکاریوں کی ایک کھیپ بھرتی ہوئی۔ ہر طرح کی بندوقیں اور سامان حرب مہیا کیا گیا۔ دو تین جانور ہلاک بھی ہوئے لیکن جیسا میں عرض کر چکا ہوں۔ ہاتھی صرف جسمانی طاقت ہی میں مالک علی الاطلاق نہیں سوجھ بوجھ میں بھی کسی سے کم نہیں۔ اس نے بھی ایک دفاعی بلکہ جارحانہ منصوبہ بنالیا اور رات شکاریوں کے کیمپ پر ایسا شبخون مارا کہ تہلکہ مچ گیا۔ بہت سے تو موقع پر ہلاک ہوگئے اور جو اکا دکا بچ رہے، ان کو فرار ہی میں عافیت نظر آئی۔ اخباروں نے شور مچانا شروع کیا۔ ایک نے سرخی لگائی طے کرنے کا مسئلہ۔ برما میں انگریز کی حکومت ہے یا ہاتھی کی۔ دوسرے نے لکھا ہمیں ڈٹے رہنا چاہیے یا ملک ہاتھیوں کے حوالے کر کے واپس آجانا چاہیے۔

یہ حالات تھے جن میں مجھے برما جانے کو کہا گیا جس کی وجہ سے جان عزیز ہوئی، مہم شروع ہوئی۔ ابتداء میں مجھے بھی پے در پے ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر مجھ میں یکا یک شکاری کی روح بیدار ہوگئی اور ایک دن میں پانچ ہاتھیوں کی ہلاکت عمل میں آئی، اخبار میں تصاویر شائع ہوئیں۔ ٹائمز آف انڈیا نے کثیر معاوضہ دے کر میرے کارناموں کو شائع کرنے کا ٹھیکہ لیا۔ ہاتھی دانت سے جو رقم حاصل ہوئی، وہ بھی لاکھوں تک پہنچتی تھی۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جس کی پوری تفصیل اخبارات میں موجود ہے۔

☆☆☆

بوڑھا شکاری اب تک اپنی داستانِ حیات بیان کرتے کرتے کچھ تھکان محسوس کرنے لگا تو میں نے بیرے کو مشروب لانے کا اشارہ کیا۔ دونوں نے ایک ایک پیالی قہوہ پیا۔ میں نے ایک اناڑی کی طرح سوال کر دیا کہ آپ اپنے شکار کا کوئی خاص واقعہ بیان فرمایئے۔

اس دوران کاریو کا تخیل خدا معلوم کن پیچیدہ راہوں میں گشت کرتا ہوا پھر اسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں اس کی شریک حیات ابدی نیند سو رہی تھی۔ چنانچہ اس بے خودی کی حالت میں اس کے منہ سے جو فقرات نکلے اس سے بوڑھے شکاری کے دلی کرب کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

''ناز کا وہ درخت جس کے نیچے ہم گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ آئندہ کے سہانے خواب دیکھتے اور شکار کا گوشت بھون کر کھایا کرتے تھے۔ اب بھی اسی طرح کھڑا ہوا ہے، لیکن ہر طرف ایک اداسی کا عالم طاری ہے۔ وہی چھوٹا سا خوب صورت بنگلہ جو کسی زمانہ میں جنت ارضی معلوم ہوتا تھا، اب کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ میں اس خیال سے وہاں گیا تھا کہ زندگی کے باقی ایام اسی ماحول میں گزار دوں اور ایستھر کے پہلو میں دائمی نیند سو جاؤں لیکن یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ چند ہی روز میں ایسی وحشت ہوئی کہ کھانا پینا حرام ہوگیا اور دوستوں نے یہ حال دیکھ کر مجبور کر دیا کہ انگلستان واپس چلا جاؤں۔ اب آپ میری مایوسی کا اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا اور شکار کے دو تین ایسے واقعات سناتا ہوں جس سے آپ کو اس عظیم جانور کی فطرت کا بہت کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

افریقہ کے مغربی ساحل پر پرتگالیوں کی ایک نوآبادی انگولا ہے۔ یہاں میرا ایک دوست ڈی سلوا فریدہ کے علاقے کا گورنر تھا۔ ایک دن اس کا تار ملا کہ معاملہ ایک ہاتھی کا ہے جس نے تمام علاقے میں تباہی مچا رکھی ہے۔ چنگھاڑتا، دہاڑتا، دندناتا پھرتا ہے۔ بندوق کی گولی کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بارود کی بو دور سے سونگھ لیتا ہے اور جنگلوں میں ایسا غائب ہوتا ہے کہ پھر ہفتوں تک نظر نہیں آتا۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ کالوں اور گوروں کو خوب پہچانتا ہے۔ انہیں تو اپنا ہم وطن سمجھ کر کچھ نہیں کہتا لیکن اگر یورپین نظر آجائے تو اس کی جان کا دشمن

بن جاتا ہے اور اسے موت کے گھاٹ اتارے بغیر دم نہیں لیتا۔ اب تک تو ہم اس کے مظالم کسی نہ کسی طرح برداشت کرتے رہے لیکن کچھ عرصہ سے اس بدمعاش نے اپنی آن بنالی ہے جو گنے کے کھیتوں کو بری طرح پامال کر رہی ہے۔ یہی ہماری سب سے بڑی معیشت ہے جس کو اس نے تباہ کر رکھا ہے۔ آپ کے سوا اس دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو ہمیں اس آفت سے نجات دلا سکے۔ معاوضہ تو خیر جو کچھ آپ لیں گے، دیا جائے گا لیکن آپ کا یہ احسان ہم کبھی نہ بھولیں گے۔

اب سنئے کہ واقعہ کیا تھا۔ کسی اناڑی نے بغیر اس کا تن وتوش، قوت وتوانائی اور چلت پھرت کا صحیح اندازہ لگائے بغیر اس دیو پر گولی چلا دی اور وہ بھی اس گھبراہٹ میں کہ نشانہ خطا ہو گیا اور صرف اس کے بائیں پاؤں میں ہلکا سا زخم آ گیا جس سے طیش میں بھر کر اس نے شکاری کو تو وہیں ختم کر دیا اور اس کے بعد سے قسم کھالی کہ کسی سفید فام کو زندہ نہ چھوڑے گا اور اب گویا ایک ہاتھی اور پوری یورپین برادری کی جنگ تھی جس میں آخر الذکر کو ہر محاذ پر پسپائی ہو رہی تھی اور بقول میرے دوست کے آج کل اس علاقہ کا گورنر وہ نہیں بلکہ ہاتھی بنا ہوا تھا۔

اس جانور کے قد وقامت، عادات واطوار اور طور وطریق کو اس کے نقش قدم سے بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب میں نے اس کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ وہ بڑا ہی تجربہ کار، ہوشیار اور عیار ہے۔ اس کے پاؤں کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہے جس کی وجہ سے مستقل طور پر لنگ کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا جذبہ انتقام ابھی تک تازہ ہے اور صرف جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ میرے تلاش کرنے سے قبل ہی اس نے مجھے ڈھونڈ نکالا اور اگر میری چھٹی حس بیدار نہ ہوتی تو میں یقیناً اس کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا ہوتا۔ ہوا کا رُخ اس کی طرف سے میری جانب تھا۔ اس لیے میں نے دور ہی سے اس کی بو سونگھ لی اور ایک اونچے تناور درخت پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی سامنے آ گیا لیکن یا خدا ہاتھی تھا یا پہاڑ۔ انگلستان کے چڑیا گھر کا جمبو جیٹ جس کو بعد میں امریکہ بھیج دیا گیا تھا اور جو ایک چلتی ریل سے ٹکرا کر فنا ہو گیا۔ ساڑھے گیارہ فٹ اونچا اور ساڑھے چھ ٹن وزنی تھا لیکن اس کی اونچائی کسی طرح 13 فٹ سے کم نہ تھی اور وزن بھی ڈیوڑھا تو ضرور ہو گا۔ دم بالکل سفید تھی یا سفید ہو گئی تھی۔ کیونکہ اندازے کے مطابق اس کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ تھی اور دانت آٹھ فٹ تو ضرور ہوں گے۔ جن کو فروخت کر کے انسان پوری زندگی عیش وآرام سے بسر کر سکتا ہے۔

اس کو دیکھتے ہی میرے بدن میں کپکپی ہونے لگی، ہوش وحواس جواب دینے لگے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس موقع پر میں طرح دے جاؤں اور اس سے کوئی تعرض نہ کروں۔ لیکن نہ معلوم کیا ہوا کہ میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ جانور کو آپ ہزار حیوان کہہ لیں لیکن ان کی حس ہمارے مقابلے میں بڑی تیز ہوتی ہے۔ ہاتھی کو فوراً خطرہ کا علم ہو گیا اور اس نے اس سرعت سے پہلو بدلا کہ گولی دائیں جانب سے ہوتی ہوئی نکل گئی اور اس کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے میری طرف گھور کر دیکھا۔ قریب آ کر سونڈ سے درخت کی جڑ کو ہلایا کہ اُکھڑ سکتی ہے یا نہیں اور جب پتہ چلا کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو پھنکارتا ہوا جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔ اگر کہیں میں اس کے جھانسے میں آ کر نیچے اتر آؤں تو میری ہڈی تک ریزہ ریزہ ہو جائے کیونکہ وہ پاس ہی کھڑا ہوا میرا کئی گھنٹے انتظار کرتا رہا لیکن میں بھی بہر حال آزمودہ کار شکاری تھا اور ان کے داؤ پیچ سے بخوبی واقف تھا۔ آٹھ گھنٹہ مسلسل انتظار کے بعد نیچے اترا۔ جاں بچی سو لاکھوں پائے۔

دوسرے مقابلے میں میری گولی اس کے سینے میں پیوست ہوگئی لیکن گرنا تو کجا وہ تو لڑکھڑایا تک نہیں۔ قدم قدم اطمینان سے چلتا نظروں سے غائب ہوگیا۔ کئی روز تک جنگل میں اس کی لاش ڈھونڈی جاتی رہی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ پندرہ بیس دن کے بعد خبر آئی کہ لنگڑے ہاتھی کے نشانات گنے کے کھیتوں میں پھر دکھائی دینے لگے ہیں اور ایک جرمن سیاح اس کی چیرہ دستی کا شکار ہوگیا ہے۔ اب وہ مجھے میدانِ عمل میں آنے کی دعوت دے رہا ہے لیکن اس دوران مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس ڈیل ڈول اور قد و قامت کے جانور کی کھال یقیناً اتنی دبیز ہوچکی ہوگی کہ اس پر معمولی گولی کارگر نہ ہوگی، جو شیر اور چیتوں کو با آسانی ہلاک کرسکتی ہے لیکن ہاتھی کے مقابلے میں اکثر بے اثر ہوجاتی ہے۔ چنانچہ میں نے ایک بڑی گولی جو چڑیا کے انڈے کے برابر تھے، ایجاد کی، خود ہی اس کا سانچہ تیار کیا اور خود ہی انہیں ڈھالا۔ اب تو یہ عام ہوگئی ہے اور چار یا ڈنڈر کہلاتی ہے۔

پہلے چند ہاتھیوں پر اس کا تجربہ کیا جو توقع سے زیادہ کامیاب رہا پھر ایک بڑی رائفل بنوائی جو بیک وقت تین گولیاں چلا سکے اور اس سامان سے لیس ہوکر حملہ کی تیاریاں شروع کردیں۔ دیہات میں ہنگامی حالات کا اعلان کردیا گیا اور دور دور تک کا علاقہ خالی کرالیا گیا۔ اسکولوں میں چھٹی کردی گئی اور لوگوں سے کہا گیا کہ گھروں میں بیٹھیں اور بلاضرورت باہر نہ نکلیں۔ پھر پتہ لگایا گیا کہ قرب و جوار میں گنے کے کھیت کہاں کہاں ہیں اور ان کے نزدیک پانی کا ذخیرہ کہاں کہاں ہے۔ کیونکہ ہاتھیوں کی عادت ہے کہ کھا پی کر تالاب یا دریا پر جاتے اور نہاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کے اس مقررہ راستے پر چند تناور درخت موجود تھے جن میں سے ایک پر میرے لیے آرام دہ اور محفوظ مچان بنادی گئی اور میں دو ساتھیوں سمیت اس پر براجمان ہوگیا۔ ہوا ساکت تھی جس کی وجہ سے ہماری بو باس اوپر سے نیچے نہیں پہنچ سکتی تھی اور اس طرح بھی ہم محفوظ تھے۔ رات کچھ سوتے کچھ جاگتے گزاری، معمولی سی آہٹ یا پتہ کی کھڑکھڑاہٹ سے آنکھ کھل جاتی تھی۔ دن چڑھنے کو تھا کہ موذن نے جنگل سے اذان دی۔ پھر چرندے چہچہانے لگے، آخر آفتاب کی کرنوں نے بھی درختوں کی چوٹیوں کو جگمگانا شروع کردیا اور ہم مایوس ہوکر واپس جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ وہ دیو قامت عفریت دور سے آتا دکھائی دیا اور چند منٹ میں بالکل ہی نزدیک آگیا۔ سامنے سے پیشانی پر نشانہ لگانا ممکن نہ تھا۔ اس لیے میں نے کنپٹی کو تاکا اور گولی چلادی، جو کارگر ثابت ہوئی، خون کا ایک فوارہ چھوٹ نکلا، لیکن خدا معلوم کس قسم کے گوشت پوست کا بنا ہوا تھا کہ نہ گرا نہ لڑکھڑایا اور میری طرف دیکھنے لگا، اس طرح اس کا رُخ بالکل سامنے ہوگیا، یہ بات میرے لیے مفید تھی، کیونکہ اب میں پیشانی کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً دوسری گولی چلادی جس سے اس کا بھیجا پاش پاش ہوگیا اور اس طرح انگولا کی سرزمین ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے اس موذی کے ظلم و ستم سے پاک ہوگئی۔

حکمران قوم نے آزادی کا سانس لیا اور میرے اوپر پھولوں، روپیہ پیسے اور زر و جواہر کی بارش ہونے لگی۔ اسکے علاوہ مالِ غنیمت میں ہاتھی دانت حاصل ہوئے، ان کی قیمت کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ کبھی آئیں تو میرے عجائب خانے میں ان کو ضرور دیکھئے گا۔

کوئی پیشہ ور صحافی ہوتا تو خدا معلوم اس ماہرِ فن سے کیا کیا سوال کرتا اور جواب میں کیسے کیسے نایاب موتی گود میں سمیٹ لیتا۔ میں ٹھہرا اناڑی، اس کوچہ سے بالکل ہی ناآشنا۔ اس لیے ایک بے تکا سوال کر بیٹھا کہ کیا آپ کو کبھی ہاتھی کے مقابلہ میں ناکامی کا بھی منہ دیکھنا پڑا۔

میرا خیال تھا کہ اس پر وہ کچھ جز بز ہوگا، کچھ ناک بھوں چڑھائے گا، ممکن ہے کہ ڈانٹ بھی دے لیکن اس نے اپنے پوپلے منہ سے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور لگا کہنے کیا آپ نے نہیں سنا کہ شہسوار کبھی نہ کبھی پٹخنی کھاتا ہے۔ مجھے بھی ایک ہاتھی کے مقابلے میں منہ کی کھانی پڑی۔ یہ بھی جنوبی

افریقہ ہی کا واقعہ ہے۔ منر نامی ایک ہاتھی تھا۔ بڑا شریف، مالک کا وفادار، مہاوت کا فرمانبردار۔ جب کام نہ ہوتا تو جنگل کو نکل جاتا۔ دنوں ادھر ادھر گھومتا، پھر خود ہی آجاتا۔ ایک مرتبہ وہ مست ہو گیا۔ مستی اس جانور کا ایک ایسا مرض ہے جس کی علت غائی آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آسکی۔ کچھ غدود ہوتے ہیں جو پھول جاتے ہیں اور جانور کی طبیعت ہی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر ایک کا دشمن اور خون کا پیاسا ہو جاتا ہے، ہلاک کرنے اور پیروں سے روندنے میں اسے لطف آنے لگتا ہے اور لوگوں کی جان خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ ابھی تک اس کا صرف ایک ہی علاج دریافت ہوا ہے کہ اسے گولی مار دی جائے۔ چنانچہ منر کے بارے میں بھی یہی فتویٰ صادر ہوا اور پیٹرولس کو اس کام پر متعین کیا گیا جس کا شکاریوں میں بڑا نام تھا۔ اس نے اپنے زعم میں گھوڑے پر سوار ہو کر مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ لیکن تقدیر مخالف تھی۔ نشانہ خطا ہو گیا اور قبل اس کے کہ دوسرا وار کرے، ہاتھی نے اسے جالیا۔ گھوڑے کو تو اُٹھا کر دور پھینکا جس سے اس کی کمر ٹوٹ گئی، پھر سوار کو اس طرح کچلا کہ ہڈی پسلی سرمہ ہو گئی، دیر تک غصہ سے چنگھاڑتا رہا۔

آس پاس جو لوگ تھے، خوف سے کانپنے لگے جس سے ہو سکا درخت پر چڑھ گیا جو رہ گیا وہ ساکت لیٹ گیا کیونکہ اس جانور کی فطرت ہے کہ بھاگنے والے کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور اسے ضرور ہلاک کرتا ہے۔ کچھ دیر تک چنگھاڑتا رہا، پھر چشمہ پر جا کر نہایا اور تازہ دم ہو کر اسی جگہ لوٹ آیا۔ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا کہ لاش کے ساتھ کیا عمل کیا جائے۔ آخر درختوں سے ٹہنیاں توڑیں اور ان سے اسے ڈھک کر چلا گیا۔ اس روز تو کسی کو نزدیک آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اگلے دن سرکاری عملے کے لوگ آئے تو دیکھا جسم قیمہ قیمہ ہو چکا ہے اور اسے کسی طرح لاش نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے طے کیا گیا کہ اسی جگہ قبر کھود کر جو کچھ باقی رہ گیا ہے، اسے دفن کر دیا جائے۔ لیکن آپ اس جانور کی کینہ توزی ملاحظہ کیجئے کہ دو تین دن بعد جب اس کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے قبر کو سونگھ کر اس کے چبوترے کو منہدم کر دیا اور آج بھی کئی سال گزرنے کے بعد لوگ بتاتے ہیں کہ وہ قبر پر گاہے گاہے آتا اور گرد و پیش میں جو پودے اگ آتے ہیں ان کو تہس نہس کر کے چلا جاتا ہے۔ مقامی لوگ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی بدروح آگئی ہے اور اب یہ کسی بندوق یا رائفل سے ہلاک نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے چاندی کی گولی درکار ہو گی۔

بہر حال میں نے بھی دو مرتبہ قسمت آزمائی کی۔ ایک دفعہ تو وہ مجھے دیکھتے ہی فرار ہو گیا اور میری ساری چابکدستی دھری کی دھری رہ گئی۔ دوسری بار اس نے خود مجھے بے خبری میں آن لیا اور سونڈ میں لے کر اتنا اونچا اُچھالا کہ اگر زمین پر گرتا تو یقیناً جسم پاش پاش ہو جاتا لیکن قسمت نے عجیب طرح یاوری کی اور میں ایک تناور درخت کی شاخوں پر جا گرا۔ جہاں سے اوپر چڑھ جانا آسان تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے لیکن میری عمر تو اسی دشت کی سیاحی میں گزری تھی۔ فوراً ہی چوٹی تک پہنچ گیا اور لگا اس عفریت کا منہ چڑانے، دشمن نے بھی کوئی داؤ نہ چھوڑا، ہر طرح سے کوشش کی کہ درخت کو گرا لے، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ دو راتیں اور دو دن میں اوپر اور وہ نیچے موقع کا انتظار کرتے رہے۔ آخر تھک ہار کر وہ چلا گیا اور پھر کبھی نظر نہ آیا۔ اس مرتبہ جو میں افریقہ گیا تو معلوم ہوا کہ وہ موذی ابھی تک زندہ ہے اور کوئی سال ایسا نہیں جاتا کہ اس کے نامہ اعمال میں دو چار انسانوں کا خون نہ لکھا جاتا ہو۔ حکومت عاجز ہے اور لوگ پریشان۔ اب اس کی فطری موت ہی انہیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتی ہے۔

شکاری نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگا۔ ”میری پیٹیاں اب بھی کارتوسوں سے بھری ہوئی ہیں، بندوقیں اب بھی اپنا دہانہ کھولنے کو تیار ہیں، لیکن ہاتھ پاؤں شل ہو چکے ہیں، دل مردہ ہو گیا ہے اور میں خود اپنی شکست کی آواز بن کر رہ گیا ہوں۔ آپ کا اگر کبھی میرے غریب خانے

پر آنے کا اتفاق ہو تو ہاتھیوں کے متعلق ایسی ایسی چیزیں دیکھیں گے کہ چشم حیرت کھلی کی کھلی رہ جائے گی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر آپ کو اس ہاتھی کے پاؤں کا وہ نشان نظر آئے گا جس کو لندن کے اخباروں نے اپنے صفحات میں شائع کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی وسعت صرف اس کے ایک حصہ ہی کی متحمل ہو سکی اور پورا نشان کوئی بھی نہ چھاپ سکا۔

ہاتھی کے شکاری کی یہ داستان اتنی عجیب تھی کہ دونوں میں سے کسی کو بھی وقت کا اندازہ نہ ہو سکا اور رات کے کھانے کی گھنٹی بجنے لگی اور ہم اس طرح چونک پڑے جیسے کسی نے بڑے خوب سے بیدار کر دیا تھا۔

.....❁.....

پانچواں اور چھٹا حصہ شائع ہو گیا ہے
مدارک
احمد اقبال کے قلم سے
جاسوسی اور ایڈونچر سے بھرپور تہلکہ خیز سلسلہ
قیمت فی حصہ -/60 روپے

محمود احمد مودی کے قلم سے
رومانی و سماجی اور معاشرتی ناول
خلش
قیمت -/150 روپے

محی الدین نواب کے قلم سے محبت کے موضوع پر دلچسپ کتاب
محبت کا عذاب
قیمت 125 روپے

علیم الحق حقی کے شہرہ آفاق قلم سے نئی کتاب
قفس
قیمت -/100 روپے

اپنے قریبی بکسٹال یا ہاکر سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
Ph: 7247414

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

ناگن

1933ء میں زبردست طوفانی بارشوں نے ایک طرف شہر روہتک کا تین چوتھائی حصہ تباہ کر دیا تو دوسری طرف نہر جمن غربی کا غربی کنارہ صاف کر ڈالا جس کی وجہ سے سیلاب کا پانی ضلع روہتک کے تمام مشرقی اور شمالی دیہاتوں کو نیست و نابود کرتا ہوا شہر پر چڑھ دوڑا اور تمام سول لائن زیر آب آ گئی۔ گورنمنٹ کالج میں پندرہ بیس فٹ کے قریب پانی کھڑا تھا۔ شہر کی تین چوتھائی آبادی ایک چوتھائی حصے میں پناہ تلاش کرتی پھرتی تھی اور سارا ضلع ایک بے کراں سمندر بنا ہوا تھا جس میں لاشیں ہی لاشیں تیرتی پھرتی تھیں۔ خوبرو نوجوان، خوب صورت نازک عورتیں، پھول سے بچے، ہاتھی جیسے ہریانوی بیل، بھاری بھرکم سیاہ ہریانوی بھینسیں اور اونچے قد کی سفید براق گائیں ایک عجیب تباہی تھی۔ جس کے تصور سے آج 42 سال بعد بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انسانیت، شرافت، ہمدردی، امداد و تعاون، قربانی اور تہذیب و اخلاق کا جو مظاہرہ بلا امتیاز مذہب و ملت لوگوں نے کیا وہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔

جب پانی خشک ہوا اور دیہات میں دوبارہ آبادکاری شروع ہوئی تو نہر جمن غربی کی مرمت کا ٹھیکہ شہر روہتک کے چند لوگوں نے لے لیا جن میں میرے والد محترم بھی شامل تھے۔ چنانچہ شہر سے بے شمار لوگ نہر کی مرمت کرنے کے لیے میلوں تک کنارے کنارے خیمے لگا کر وہیں رات کاٹنے لگے۔ چاروں طرف حدِ نگاہ تک پانی کیچڑ اور خشکی کے بڑے بڑے جزیرے بھیانک منظر پیش کر رہے تھے جس جگہ ہمارا پڑاؤ تھا وہاں عقبی حصہ جنگلات سے اٹا پڑا تھا۔ اس جنگل میں ایک جوڑا انتہائی خطرناک ناگوں کا رہتا تھا۔ دونوں ناگ کم از کم چھ چھ سات سات فٹ لمبے اور انسانی بازو جتنے موٹے تھے۔ ان کی شرارت، جرأت اور چستی کا یہ عالم تھا کہ مزے سے دس دس بارہ بارہ آدمیوں پر حملہ کر کے نہیں ہراساں کر کے آگے بھگاتے اور کوئی کاہل سست گر جاتا یا پیچھے پھنس جاتا تو علی الاعلان اس کے ساتھ کھیل تماشہ کر کے اس کا خون خشک کرتے۔ جی میں آتا تو چھوڑ دیتے، جی میں آتا تو معمولی سا ڈس لیتے کہ بچ جاتا۔ اور دل چاہتا تو دونوں بھرپور وار کرتے جس کی وجہ سے انسان ہائے بھی نہ کرتا کہ ختم ہو جاتا۔

اسی طرح جنگل میں کوئی تنہا پھنس جاتا تو اس کے ساتھ یا تو شرارت کر کے چھوڑ دیتے یا ڈس لیتے۔ وہاں ہزاروں آدمی پھیلے تھے۔ ہر ممکن کوشش کی گئی کہ ان کو قابو کیا جا سکے لیکن سرکاری عملے نے بھی اپنی بے بسی اور معذوری کا اظہار کر دیا۔ یہ اس قدر چست تھے کہ بجلی کے کوندے کی مانند غائب ہو جاتے تھے۔ ایک شخص تھا جو کہتا تھا کہ یہ تو جوانی کا کھیل ہے۔ یہ بزدل، کمزور لوگوں کو کاٹتے ہیں اس نے کئی بار خود ان کے ساتھ اپنی لاٹھی سے کھیل تماشے کیے مگر وہ اسے اتنے خوب صورت لگتے تھے کہ اس نے انہیں جان سے مارنے کا کبھی خیال بھی نہیں کیا۔

اس شخص کا نام تھا تاج محمد یہ روہتک کی انصاری برداری کا انتہائی نیک طینت پرہیزگار تربیت یافتہ پہلوان پٹے گتکے کا ماہر کھلاڑی، لمبے قد، چوڑے چکلے سینے کا انتہائی خوب صورت جوان تھا جس کا غالباً آٹھ دس سال کا بچہ بھی تھا اور اسے بچوں سے بڑی محبت تھی۔ لوگوں نے ہزار منت کی

کہ وہ اس ناگ کے جوڑے سے لوگوں کو نجات دلائے لیکن وہ یہی کہتا رہا کہ لوگ ان کی حد میں جاتے کیوں ہیں وہ تو بڑا خوب صورت جوڑا ہے۔

اتفاق سے ایک دن ناگ نے ایک بچے کو ڈس لیا، بس پھر کیا تھا، تاج محمد انصاری نے بچہ اُٹھایا اور جنگل میں گھس گیا۔ بے شمار لوگ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے، اس نے بچے کو اندازے سے ناگن کے مسکن کے قریب رکھا اور بے بھاؤ کی خرافات سنانی شروع کر دیں کہ نکل باہر تجھے معصوم بچے کو ڈسنے کا مزا چکھاؤں۔ میں اس معصوم کا بدلہ تم سے نہ لوں تو میرا نام تاج محمد نہیں۔ تاج محمد نے لاٹھی کئی سوراخوں میں ڈال کر ٹھونگیں مارنی شروع کر دیں۔ اتنے میں شور مچا آ گئے، آ گئے۔ سامنے سے دونوں ناگ خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ تاج محمد کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کے پاؤں گتکے کی چال پر تھرک رہے تھے۔ اور وہ حملے کے لیے ایسا بے چین تھا کہ بس زمین اس کے پاؤں تلے سے نکلی جاتی تھی۔ ناگوں نے ایک نظر مجمع کو دیکھا پھر پلٹ کر بجلی کی تیزی سے تاج محمد پر ٹوٹ پڑے۔ مجمع تو خوف کے مارے تتر بتر ہو گیا لیکن سارا جنگل اکھاڑہ بن گیا۔ تاج محمد پلٹ پلٹ کر ادھر بچتا پھرتا تھا اور موقع ملتا تو ایک آدھ لاٹھی زبردست رسید کر دیتا تھا۔

عجب افراتفری اور بھگدڑ مچی تھی۔ میدان گرد سے اٹ گیا تھا۔ خدا جانے کیا کیا معرکے ہوئے بھاگ دوڑ، افراتفری میں بس یہ نظر آیا کہ دونوں ناگ بھاگے جا رہے ہیں اور تاج محمد لاٹھیوں سے وار کرتا تعاقب کر رہا ہے، یہاں تک کہ جنگل سے باہر نکل آئے۔ ایک سانپ ذرا کافی آگے بھاگ رہا تھا۔ دوسرا کچھ پیچھے تھا اس کے عین پیچھے تاج محمد تھا اور پیچھے پیچھے مجمع شور کرتا بھاگ رہا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کسی نے لاٹھی تو کیا ایک پتھر تک نہ مارا۔ اچانک تاج محمد نے لاٹھی پھینکی اور پچھلے سانپ کی دم پکڑ کر بجلی کی تیزی سے سر کے اوپر دائرے کی شکل میں گھمانا شروع کر دیا اور پھر پوری قوت سے زمین پر دے پٹخا۔ پھر اُٹھایا اور سر پر گھمانے لگا اور پھر پٹخا بس سانپ ٹھنڈا ہو گیا اور اس کے منہ سے خون کا فوارہ اُبل پڑا مگر تاج محمد نے اسے پھر پوری قوت سے گھمایا اور پوری شدت سے پٹخا، پھر معائنہ کر کے پھینک دیا اور لاٹھی اُٹھا کر منہ کچل ڈالا۔ یہ تھا تاج محمد انصاری جس نے ناگ کے مقابلے میں انسانی طاقت کی برتری ثابت کی۔

کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ تاج محمد اپنے خیمے میں آرام کی نیند سو رہا تھا اس کے ایک طرف غالباً اس کی برادری کا فاروق اور غفار سو رہے تھے اور دوسری طرف دو اور آدمی سو رہے تھے۔ تاج محمد عین درمیان میں سو رہا تھا۔ رات کے تین بجے جب ہزاروں آدمی مکمل سناٹے میں آرام کی نیند سو رہے تھے۔ ایک زبردست آواز گونجی ہائے مر گیا۔ یہ تاج محمد کی آواز تھی۔ فاروق اور غفار یہ آوازیں سن کر ہڑبڑا کر اُٹھے تو انہوں نے تاج محمد کے بستر سے موٹے تازے ناگ کو دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا اور چلائے تاج، محمد، ناگ، تاج محمد نے فوراً اپنا کھیس ناگ پر ڈال دیا جو اس میں اُلجھ گیا۔ تاج محمد نے اسے دبوچ لیا اور جلد ہی اس کا منہ تلاش کر کے پکڑ لیا کسی نے سل کا بٹا پکڑا دیا تو تاج محمد نے اس کے سر کا قیمہ بنا دیا۔ لوگ خوشی خوشی سانپ کو اُٹھا کر باہر لے گئے۔ بڑا مجمع ہو گیا۔ نامعلوم لوگ کتنی دیر تک تاج محمد کی تعریف کرتے اور سانپ کو اُلٹتے پلٹتے رہے۔ کوئی من چلا، تاج محمد کو مبارک باد دینے اس کے بستر تک جا پہنچا اور لگا اسے جھنجھوڑنے مگر تاج محمد اب کہاں تھا۔ سانپ تو پہلے ہی اپنا کام کر چکا تھا۔

اس شخص نے شور مچایا تو فاروق نے خدشہ ظاہر کیا کہ تاج محمد نے چیخ ماری تھی، اسے سانپ نے کاٹا ہو گا۔ فوراً شہر روہتک کے ہسپتال پہنچے، شام چار بجے تک اسے بچانے کی کوشش کی جاتی رہی لیکن چار بجے اس کا جسم اکڑ گیا اور ہر جگہ بڑے بڑے نیلے نیلے دھبے پڑ گئے۔ گھر لایا گیا، عجب

کہرام مچا تھا۔ تمام شہر جمع تھا۔ سارا شہر غم کے مارے ماتم کدہ بنا تھا۔ لوگ کسی جوگی کو بلانے گئے تھے وہ جب آیا تو تاج محمد کو نہلا دھلا کر کفن پہنا، خوشبوؤں میں بسا بڑے چوک میں رکھ دیا گیا تھا کہ شہر والے اپنے بہادر کا آخری دیدار کر لیں۔ جوگی نے جسم دیکھ کر کہا، ناگن نے کاٹا ہے۔ لوگوں نے ناگ لا کر سامنے ڈال دیا۔

اس نے الٹ پلٹ کر شناخت بتائی کہ ناگن ہے، پھر اس نے ایک تسبیح نکالی جس میں امام کی جگہ ایک ہیرے جیسے پتھر کا پھول لگا تھا۔ اس نے یہ پھول بہت دیر تک اس کے سارے جسم پر پھیرا یہاں تک کہ وہ تاج محمد کی بائیں پسلیوں کے پیچھے بکھی میں چمٹ گیا، وہ اسے الگ کرتا مگر وہ مقناطیس کی طرح دور سے کھینچ کر پھر اسی جگہ جا چمٹتا۔ آخر جوگی نے ایک جھاڑو کی سیخ مانگی۔ لوگوں نے دی تو اس نے جھاڑو کا تنکا پسلی کے نیچے جسم میں سوراخ کے اندر اتنا چبھو دیا کہ تنکا اپنے وزن پر کھڑا ہو گیا پھر اس نے بتایا کہ سانپ نے یہاں دانت مارے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس نے آج تک کسی سانپ کو ایک وقت میں اتنا زہر جسم میں چھوڑتے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ بھی کہا کہ تاج محمد کاٹنے کے تین گھنٹے کے اندر مر چکا تھا۔ غالباً تاج محمد دائیں کروٹ سو رہا تھا کہ سانپ نے بائیں پہلو پر کاٹا۔

سب سے بڑا عجوبہ یہ تھا کہ سانپ نے تاج محمد کو پانچ آدمیوں میں شناخت کر کے ڈسا۔ ناگن نے اپنے ناگ کا انتقام لے لیا لیکن اصل انتقام تاج محمد انصاری نے انسانیت کے قاتل دونوں ناگوں سے لیا۔ کیا ہو گیا اگر مر گیا، موت تو دنیا میں سب کو آتی ہی ہے اسے تمام عمر زندہ تو نہیں رہنا تھا۔ آن کے سامنے جان کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں اور پھر مسلمان کی آن! وہ بہادر تھا اور بہادروں کا جذبہ انتقام زندہ باد جذبہ انتقام کے سامنے ایسی کئی موتیں ہیچ ہیں۔ اس کا بچہ جوں توں کر کے پل ہی گیا۔

ایم ایچ کیلانی کے قلم سے ایک پراسرار اور خوفناک ناول
ہفت طلسم
ایک سید زادے کی زندگی میں پیش آنے والے پراسرار اور خوفناک واقعات
پراسرار معبد جہاں شہنشاہ ظلمات خون کی بھینٹ لیتا تھا
عابد بابا..... بدی کی طاقتوں کے خلاف آہنی چٹان
ایک خبیث سادھو کا شیطانی جال
قیمت 100 روپے
ایم الیاس کے قلم سے ایک جاسوسی شاہکار
بازی
زندگی اور موت کی بازی
ایک دوشیزہ کی کہانی جسے ہارنا پسند نہیں تھا
تاش کے کھیل کا رستم..... وہ کبھی بازی نہیں ہارا تھا۔
اس کہانی کا ہر کردار اپنی اپنی بازی کھیلتا نظر آئے گا۔
قیمت 100 روپے
براہ راست منگوانے کا پتہ
علی ٹاٹر میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
Ph: 7247414
اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

جال

''ھومالی''لڑکے نے زور سے پکارا''آج لائے ہو کمان؟''

مالی کو دیکھتے ہی اسے کمان لا دینے کا وہ وعدہ یاد آ گیا تھا جو مالی نے اس سے کر رکھا تھا۔ وہ سکول میں اپنی ہونے والی پٹائی بھی بھول گیا تھا جس کے نشان ابھی تک اس کی ہتھیلیوں پر اور پشت پر ایک عجیب سی کسک پیدا کر رہے تھے۔

مالی کیاری میں کام کرتے کرتے کھڑا ہو گیا۔

''افوہ! تم آج پھر بھول آئے ہو شاید؟''لڑکے نے دور پہاڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، یہاں سے کنچن چنگا، نانگا پربت یا کے ٹو کی چوٹی صاف نظر آ رہی تھی.....بس ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی نظر نہیں آتی تھی، وہ یہاں سے بیس میل دور دار جلنگ میں ٹائیگر ہل سے نظر آتی تھی اور لڑکے کو کامل یقین تھا کہ جب وہ بڑا ہو جائے گا تو امی اسے ضرور وہاں جانے کی اجازت دیں گی اور پھر وہ دنیا کی بلند ترین برف پوش چوٹی کا نظارہ دیکھ سکے گا۔

''آؤ بیٹھ جاؤ''۔اچانک مالی کی آواز نے اس کے خیالات کا رشتہ منقطع کر دیا۔''میں تمہیں بتاؤں کہ میں آج کمان کیسے بھول آیا''۔

''میں آج بیٹھ نہیں سکتا مالی''۔لڑکے نے کہا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے آج میری پٹائی کی ہے''۔لڑکے نے کہا۔''اور میری کمر اور ہتھیلیوں میں درد ہو رہا ہے''۔اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ وہ مالی سے بے تکلف ہو کر باتیں کیا کرتا تھا اور مالی بھی اس سے باپ جیسا شفقت آمیز سلوک کیا کرتا تھا لیکن یہ بات بتاتے ہوئے لڑکے کو پھر شرم محسوس ہوئی۔''انہوں نے تیرہ بید مجھے مارے کیونکہ میں بھٹے اڑانے سکول کے پچھواڑے والے کھیت میں چلا گیا تھا اور ان کے خیال میں یہ چوری تھی''۔

''ہاں یہ چوری ہی تھی۔ دیکھو نا، کسان نے دن رات محنت کی تب کہیں جا کر فصل تیار ہوئی۔ اب اگر اس میں سے تم بھٹے لے لو تو یہ چوری ہی ہوئی نا؟''جس وقت مالی یہ بات کہہ رہا تھا تو اسے بچپن کی ایسی ہی شرارتیں یاد آ رہی تھیں۔

''اچھا اگر تم بھی کہتے ہو تو یہ واقعی چوری ہو گی''۔لڑکے نے کہا۔

''تم رو پڑے تھے؟''مالی نے پوچھا۔''یا تم نے مردوں کی طرح اپنے آنسو روک لیے تھے''۔

''میں رویا نہیں تھا''۔لڑکے نے سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔''کم از کم میری آنکھوں سے کوئی آنسو نہیں نکلا.....بس ذرا سا چیخا ضرور تھا میں''۔

''چلو یہ ٹھیک ہے''۔ بوڑھے آدمی نے کہا۔ ''اچھا اب تم یہ جاننا چاہو گے کہ میں آج کمان کیسے بھول آیا؟''

''نہیں مالی بابا، تم مجھے ریچھ کی کہانی سناؤ''۔ لڑکے نے کہا۔

وہ یہ کہانی پہلے بھی سن چکا تھا..... ایک مرتبہ نہیں، بیسیوں مرتبہ سن چکا تھا لیکن وہ اس کہانی کو سن کر ہر بار نیا لطف محسوس کرتا تھا۔ ادھر مالی بھی کہانیاں سنانا پسند کرتا تھا اور اس کہانی کو سناتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور اس کے لہجے میں ایک عجیب سا جوش و خروش پیدا ہو جاتا تھا۔ مالی نے کھرپا نیچے رکھتے ہوئے ہاتھوں سے مٹی جھاڑی، وہ اس کہانی کو ہمیشہ اپنا کام روک کر بڑے ذوق شوق سے سنایا کرتا تھا۔

اس نے بیڑی سلگائی اور سنانے لگا۔

یہ اس زمانے کا ذکر تھا جب وہ نوجوان تھا ایک دن وہ ہاتھ میں کمان اور کندھے پر کلہاڑی رکھے ایک سانبھر کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس کی کلہاڑی کا پھل دن کی چمکیلی دھوپ میں چمک رہا تھا اور کمان بڑی خوب صورت اور مضبوط تھی..... یہ وہی کمان تھی جو اس نے اب لڑکے کو دینے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ یکا یک اسے ''سڑاپ'' کی ایک زوردار آواز آئی، ایک لمحے کو وہ بالکل نہ سمجھ سکا کہ یہ آواز کیسی تھی لیکن اگلے ہی لمحے جب وہ دو قدم آگے بڑھا تو تمام بات واضح ہو گئی۔ لوہے کے ایک جال میں ایک ریچھ پھنس گیا ہے اور یہ آواز لوہے کے جبڑے نما کڑے کے ریچھ کے پاؤں کو پکڑنے کی تھی۔ وہ محتاط انداز سے آگے بڑھا، اس نے دیکھا کی ریچھ کی پچھلی دائیں ٹانگ لوہے کے جبڑوں نے بری طرح جکڑ لی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس قسم کے جبڑے گوشت میں سے ہوتے ہوئے ہڈی کے اندر پیوست ہو جاتے ہیں اور کسی بڑے سے بڑے طاقتور جانور کے لیے بھی اس قسم کا جال توڑنا یا اس سے نکل بھاگنا ناممکن تھا کیونکہ اس کڑے میں بندھی ہوئی زنجیر کا دوسرا سرا ایک درخت کے موٹے تنے میں لگا دیا جاتا تھا۔

ایک لمحے کے لیے مالی کی نظریں ریچھ کی نظروں سے ملیں، ان میں ایک عجیب قسم کا کرب رقصاں تھا جو حیرت کے جذبے کے ساتھ ملا جلا تھا۔ اس کے بعد ریچھ نے اس جال سے نکلنے کی کوشش شروع کی۔ ہر بار جب وہ کوشش کرتا تو لوہے کے جبڑے اس کی ٹانگ کے اندر اور زیادہ گھس جاتے اور مزید تکلیف پیدا کرنے کا باعث بنتے مالی حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ ریچھ کب تک اس دردناک تکلیف کو برداشت کرے گا۔

اس نے سوچا کہ جال تو نہ جانے بستی کے کس آدمی نے لگایا ہوگا اور وہ یہاں کب آئے اسے خود ہی ریچھ کو مار دینا چاہیے۔ بستی کی روایت کے مطابق اگر وہ ریچھ کو مار دیتا تو جال لگانے والا اور وہ دونوں آدھے آدھے حصے کے حق دار ہوتے۔ اب قسمت نے اسے موقع دیا تھا تو وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ ریچھ کو کیسے مارے؟ اسے معلوم تھا کہ اس کے کندھے پر کلہاڑی رکھی ہوئی ہے لیکن اس سے ضرب لگانا آسان کام نہ تھا کیونکہ کلہاڑی سے وار کرنے کے لیے ریچھ کے پاس جانا پڑتا تھا اور ریچھ کے اگلے پاؤں صحیح سلامت تھے..... تیر کمان کے بارے میں یہ مصیبت تھی کہ اتنی طاقت سے تیر چلانا آسان کام نہ تھا کہ کھال، چربی اور گوشت میں سے ہوتا ہو ریچھ کے دل میں پیوست ہو جاتا۔

اس نے چند منٹ تک سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ ریچھ کے پیچھے جا کر حملہ کرے وہ آہستہ آہستہ چکر کاٹ کر ریچھ کے پیچھے پہنچا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس پر حملہ کرتا، ریچھ کو نہ جانے کیسے پتا چل گیا، اور وہ یکدم پلٹ کر مالی پر حملہ آور ہو گیا، اگر مالی چوکنا نہ ہوتا تو وہ مر گیا ہوتا کیونکہ وہ پھرتی سے مڑا اور ریچھ کے بازوؤں کے حصار میں آنے سے پہلے وہاں سے کھسک گیا۔ جھٹ سے اس نے ایک تیر کمان میں جوڑا اور چھوڑ دیا۔

''گھپ'' کی آواز سے تیر ریچھ کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ ریچھ نے اس زور سے جست لگائی کہ اگر وہ جال میں جکڑا ہوا نہ ہوتا تو مالی اس کے خون خوار پنجوں میں پھنس گیا ہوتا۔

تیر شاید ریچھ کے دل میں پیوست ہوگیا تھا، تبھی تو ریچھ بری طرح تڑپنے لگا تھا۔ اس نے ایک زبردست جھٹکے سے تیر سینے سے نکال پھینکا اور سینے کو پنجوں سے کریدنے لگا۔

مالی نے اس کے سر پر کلہاڑی سے بھرپور وار کرنے کے متعلق سوچا لیکن ضروری نہیں کہ قسمت ہر بار انسان کا ہی ساتھ دے۔ مالی کی ضرب لگی لیکن عین اسی لمحے ریچھ کا ایک پنجہ مالی کی ٹانگ کا گوشت ادھیڑتا ہوا چلا گیا۔ خون کا فوارہ چھٹا اور مالی درد کی شدت سے تڑپنے لگا۔ چند منٹوں کے بعد اسے کچھ ہوش آیا تو اس نے گھور کر ریچھ کی طرف دیکھا اور چیخا، ''ہو بھالو'' اس کے بعد اس نے دیوانہ وار ریچھ پر حملہ کیا اور آخر کار ریچھ کو مار دیا۔ مالی کس طرح واپس آیا، یہ ایک علیحدہ کہانی تھی۔

مالی کے منہ میں لگی ہوئی بیڑی اب بجھ چکی تھی۔

''مالی بابا ذرا اپنا پاؤں تو دکھانا'' لڑکے نے کہا۔

مالی نے دھوتی گھٹنے تک سرکاتے ہوئے ریچھ کے پنجے کا زخم دکھایا۔

''کیا تم روئے تھے مالی؟''

''مرد ایسی باتوں پر نہیں رویا کرتے چھوٹے صاحب''۔

لڑکا حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''لیکن مالی، کیا ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جن پر مرد روئیں؟'' اس نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ مرد کیسی چیزوں پر روتے ہیں؟''

بوڑھے آدمی نے دھوتی نیچے کرتے ہوئے کہا ''بہت کم چیزیں ہوتی ہیں ایسی''۔

''جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو کن چیزوں پر رو سکوں گا؟''

''میرا خیال ہے کہ ایک آدمی اس وقت روتا ہے جب اس کا دل ٹوٹ جائے۔''

''میں سمجھا نہیں بابا؟''

''تم ابھی نہیں سمجھو گے، لیکن جب بڑے ہو جاؤ گے تو سمجھ جاؤ گے''۔

''اچھا کل مجھے کمان ضرور لا دو گے نا؟''

''ہاں چھوٹے صاحب کل ضرور لا دوں گا''۔

''خدا کرے کہ کل سکول میں فائن ڈے کی چھٹی ہو جائے تو بڑا مزا آئے''۔ لڑکے نے بڑی مسرت سے کہا۔

اتفاق کی بات دیکھئے کہ اگلے دن حالانکہ صبح سویرے پورے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لیکن سکول کی گھنٹی بجتے بجتے روشن اور چمکتی

دھوپ نکل آئی اور لڑکوں نے فائن ڈے کا شور مچانا شروع کر دیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اس معاملے میں خاصے فراخ دل تھے، انہوں نے بھی دھوپ دیکھتے ہوئے چھٹی کر دی۔ چھٹی کا اعلان ہوتے ہی لڑکا سیدھا مالی کے پاس پہنچ گیا۔

''آج؟'' لڑکے نے کہا۔

''ہاں، آج کمان لایا ہوں..... یہ لو''۔ مالی نے لڑکے کو کمان دیتے ہوئے کہا۔

''تیر تو استعمال ہوتے رہے ہیں، اس لیے ختم ہو گئے ہیں مگر کوئی بات نہیں، ہم اور بنا لیں گے!''

''کب! آج بنائیں، ہمیں سکول سے چھٹی ہو گئی ہے''۔

لڑکے کے اصرار پر مالی اسی وقت جنگل کی طرف چل پڑا اور مناسب سی لکڑی تلاش کر کے اس کے چھ تیر بنائے۔ اس کام میں دوپہر ہو گئی لیکن دونوں کو کام کی محویت کے باعث وقت کا احساس نہ ہوا۔ اب لڑکے نے مالی سے یہ اصرار کرنا شروع کیا کہ وہ دونوں چند دن بعد آنے والی چھٹیوں میں شکار کے لیے جنگل چلیں۔

''شکار کے لیے آنے جانے میں ہمیں کم از کم تین دن لگیں گے''۔ مالی نے کہا۔

''تین دن؟ ہم اپنا کھانا ساتھ لے جائیں گے کیا؟''

''ہاں''

''اور ہم سوئیں گے کہاں؟''

''پودوں کی نرم شاخوں کا بستر بنا کے اس پر پتے بچھا لیں گے۔ اس طرح بڑا مزے دار گدیلا تیار ہو جائے گا''۔

''آہا مالی بابا، بڑا مزا آئے گا، مجھے ضرور شکار کے لیے لے چلو''۔

''اور میم صاحب؟ وہ کیا کہیں گی؟''

''میری ممی مجھے جانے سے نہیں روکیں گی..... بتاؤ مالی اگر امی نے مجھے جانے کی اجازت دے دی تو لے چلو گے نا؟''

''ہاں، پھر لے چلوں گا''۔

لڑکے کو اجازت لینے میں کئی دن لگ گئے، آخر کار مالی کی طلبی ہوئی اور مالی کے اس وعدے پر لڑکے کو اس کے ساتھ شکار پر جانے کی اجازت مل گئی کہ وہ تیسرے دن شام تک لڑکے کو واپس گھر پہنچا دے گا۔

''آپ فکر نہ کریں، میں تیسرے دن شام تک لڑکے کو واپس پہنچا دوں گا''۔ مالی نے وعدہ کیا۔

لڑکے کی ماں اداس سی ہو کر دروازے کے دوسری جانب مڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جنہیں وہ مالی سے چھپا لینا چاہتی تھی۔

''اس کا اچھی طرح دھیان رکھنا''۔ اس نے رندھے گلے سے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں میم صاحب''۔ مالی نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''میں چھوٹے صاحب کا پورا پورا خیال رکھوں گا اور انہیں کوئی تکلیف

نہیں ہونے دوں گا"۔

"اور تیسرے دن....."

"جی ہاں! تیسرے دن شام تک اسے گھر واپس پہنچا دوں گا"۔

چھٹیاں شروع ہو گئی تھیں۔ صبح صبح مالی اور لڑکا اپنا اپنا کھانا اور پانی کی بوتل ساتھ لے کر چل کھڑے ہوئے۔ لڑکے کے پاس تیر کمان تھی اور مالی کے پاس کلہاڑی، اس کے علاوہ دونوں کے پاس لمبے پھل والے چاقو بھی تھے جنہیں پہاڑی زبان میں ککری کہتے ہیں۔ تمام دن چلتے رہنے کے بعد شام کو مالی نے نرم شاخوں اور پتوں کا بستر بنایا تو لڑکے نے اس پر اُچھلتے ہوئے خوشی سے کہا۔ "مالی بابا، یہ تو بڑا گدگدا بستر ہے، ایسی اچھی اچھی چیزیں بنانا تم نے کہاں سے سیکھا ہے؟"

"میں نے اس طرح سیکھا ہے جیسے اب تم سیکھ رہے ہو، اس دن تم نے مجھے تیر بناتے ہوئے دیکھا تھا اور آج مجھے جنگل میں بستر بناتے ہوئے دیکھا ہے..... ظاہر ہے کہ اب تم بھی یہ دونوں کام کر سکتے ہو"۔

"ہاں، کر تو سکتا ہوں"۔

"بس انسان یا تو کسی کام کو ہوتے ہوئے دیکھ کر سیکھتا ہے یا اس کے بارے میں سن کر سیکھتا ہے"۔

"اچھا مالی بابا، تم مجھے ہمیشہ کام کرتے ہوئے دیکھنے دیا کرو، میں سارے کام سیکھنا چاہتا ہوں"۔

بوڑھے مالی کے چہرے پر مسکراہٹ ناچنے لگی۔ شاید اس نے بھی اپنے بچپن میں کسی بڑے بوڑھے سے یہی کہا تھا۔

صبح سویرے وہ بیدار ہوئے تو مالی نے پوچھا "کیسی نیند آئی، اس بستر پر؟"

"بہت اچھی"۔ پھر اس نے اچانک کہا۔ "آج ہمیں شکار ملے گا نا؟"

"ہاں، آج ہمیں شکار ملے گا۔ ہمیں جانوروں کے چار چار پانچ پانچ کے جتھے ملیں گے"۔

"سانبھر کے بھی؟"

"ہاں، سانبھر کے بھی"۔

"اچھا، اگر ہرن دور رہے تو تم تیر چلانا، اگر ذرا نزدیک ہوئے تو میں چلاؤں گا"۔

"اچھا اب ذرا آہستہ چلو اور زیادہ باتیں نہ کرنا، ہو سکتا ہے کہ جانور ہمارے قدموں کی آہٹ یا باتوں کے شور سے چونک کر بھاگ جائیں"۔

لیکن دوپہر تک احتیاط سے چلنے کے باوجود انہیں کوئی شکار نظر نہ آیا۔ اب انہیں گھر سے نکلے ڈیڑھ دن ہو چکا تھا اور ان کے پاس صرف ڈیڑھ دن باقی رہ گیا تھا، اس لیے وہ اور آگے نہ جا سکتے تھے۔

"اب ہمیں واپس چل دینا چاہیے"۔ دوپہر کے کھانے کے بعد مالی نے لڑکے سے کہا۔

لڑکے کا منہ لٹک گیا، وہ یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ اس طرح بغیر کسی شکار کے ناکام واپس لوٹے گا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے پہلی مہم

تھی اور وہ اس میں ہار ماننے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ چنانچہ جب اس نے مالی کی بات سنی تو اس پر مایوسی سی چھا گئی۔

''ہوسکتا ہے کسی اور دن ہمیں شکار مل جائے''۔ مالی نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس وقت شکار کے بارے میں سب کچھ بھول جانا چاہیے اور واپس چلنا چاہیے۔''

ایک ناقابلِ یقین حیرت کا تاثر لڑکے کے چہرے پر اُبھرا۔ ''لیکن مالی ابھی تو.....؟''

مالی نے لڑکے کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، میں جانتا ہوں، جانتا ہوں۔ مگر یہ یاد رکھو کہ ہم نے ابھی کافی دور جانا ہے اور میم صاحب سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں تیسرے دن گھر پہنچا دوں گا۔

''ہم ایک اور دن ٹھہر جائیں گے''۔ لڑکے نے جذبے سے بھرپور آواز میں کہا۔ ''امی ہمیں کچھ نہیں کہیں گی''۔

''چھوٹے صاحب''۔ بوڑھے نے جچے تلے الفاظ میں کہا۔ ''میں یہ نہیں جانتا کہ وہ کچھ کہیں گی یا نہیں..... لیکن میں نے ان سے وعدہ کیا تھا اور میں تیسرے دن تمہیں گھر پہنچا دینا چاہتا ہوں۔''

''م..... مگر مالی بابا''۔ لڑکے نے ذرا غصیلے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تو ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا، تم نے تو کہا تھا کہ ہم پانچ چھ ہرن ضرور دیکھیں گے''۔

''تم میرے الفاظ کو بگاڑ رہے ہو''۔

''لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں''۔ مالی نے گھرکتے ہوئے کہا۔ ''خاموش ہو جاؤ اور میری بات غور سے سنو، میں نے تمہاری امی سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں تیسرے دن شام تک گھر پہنچا دوں گا۔ اگر تم وقت پر نہ پہنچے تو وہ رو رو کر برا حال کر لیں گی پھر تمہیں خوشی ہوگی؟''

لڑکے نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں''

''تو بس، کافی باتیں ہو چکی ہیں، اب ہمیں فوراً چل پڑنا چاہیے''۔

یوں واپسی کا سفر بالآخر شروع ہو گیا۔ انہیں چلتے چلتے ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہوا ہوگا کہ لڑکے کو چار پانچ بندر نظر آئے۔ بندروں پر نظر تو مالی کی بھی پڑی لیکن اس نے ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا، وہ اپنے خیالوں میں گھرا ہوا تھا اور ایک ایسی پگڈنڈی تلاش کر رہا تھا جو انہیں جلدی سے جلدی سڑک تک پہنچا سکتی تھی۔

☆☆☆

لڑکے کی نظریں بندر پر پڑتے ہی اس کا دل سینے میں زور سے اُچھلا۔ اس نے اپنی کمان کندھے پر سے اُتاری اور ایک بڑے بندر کا نشانہ لے کر تیر چلا دیا۔ ''سڑاپ'' کی آواز آتے ہی مالی جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ لڑکے کی طرف دوڑا اور اسے شانے پر سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ ''یہ کیا کیا تم نے؟ یہ کیا کیا؟''

''میرا نشانہ دیکھو بابا، میں نے اسے مار دیا، میں نے اسے سچ مچ مار دیا۔'' لڑکے نے زندگی کے پہلے شکار کے جوش کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے برا کیا، چھوٹے صاحب۔ بہت بُرا کیا، بندر کو مارنا پاپ ہے۔''

بندر فوراً نہیں مر گیا تھا بلکہ تڑپ تڑپ کر اِدھر اُدھر لوٹ رہا تھا اور اپنے ہاتھوں سے پیٹ کی وہ جگہ کھرچے دے رہا تھا جہاں تیر لگا تھا۔ لڑکا حیرت سے بندر کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اُداسی کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں۔

اس نے خوف زدہ ہوتے ہوئے مالی کی طرف دیکھا۔

''اسے تکلیف محسوس ہو رہی ہے'' مالی نے آہستگی سے کہا۔ ''لیکن اس کی سمجھ میں کوئی وجہ نہیں آ رہی ہے۔''

مالی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بندر نے تیر اپنے پیٹ میں سے نکال کر پھینک دیا تھا اور اب زخم کو اپنے دونوں ہاتھوں کے ناخنوں سے نوچ نوچ کر بڑھائے جا رہا تھا۔

''بندر وہ چیز تلاش کر رہا ہے جو اسے تکلیف پہنچا رہی ہے''۔ مالی نے دھیمے لہجے میں لڑکے کو سمجھایا اور کندھے سے اپنی کلہاڑی اُتارتے ہوئے کہا ''اگر ہم کسی کی تکلیف کو ختم کر سکتے ہیں تو ضرور کر دینی چاہیے''۔

مالی ابھی چار پانچ قدم ہی آگے بڑھا ہوگا کہ ''کھڑاک'' کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی مالی کی دردناک چیخ سنائی دی۔ لڑکے نے بندر کی طرف سے دھیان ہٹایا اور بوڑھے مالی کو زمین پر تڑپتے ہوئے دیکھا۔ اس کی دائیں ٹانگ میں ایک لوہے کی بنی ہوئی عجیب و غریب چیز پھنس چکی تھی۔ ایک انجانے خوف کا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

''کیا ہوا مالی'' اس نے اپنے دل کو اُمڈے آنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہے''۔

بوڑھے نے ایک دل خراش آہ بھری لیکن نہ تو جھکے ہوئے سر کو اُٹھا کر لڑکے کی طرف دیکھا اور نہ ہی اس بات کا کوئی جواب دیا۔ لڑکے نے لوہے کے کڑے میں پھنسی ہوئی اس کی ٹانگ کو غور سے دیکھا۔ اب کے اسے ٹانگ سے خون نکلتا ہوا نظر آ گیا۔ وہ سسکنے لگا ''مالی! مالی بابا''

بوڑھے نے بھی اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہ کی۔ لڑکا چاہتا تھا کہ مالی اپنا سر اوپر اُٹھائے اور اس کی طرف دیکھے، وہ اس وقت سخت تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ اچانک اس پر یہ خوف ناک صورتِ حال واضح ہوئی کہ اگر خدانخواستہ مالی کو کچھ ہو گیا تو اس کا اپنا کیا بنے گا؟ وہ تو اپنے گھر کا راستہ تک نہیں جانتا تھا۔ وہ اس جنگل سے اکیلا نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے دونوں ہتھیلیوں میں منہ چھپا کے رونا شروع کر دیا۔

بندر اس وقت تک اپنی تمام آنتیں وغیرہ پیٹ سے نکال پھینکنے کے بعد مر چکا تھا۔

مالی کی آنکھوں کے سامنے کا گھور اندھیرا آہستہ آہستہ سرخی میں تبدیل ہونے لگا۔ پھر اس کی نگاہوں کے سامنے زرد زرد دھبے ناچنے لگے۔ پھر اسے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے اپنے آپ کو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ٹانگ میں ایک عجیب سی ٹیس اٹھی جسے وہ بمشکل تمام پی سکا۔ اس نے دیکھا لوہے کے ایک بھاری کڑے نے اس کی ٹانگ کو اپنے خوفناک جبڑوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک زنجیر تھی جو ایک ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر سامنے ایک درخت کے تنے کے اندر پیوست کر دی گئی تھی۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ اور تب اس نے نہایت دھیمی آواز میں کہا

''چھوٹے صاحب!''

لڑکا اُچھل پڑا جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔اس نے سسکیاں لینا شروع کر دیا اور خوشی سے چلایا''مالی بابا!تم ٹھیک ہونا؟''

''نہیں، میں ٹھیک نہیں ہوں''۔مالی نے ٹانگ میں اُٹھنے والے درد کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''تم دیکھ سکتے ہو کہ میں بالکل..... ٹھیک نہیں ہوں''

لڑکے کے چہرے پر مالی کے پکارنے سے خوشی کا جو تاثر ابھرا تھا، وہ اب ختم ہو چکا تھا۔

''چھوٹے صاحب تم گھر چلے جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔وہ سمجھ جائیں گے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔چھینی اور ہتھوڑی کے بغیر اس جال سے نکلنا میرے لیے ناممکن ہے۔''مالی نے ٹانگ میں دوبارہ اُٹھنے والی درد کی شدید لہر کو دباتے ہوئے کہا۔''تم فوراً یہاں سے چل پڑو۔'' مالی کو اپنا وعدہ یاد آ گیا تھا''کیونکہ تمہیں کل شام سے پہلے پہلے اپنے گھر پہنچ جانا چاہیے۔''

لڑکے کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تیرنے لگیں۔

''تم میری فکر نہ کرو۔''مالی نے نرمی سے کہا۔ ''میرے پاس کھانا بھی ہے اور پانی کی اس بوتل سے میں تمہارے آنے تک گزارہ کر لوں گا''۔

لیکن لڑکا اس کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا، وہ اس خیال میں محو تھا کہ وہ اکیلا کیسے جا سکتا ہے؟

''اپنی کمان بھی یہیں چھوڑ دو، اپنے تیر بھی سب غیر ضروری چیزیں چھوڑ دو، جتنا وزن کم ہو گا اتنا ہی تم زیادہ تیز چل سکو گے''مالی نے کہا۔

لڑکے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ دل کی بات کیسے پوچھے۔

''میں نہیں جا سکتا مالی بابا''۔لڑکے نے چاروں طرف پھیلے ہوئے جنگل پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا''میں کیسے جاؤں؟ مجھے تو راستہ نہیں آتا''

''اُف میرے اللہ''بوڑھے نے ناقابلِ بیان اذیت سے چلا کر کہا۔یہ بات تو اسے سوجھی ہی نہ تھی کہ لڑکا اس جنگل میں پہلی بار آیا تھا۔میرا خیال ہے کہ بندر کو مارنے کا عذاب پڑ رہا ہے ہم پر۔اس نے اپنی ٹانگ کے گرد لوہے کے مضبوط کڑے اور زنجیر کو دیکھا اور اس کے بعد اس بھاری تنے کو جس میں زنجیر کا دوسرا سرا پیوست تھا''کاش میرے پاس ایک چھینی ہوتی جس سے میں جال کو توڑ سکتا''،اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔تب لڑکا مجھے بیساکھیاں بنا کر دے سکتا تھا اور میں ان کے سہارے چلتا چلتا گھر پہنچ سکتا تھا۔وعدہ یاد آتے ہی اسے جھرجھری آ گئی''اب کیا ہو گا''اس نے چیخ کر کہا۔لڑکا دکھ اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

مالی نے ایک مرتبہ پھر جال میں پھنسی ہوئی ٹانگ کو دیکھا، یہ ٹانگ نہ جانے کیوں اس کے وعدے کے پورا ہونے میں دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔لیکن وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا۔وہ اس دیوار کو گرا دے گا..... ہاں! یہی اس مسئلے کا حل ہے،اس نے اپنے دل کو اس خوفناک کام پر آمادہ کر لیا کہ وہ لڑکے سے اپنی ٹانگ کٹوا دے گا..... وہ ٹانگ کا جال میں پھنسا ہوا حصہ یہیں چھوڑ جائے گا،لیکن اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔

''چھوٹے صاحب''اس نے تیزی سے کہا،''دیکھو جس طرح میں کہوں اس طرح کرو، چاہے میں کچھ بھی کیوں نہ کہوں۔''

''اچھا مالی بابا اچھا، جو تم کہو گے میں کروں گا..... میں تمہارا ہر کہنا مانوں گا''۔

''تو تم کچھ سوکھی لکڑیاں وغیرہ جمع کر کے آگ جلاؤ اور اس میں اپنی ککری رکھ دو اور اسے خوب گرم کرو۔ یہاں تک کہ اس کا پھل سرخ ہو کر چمکنے لگے۔''

''کیوں مالی بابا؟'' لڑکے نے خوف اور حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یاد نہیں، میں نے کیا کہا تھا؟'' مالی نے تھکن سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

''یاد ہے'' لڑکے نے جھٹ سے اِدھر اُدھر پڑی ہوئی سوکھی لکڑیاں جمع کر کے آگ لگا دی اور اپنی ککری دہکتے ہوئے کوئلوں کے بیچوں بیچ رکھ دی تا کہ اس کا پھل سرخ ہو جائے ''ہاں مالی بابا'' وہ اس کے پاس آیا، اب؟''

اب میری ککری لے جاؤ اور اپنی ٹانگ جتنے موٹے کسی پودے کا تنا کاٹ کر اس میں سے تین فٹ لمبی لکڑی لے آؤ''

''کلہاڑی نہ لے جاؤں اس سے یہ کام زیادہ جلدی ہو جائے گا''

''نہیں میری ککری لے جاؤ'' بوڑھے آدمی نے تیز لہجے میں کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کلہاڑی کی دھار میں ذرا سی خرابی آئے۔

جب لڑکا تنا کاٹ کر لایا تو مالی نے اس کے بازوؤں کے تنے ہوئے پٹھے دیکھے۔ اس نے دعا کی جیسے لڑکے نے اپنے جسم کو اتنا کام کرنے راضی کر لیا، اسی طرح وہ ذہن کو بھی راضی کر لے۔

''ککری چھوڑ دو اور لکڑی کو میری ٹانگ کے ساتھ رکھ دو۔ لڑکے نے ایسا ہی کیا اور اب جال کو اٹھا کر ذرا سا بل دے دو اور میری ٹانگ اُٹھا کر لکڑی کے اوپر رکھ دو..... ذرا آہستہ آہستہ'' اس نے درد سے اپنے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

یہ کام جتنا آسان نظر آ رہا تھا، اتنا ہی مشکل تھا۔ ٹانگ کو لکڑی پر رکھنے میں اچھے خاصے دس پندرہ منٹ لگ گئے اور مالی اس کام کے بعد بری طرح ہانپنے لگا۔ وہ سخت تھکن محسوس کر رہا تھا اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ آنکھیں بند کر لے اور سو جائے..... لیکن اس کا وعدہ اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ ٹکٹکی باندھ کر فضا میں گھورے جا رہے تھا۔

''کیوں بیٹے، چاقو سرخ ہو گیا ہے؟''

''جی ہاں''۔ لڑکے نے دیکھنے کے بعد کہا ''پھل کا رنگ بالکل دہکتے ہوئے کوئلوں جیسا ہو گیا ہے''۔

''اچھا، تو اب پہلے کلہاڑی لے آؤ''۔

لڑکے نے کلہاڑی اسے دیتے ہوئے پوچھا ''اس سے کیا کرو گے؟''

لڑکا بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ وہ مالی کے ان پُراسرار احکامات سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔

مالی نے کلہاڑی اسے واپس کر دی ''اس کو مضبوطی سے پکڑ لو، کیونکہ سب کچھ تم ہی کرو گے''۔

ظاہر ہے کہ وہ لڑکے کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن لڑکے کو یہ کام کرنے کے لیے تیار کرنا پڑے گا۔ اسے خوف زدہ کرنا پڑے گا، یہاں تک کہ وہ اس کام پر آمادہ ہو جائے۔

''چھوٹے صاحب، میں یہیں مرجاؤں گا''۔

لڑکا چونک پڑا، اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ تب تو وہ تنہا رہ جائے گا۔

''اور تم بھی یہیں مرجاؤ گے''۔ مالی نے تلخ لہجے میں کہا۔

لڑکے نے آنکھیں جھپکا کے مالی کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی بات کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟

''تم جنگل سے نکلنے کا راستہ نہیں جانتے اور میں جال میں پھنس گیا ہوں۔ ہم دونوں بھوکے پیاسے دو چار دن بعد مرجائیں گے''۔ مالی نے لڑکے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''لیکن ہوسکتا ہے کہ ہم آج ہی مرجائیں۔ خون کی بو پر چیتے اور بھیڑیے رات کو یہاں آجائیں گے اور ہمیں کھا جائیں گے''۔

مالی لڑکے کی آنکھوں میں دہشت کا واضح رقص دیکھ رہا تھا۔ ''م.....م..... مالی بابا'' لڑکے نے چلا کر کہا۔

''ڈرو نہیں۔ ایک طریقہ ہے جس سے ہم جان بچا سکتے ہیں۔ اگر ہم نے اس جنگل سے زندہ بچ کر نکلنا ہے تو مجھے اپنی ٹانگ کا ایک حصہ جال میں چھوڑ کر جانا ہوگا''۔

لڑکے کو کچھ سمجھ نہ آیا۔

''اگر یہ کام میں خود کر سکتا ہوتا تو کر لیتا، لیکن اب یہ تم کرو گے''۔

''کیا؟ کیا کروں گا میں؟''

بوڑھے آدمی نے اپنے خون آلود پاؤں پر جال کے عین اوپر انگلی سے ایک لائن کھینچتے ہوئے کہا، تم کلہاڑی کا ایک وار..... اپنے جسم کی پوری طاقت کے ایک وار..... صرف ایک بھرپور وار سے اس نشان سے میری ٹانگ کاٹو گے''۔

لڑکا یوں اچھل پڑا جیسے اسے کوئی بھوت نظر آگیا ہو۔ اس کے چہرے پر خوف بڑی طرح ناچ رہا تھا۔

آہستہ آہستہ یہ خوف کچھ کم ہوا تو مالی نے اس سے کہا ''کلہاڑی اُٹھالو''۔ یہ وہ جانتا تھا کہ وہ وعدہ پورا کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہ تھا۔

لڑکا ابھی جھجک رہا تھا۔

''کلہاڑی اُٹھالو''۔

لڑکے نے سہمے سہمے آگے بڑھ کر کلہاڑی اُٹھالی۔

''تمہیں پوری قوت سے ایک وار کرنا ہوگا''۔ مالی نے کہا۔ ''اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو۔ اگر تم گھر جانا چاہتے ہو تو یہ کام کرنا ہی ہوگا''۔

لڑکے نے کلہاڑی اپنے ہاتھوں میں جکڑ لی۔

''سمجھ گئے نا؟''

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور جب تم نشان پر سے میری ٹانگ کاٹ چکو گے تو جھٹ سے گرم چاقو اُٹھا لانا اور اس کا سرخ پھل ایک دو لمحے کے لیے زخم پر رکھ دینا، اس سے خون بند ہو جائے گا''۔

لڑکے نے پھر سر ہلایا۔

''اچھا، تو کلہاڑی اوپر اُٹھا''۔ مالی نے گہرا سانس لیا اور لڑکے کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ ''بیٹے میں نے ہی تمہیں سب سے پہلے کلہاڑی چلانا سکھایا تھا، اب کلہاڑی کے ایک وار سے تم مجھے آزاد کر سکتے ہو''۔

لڑکے نے کلہاڑی اوپر اُٹھالی۔ وہ جیسے کسی مقناطیسی قوت کے زیر اثر کام کر رہا تھا۔

''یہ لائن دیکھو''۔ مالی نے کہا۔ ''بس تم صرف اس لائن سے سروکار رکھو''۔

لڑکے نے لائن دیکھی، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا دل اُچھل کر جیسے اس کے حلق میں آ کر اٹک گیا، اس کا جسم اکڑ گیا تھا اور اس کی ساری قوت بازوؤں میں جمع ہو گئی تھی۔ اس نے کلہاڑی کو اپنے سر سے اوپر اُٹھالیا۔

''اب؟'' بوڑھے آدمی نے چلا کر کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

لڑکے نے ایک جھٹکے سے کلہاڑی کو اوپر اُٹھایا اور پھر آنکھیں بند کر کے پوری قوت سے وار کر دیا۔ جنگل لوہے کی تیز جھنکار سے گونج اُٹھا۔ ضرب کی قوت کے ردِعمل سے لڑکے نے اپنے اعصاب میں جھنجھناہٹ محسوس کی اور کلہاڑی اس کے ہاتھ سے تقریباً چھوٹ گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں ٹھیک ہی دیکھ رہی تھیں۔

وہ خوشی سے چلا اُٹھا ''مالی بابا! مالی بابا۔ میں نے جال توڑ دیا۔ اب ٹانگ کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے!''

لیکن بوڑھا مالی بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں سنا۔

''مالی!'' لڑکا اُداس ہوتا ہوا بولا اور نیچے جھک کر اسے ہلانے لگا۔ جب وہ ہلانے پر بھی نہ بولا تو لڑکے کا کلیجہ اُمڈ کر اس کے حلق میں آ گیا۔ شاید بابا مر گیا ہے۔ چند لمحوں بعد بوڑھے آدمی نے کچھ حرکت کی۔ وہ آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگا تھا۔ اسے باتیں یاد آنے لگی تھیں۔

''کام ہو گیا ہے؟'' اس نے بڑی نقاہت سے کہا ''گرم چاقو لگا دیا ہے؟''

''مالی بابا'' لڑکے نے اطمینان کا سانس لیا ''میں نے تمہاری ٹانگ نہیں کاٹی، مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ جال ٹوٹ گیا ہے! میں نے جال توڑ دیا ہے! اب تم آزاد ہو بابا، اب تم آزاد ہو بابا!''۔

مالی نے سب کچھ سنا لیکن اسے کسی بات کا یقین نہ آیا۔ اب صرف یہ بات سمجھ آئی کہ لڑکا ٹانگ کاٹنے میں ناکام ہو گیا ہے اور وہ اسے بہلا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا جال تو کبھی بھی نہ ٹوٹا تھا! خدایا ''اس نے اپنے آپ سے کہا ''اب یہ سارا کچھ دوبارہ کیسے ہو گا؟''

''چاقو چھوٹے صاحب!'' اس نے کمزوری آواز میں کہا'' چاقو دوبارہ آگ میں رکھ دو''۔

''اب اس کی ضرورت نہیں مالی بابا!'' لڑکے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔'' دیکھو تو سہی جال کو دیکھو تو سہی، یہ ٹوٹ چکا ہے''۔

مالی نے مجبوراً دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا'' آہا آ آ آ'' پھر وہ کہنے گا'' اچھا چھوٹے صاحب، اب لوہے کے نیچے سے لکڑی نکال دو''۔

اس کام میں بوڑھے کو اتنی تکلیف ہوئی کہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور اسے قے آگئی لیکن اس نے اپنی طبیعت کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا'' مجھے اس ٹانگ پر پٹی باندھی پڑے گی!''

''میری قمیض لے لو بابا'' لڑکے نے جھٹ پٹ اپنی قمیض اُتار کر اسے دے دی، جسے مالی نے بادل نخواستہ لے کر ٹانگ پر لپیٹ لیا، لکڑی کی بیساکھی سی بنالی اور لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

''فالتو چیزیں یہیں چھوڑ دو'' مالی نے کہا۔'' اسے لے کر تو ہم کبھی بھی گھر نہ پہنچ سکیں گے۔ صرف پانی کی بوتل اور کھانا لے لو''۔

تھوڑی دور آگے جا کر لڑکے نے کہا'' میں تیر کمان بھی کیوں نہ چھوڑ دوں؟''

مالی نے سر کے اشارے سے اجازت دے دی۔ اب شام پڑنے لگی تھی اور وہ اس جگہ سے خاصے دور تھے جہاں رات سوئے تھے۔ وہ شام ہونے تک وہاں پہنچنا چاہتے تھے۔

لڑکے نے مالی کی طرف دیکھ کر کہا'' میں کلہاڑی چھوڑ دوں بابا؟''

مالی نے لڑکے کی طرف دیکھا اور پھر کلہاڑی کی طرف اور پھر بولا'' چھوڑ دو''۔ اب وہ کچھ تیز تیز چلنے لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ مالی اپنی تکلیف کے باوجود اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہتا تھا اور اس کی یہی صورت تھی کہ آج رات وہیں پڑاؤ ڈالا جائے جہاں رات کو ڈالا تھا۔ آخر کار وہ وہاں پہنچ گئے۔ بوڑھے نے اپنا رومال کھول کر اس میں سے دال چپاتی نکالی اور کھانے لگا۔ لڑکے نے اپنے ٹفن میں سے پراٹھے نکال کر کھائے۔ دونوں نے پانی پیا اور جنگلی بستر پر لیٹ گئے جو رات مالی نے بنایا تھا۔

بستر پر لیٹ کر مالی نے اپنے آپ کو ایک بار پھر یاد دلایا کہ کل تیسرا دن ہے اور کل شام تک اسے لڑکے کو ہر قیمت پر واپس کرنا ہے۔

اگلے دن صبح ہوتے ہی دونوں چل پڑے۔ مالی اب چلتے وقت بہت زیادہ تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ لڑکے کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تمام زندگی اسی طرح بوڑھے مالی کا سہارا بنے چلتا رہا ہے..... لیکن نہیں! ابھی پرسوں ہی تو وہ یہاں سے گزرے تھے۔ اس سے پہلے وہ روز سکول جایا کرتا تھا اور پڑھنے کے بعد کھیلا کودا کرتا تھا۔ باغوں میں خوب صورت تتلیوں کی طرح اِدھر اُدھر اُڑا کرتا تھا اسے مونگیل کا دھیان آیا جب وہ پہلے پہل وہاں گیا تھا اور گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں دھنس گیا تھا۔ مالی نے اسے بتایا تھا کہ کیچڑ کی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کیسے پکڑتے ہیں اور انہیں کیسے تلتے ہیں۔

اچانک اس کا کندھا بوڑھے مالی کے نیچے سے نکل گیا۔

وہ پرانی یادوں کو سوچتے ہوئے کچھ تیز تیز چلنے لگا تھا اور مالی اس کا ساتھ نہ دے سکا اور گر پڑا۔ اس نے زور سے چیخ ماری۔ اس کی زخمی ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹی میں سے سرخ سرخ خون جھلکنے لگا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اُٹھا۔ لڑکے نے اپنے دونوں بازوؤں سے اس کی بغلوں میں سہارا

دے کر اسے کھڑا کیا اور لکڑی کی بیساکھی اس کی بغل میں دے دی۔ جس کی مدد سے وہ پھر چلنے لگا۔ اس نے پھر ایک ہاتھ لڑکے کے کندھے پر رکھ لیا اور سفر پھر شروع ہو گیا۔ بوڑھا اب چلنے میں بہت تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اگر وہ اب کے گرا تو شائد اُٹھ بھی نہ سکے، اور ایسے ہی ہوا۔ لڑکے نے جب دیکھا کہ بوڑھا اُٹھنے کے قابل نہیں رہا تو اسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا۔ وہ چیخنے چلانے لگا اور قسم قسم کے بے ہودہ الفاظ بکنے لگا۔ آخر کار وہ مالی کے قریب گر پڑا اور ہلا ہلا کر دیکھنے لگا کہ وہ مرتو نہیں گیا۔ ایک دفعہ بوڑھے مالی نے آہستہ سے حرکت کی تو لڑکے نے اسے بُری طرح جھنجوڑ دیا۔ مالی کا ہاتھ لڑکے کے چہرے پر زور سے گرا۔

''مالی'' لڑکے نے کچھ اطمینان محسوس کرتے ہوئے چیخ کر کہا، اُٹھو مالی، تمہیں اُٹھنا پڑے گا.....حرام.....''

اس نے اسے دوبارہ سہارا دے کر پھر کھڑا کیا اور بیساکھی اس کی بغل میں ٹھونس دی۔ مالی نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن وہ پھر گر پڑا۔ اس کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ اس کی ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹی کا رنگ کچھ اور سرخ ہو چلا تھا اور اس میں اُٹھنے والی ٹیسوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ شاید دوبارہ کھڑا نہ ہو سکے۔ اس کی ٹانگ ایک من کی ہو رہی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کے نیچے ایک دہکتا ہوا جہنم اُٹھائے ہوئے ہے! اس کی آنکھوں کے آگے ترمرے سے ناچنے لگے۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور اپنے اِردگرد دیکھا۔ اب وہ پختہ سڑک سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔

''ایک بار پھر میری مدد کرو چھوٹے صاحب'' اس نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔

لڑکے نے پھر اُٹھانا چاہا لیکن بے سود، مالی سے اُٹھا ہی نہ گیا۔

تم ختم ہونے والے ہو!..... مالی نے اپنے دل کی آواز سنی۔

''میں تو تمہیں بار بار کھڑا کرتا ہوں''۔ لڑکے نے کہا ''لیکن تم سے کھڑا ہی نہیں ہوا جا رہا ہے!.....اب تو مجھ سے تمہیں کھڑا بھی نہیں کیا جا رہا ہے کیونکہ تمہارا وزن ہر دفعہ زیادہ بڑھتا جا رہا ہے''۔

''اب مجھے رینگنا چاہیے''۔ مالی نے سوچا ''میں ہاتھوں سے گھسٹ گھسٹ کر سڑک کے کنارے تک جا سکتا ہوں اور وہاں سے آگے لڑکا خود بھی جا سکتا ہے۔ ''اچھا ٹھہر جاؤ، میں ہاتھوں سے چلتا ہوں'' مالی بابا نے گھسٹتے ہوئے کہا ''آج تیسرا دن ہے اور آج تمہیں گھر پہنچ جانا چاہیے۔ سڑک اب زیادہ دور نہیں ہے۔ میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ۔ ایک بار تم سڑک پر پہنچ گئے تو سیدھے گھر جا سکتے ہو''۔

لڑکا بوڑھے کے ساتھ ساتھ آہستہ چلتا رہا۔ اس نے مالی کے پاؤں کی پٹی کا رنگ اور گہرا سرخ ہوتے دیکھا اور وہ ایک انجانے خوف سے سہم گیا۔ اس کا دل ایک عجیب سے غم سے بھر گیا۔ مالی کی اس ساری مصیبت کا ذمہ دار وہ تھا۔ وہ خود! اس کا دل اُڑ کر حلق میں آ گیا، اب کیا ہو گا؟ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ عین اس وقت مالی کی بات یاد آئی ''ایک آدمی صرف اس وقت روتا ہے جب اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے''۔ اس نے سوچا کہ شاید آج اس کا دل ٹوٹ گیا ہے۔ تبھی تو وہ یوں رو رہا ہے۔

یکا یک وہ رُک گیا۔ اس نے مالی کو بھی رُکنے کا اشارہ کیا اور پھر اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا

''اُٹھ جاؤ مالی بابا، اُٹھ جاؤ۔ تم اس طرح گھسٹ کر نہ چلو، میں تمہاری مدد کروں گا، اُٹھ جاؤ''۔

''آج تیسرا دن ہے''۔ مالی اس طرح بڑبڑایا کہ لڑکے کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔

''ہمت کرو مالی بابا، لڑکے نے اسے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ میں تمہیں اپنی کمر پر لاد کر چلوں گا!..... ہاں، میں تمہیں اپنی کمر پر لے کر چلوں گا''۔ اس نے اپنے جسم کی پوری طاقت جمع کر کے اُسے اُٹھایا اور کمر پر لادنے کے لیے تیار ہو گیا۔

ابھی لڑکا مالی کو اُٹھائے اُٹھائے تھوڑی ہی دور ہو گیا تھا کہ وہ گر پڑا۔ مالی نے نہایت نازک آواز میں کہا ''چھوٹے صاحب!''

''مالی بابا، معاف کرنا، مجھے ٹھوکر لگ گئی تھی''۔ لڑکے نے لجاجت سے کہا۔ پھر اسے اُٹھا کر چلنے لگا، لیکن اسے دو تین مرتبہ اور ٹھوکر لگی اور آخر کار وہ تھک گیا۔ مالی کا بوجھ اس کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ یکا یک ایک ٹھوکر لگی اور مالی لڑکے کی کمر پر سے پھر گر پڑا۔ اس نے ایک بہت ہی دھیمی سی آواز میں ''ہائے'' کہا اور بے صبری سے گردن اِدھر اُدھر پھرانے لگا۔

''چھوٹے صاحب، سڑک!'' اس نے اپنی بچی کھچی طاقت جمع کرتے ہوئے کہا ''سڑک، چھوٹے صاحب!''

''اب تم چلے جاؤ، چھوٹے صاحب'' مالی نے آہستگی سے کہا۔ ''آج تیسرا دن ہے، اور یہ بھی ختم ہونے والا ہے، جلدی کرو، جاؤ''۔

لڑکے نے مالی کو گھسیٹ کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا، اسے سخت پیاس لگ رہی تھی اور بوتل میں پانی کے آخری چند گھونٹ باقی تھے جنہیں پی کر اس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔

''مجھے چھوڑ دو..... چھوٹے صاحب''۔ بوڑھے نے نہایت کمزور آواز میں کہا ''اور سیدھے گھر چلے جاؤ''۔

''نہیں، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا'' لڑکے نے کسی تاثر سے عاری لہجے میں کہا ''میں تمہیں اپنے ساتھ گھر لے جاؤں گا''۔

بوڑھا عجیب سی بے چینی سے اِدھر اُدھر سر ہلانے لگا۔ اس نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو پورا زور لگا کر کھولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چھوٹا صاحب، اب کیا بے وقوفی کرنے لگا ہے؟ اسے چاہیے کہ وہ اسے ڈرا دے تا کہ وہ سیدھا گھر کی طرف چل پڑے۔

''جاؤ صاحب جاؤ''۔ اس نے لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے نہایت ہی ہلکی آواز میں کہا ''کیونکہ شام پڑتے ہی اس جگہ چیتے.....'' اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، سر یکا یک ایک طرف کو ڈھلک گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

لڑکا بوڑھے کے جھریوں بھرے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ بابا یقیناً تھک گیا ہے، اس لیے اسے نیند آ رہی ہے! لیکن اب وہ کسی چیتے سے نہیں ڈرے گا اور بابا کو اپنی کمر پر لادے لادے شہر لے جائے گا۔ بابا سو گیا ہے تو کیا ہوا؟ وہ اسے اپنے ساتھ شہر لے جائے گا۔ لڑکے نے جھک کر مالی کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی کمر پر لاد لیا۔ جب وہ لڑکھڑاتے قدموں سے سڑک پر چل رہا تھا تو ہلکی ہلکی بوندیں اس کے تمتماتے ہوئے چہرے پر آ کر پڑنے لگیں۔ اس کا تھکن کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ صرف مالی کی ٹانگ کی ناقابلِ بیان تکلیف کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ مالی اب جسمانی تکلیف کی حدود سے بہت دور جا چکا تھا۔

شب خون

تاریخ کی چکی کے پاؤں کی روایاتی گردشیں یکساں رفتار سے ہوتی رہی تھیں۔ جدید سے جدید تر پس پس کر نکلتا رہا تھا۔ خواجگی کے ماؤنٹ ایورسٹ نے بھانت بھانت کے طوفانوں اور رُخ رُخ کی ہواؤں سے برف باری کی تھی اور بندگی کی پست و عمیق وادیوں میں سکتہ اور جمود کی تاریخی کیفیتیں طے ہوتی رہی تھیں۔ راٹھور گڑھ اپنی آبادی کے لحاظ سے جتنا چھوٹا تھا، روایات اور رقبہ کے اعتبار سے اتنا ہی بڑا۔ اب پتہ نہیں کہ بستے وقت حاکم کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی بچائے رکھنے کے اصول کے تحت یا اس کے وسعت رقبہ کو آسانی کے ساتھ کاشت میں لانے کے لیے ایک راٹھور گڑھ کے رقبہ میں چار چھوٹے چھوٹے گاؤں میل میل بھر آدھ آدھ میل کے فاصلے پر چاروں سمت آباد تھے۔ کسی میں چمار، کسی میں پاسی، کسی میں کاچھی اور کہیں گڈریا۔ گویا کہیں خرگوش اور چوہے، کہیں ہرن اور چکارے اور کہیں بھیڑ بکریاں اور بیچوں بیچ شیر کی کچھار! خاص صدر مقام راٹھور گڑھ جس کے وسط میں بست بسوہ مالک ناہر سنگھ کا مکان ایک بڑی اونچی کرسی کی چوپال، ایک وسیع حویلی، ایک لق ودق مویشی خانہ، تقریباً تین چار ایکڑ زمین پر اپنی روایاتی بلندی کے ساتھ ساتھ مادی بلندی میں بھی اپنی نظر آپ ہی ایستادہ تھا۔

ناہر سنگھ کا خاندان پشتوں سے ہر تاریخی دور میں حکومت کا وفادار رہا تھا۔ پٹھانوں کے زمانے میں یہ چھوٹی سی زمین داری اس کے جدامجد نے اپنی عسکری خدمات کے عوض حاصل کی اور مغلوں کے زمانے میں معافی دوام حاصل ہوگئی۔ اور عہد شاہ جہانی کی اسناد کی بنا پر آج تک سرکاری مال گزاری کی ذمہ داری سے بھی آزاد تھا اور ناہر سنگھ کی شخصی حکومت میں تین صدی سے پٹواری سے لے کر تحصیل دار تک کوئی شریک نہ تھا۔

انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کے نصف تک قانون قبضہ اراضی کی کئی موٹی کتابیں کھلیں اور بند ہوئیں، اور پھر نئی نئی قدروں کے تقاضے پر نئی نئی جلدیں سامنے آئیں، مگر ناہر سنگھ کے آہنی پنجے نے راٹھور گڑھ میں کسی ایک کی بھی شیرازہ بندی نہ ہونے دی اور بھاری سے بھاری قانون کو ردی بنا کر ہوا میں اڑا دیا۔ ان پانچوں بستیوں میں ہر دور میں اس کا حکم ربانی آواز تھا۔

☆☆☆

انہیں دنوں کا ذکر ہے، ایک دن راٹھور گڑھ کے قریب ترارہ نے اپنا ڈیرہ جمایا۔ بلندی و پستی کی لغت میں بے معنی، تہذیب و تمدن کی خیر گیوں سے مبرا، جنگل کی صاف و روشن فضا اور آزاد و خالص ہوا میں سچ مچ "بے در و دیوار سا گھر"۔ سخت پتھر اور لیس دار چونے کے بجائے اپنے شکار کے نرم نرم چمڑے کے ٹکڑوں اور لچک دار جنگلی بانوں کی مرہونِ منت عمارت کے پانچ مکین ایک ریچھ، ایک مینڈھا، ایک بکرا اور دو انسان ترارہ خود اور دوسری اس کی نوجوان بیٹی اگنی۔ چاندنی راتوں کے سکونوں اور اندھیری راتوں کے سناٹوں کی پالی ہوئی اور لوؤں کی سنولائی ہوئی، ساون بھادوں کی پھواروں کی نہلائی ہوئی اور طوفانوں کی جمائی ہوئی اور ماہ پوس کے سیوں کی چمکائی ہوئی اور پالوں کی پتھرائی ہوئی اور بارہ سنگوں کی ہیبت

آفرین ہوکوں سے لے کر شیر کی مہیب گرجوں تک سب کی بہلائی ہوئی لڑکی.....آزادی، حسن، تندرستی اور خود اعتمادی کی زندہ چلتی پھرتی تشکیل جیسے برسات کی پیہم نمی سے کسی سوکھے ہوئے بانس کی جڑ سے شاداب گلاب پھوٹ پڑا ہے۔

سنولایا ہوا چمپئی رنگ، دراز قد، بل کھائی پنڈلیاں، اُبھرے ہوئے بازو، سر سے پاؤں تک آہنی اعصاب کی رسیوں میں جکڑا ہوا متناسب جسم، بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں، سرخی مائل پتلے ہونٹ، استقامت اور قناعت، تکبر و انکسار کے خاموش ترجمان۔ گھنگھریالے چمک دار سیاہ بال، تراشی ہوئی مرمریں گردن اور پھر محشر خیز چال جیسے زندگی، تندرستی اور آزادی کے پھوارے اور شرارے بکھرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اجنتا کے کسی مجسمے میں روح دوڑ گئی ہے، خانہ بدوش کی بیٹی تھی۔ ایک سیاہ آہنی تاروں کا تودہ ریچھ ایک لوہیا سا اونی مینڈھا جیسے پتھر کی چٹان پر کائی سی جمی ہوئی۔ ایک سفید ریشمی چمکدار بکرا، خانہ بدوش کی جملہ املاک تھی اور سنگ مرمر کی ایک مورتی، پکی چاندی، سچی چینی کی گڑیا یا خانہ بدوش کا کل خاندان.....

مگر راٹھور گڑھ میں پشتینی روایات اور روایاتی نظائر کی کمی نہ تھی اور ناہر سنگھ کو علاوہ تمام ماحول کے کچھ مخصوص تکنیکی الفاظ بھی ہاتھ لگے تھے جو ایسے موقعوں پر ان کے والد بزرگوار کی وکالت میں رعایا کے سامنے استعمال کیا کرتے تھے اور اسی علم سینہ کا استعمال اب وہ آئے دن اپنے بیٹے گھمنڈ سنگھ کی صفائی دیتے وقت اور ان کے ''مشاغل'' کو حق بجانب ثابت کرتے ہوئے کرتے تھے۔

ناہر سنگھ کے اکلوتے پوتے پر کوئی ایسی خاص نئی جوانی تو چڑھی نہ تھی، بس ویسی ہی معمولی دیوانگی کے ساتھ جیسی ان کے باپ دادا پردادا پر پشتوں سے چڑھتی چلی آئی تھی۔ گھمنڈ سنگھ پر بھی جوانی چڑھی تھی۔ ٹھاکر ناہر سنگھ بے چارے کنور گھمنڈ سنگھ کی مسیں بھیگتے ہی میدان ان کے لیے چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے تھے اور کنور گھمنڈی سنگھ اپنی طباعی کو بھرپور کام میں لا کر ''آنکہ پدر نتواند پسر تمام کند'' کچھ ایسے بڑھ چڑھ کر پٹے بازیاں دکھا رہے تھے کہ جیسے ناہر سنگھ کی پچھلی مہمات یک قلم فراموش ہو گئی تھیں۔ اور ٹھاکر ناہر سنگھ بے چارے تلخ ہونٹوں اور ہنستی آنکھوں سے آئے دن فیصلے صادر کرتے رہتے۔ انہیں نظاہر کے سہارے جن کے ذریعے ان کے باپ ان کے حق میں کیا کرتے تھے، کنور گھمنڈ سنگھ کو تو اپنی دل بستگی کے لیے راٹھور گڑھ کی چار بستیاں موجود تھیں۔ تیرہ چودہ سال کی عمر سے شروع کر کے اس وقت خیر سے چالیسویں بہار اپنے اسی آبائی گلشن میں لوٹ رہے تھے، مگر تارک الدنیا راجپوت، گرگ ظالم وقت پیری میشور پرہیزگار، پینسٹھ سالہ ناہر سنگھ کی زمانہ جوانی کے اور تو سب مشاغل محو ہو گئے تھے، لیکن سپاہی فطرت بڈھے نے اپنی جنگجو طبیعت کو تسکین دینے کے لیے ایک لڑنے والا مینڈھا پال لیا تھا جس کے ذریعے مہینہ پندرہ دن پیچھے ایک آدھ ٹکر کرا کر وہ ذرا اپنی دل بستگی کا سامان کر لیا کرتا تھا۔ ٹھاکر جی کا مینڈھا جو انہوں نے بچپن سے پالا تھا، جوان ہو کر بلا کا سخت بنا تھا۔ بہادری میں شیر، طاقت میں ہاتھی، شکم میں انجن، ہر وقت ریزہ ریزہ کر دینے پر تلا ہوا اور مارنے مرنے پر آمادہ۔ دم شم، گھیر میں چھوٹا ہوا چونا پیسنے کے پتھر پر جو اس کی زد میں اسی پریکٹس کے لیے ڈالا گیا تھا۔ قسمت آزمائی کیا کرتا اور ہمہ وقت ٹکریں لگاتا رہتا اور داد مشق دیتا رہتا۔ دور دور تمام علاقے میں ٹھاکر جی کے مینڈھے کی دھوم تھی۔ سینکڑوں میدان مارے ہوئے تھے۔ اور مدت العمر میں کبھی شکست کا منہ نہ دیکھا تھا اور سچ پوچھو تو عسکری طبیعت ناہر سنگھ کے سست خون میں روانی اور برف سے بڑھاپے میں حرارت اسی کے دم قدم سے تھی اور گھمنڈ سنگھ کی شام جوانی گاؤں کی شودر دوشیزاؤں کے چڑھتے ہوئے آفتاب شباب سے کسب ضیاء کے طفیل صبح خندال اور شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ باپ بیٹے دونوں کی سلطانی نگاہیں بجائے کشت دہقان کے خانہ بدوش کے ڈیرے پر مرکوز

ہو کر رہ گئیں۔ باپ کو اپنی فکر و استعداد کے مطابق خانہ بدوش کے پتھریلے مینڈھے کو شکست دینے کا سودا سوار ہوا اور بیٹے کو خانہ بدوش کی لڑکی کے سنگین شباب سے ٹکرانے کی ہوس دامنگیر ہوئی۔ اپنے اپنے دائرہ میں ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ ادھر مفلس کے مال کے بھاؤ ناہر سنگھ نے دل ہی دل مینڈھے کی قیمت لگائی۔ اور ادھر غریب کی جوانی کے رخ گھمنڈ سنگھ نے اگنی کا سودا کرنے کی ٹھانی۔

خانہ بدوش کو راٹھور گڑھ کے قریب ٹھہرے ہوئے دوسرا روز تھا کہ شام کے وقت ناہر سنگھ نے اسے بلوایا اور کہا۔ ''کیوں رے منداری اپنا مینڈھا بیچت ہے؟

''ہے ٹھاکر جی! جے ہمرے کھانے کمانے کا ٹھکرا ہے، بیچ کیسے دئیں؟''۔

''پچاس روپیا لے اور چھوڑ مینڈھا''۔

''ناہیں سرکار.....راجہ جی.....بیچت ناہیں''۔

''اچھا پچھتر اور چھوڑ.....دے رسی ہمارے ہاتھ مینڈھا کی'' ٹھاکر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''نا بابا! جے تو ہمارے پیٹ کا دھندا اور پریم سوک (شوق) کا سہارا ہے''۔ ٹھاکر کے انداز کا ٹھیک ٹھیک مقابلہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا چل! جا رے منداری سو روپیا تورے ہاتھ دھرے اور مینڈھا ہمیں پکڑائے دے''۔ ٹھاکر نے اپنی پندار میں آسمان کی بلندیوں سے بولتے ہوئے کہا۔

''نا راجہ جی! تیری گدی بنی رہے۔ سو روپیا کے دن بیٹھ کے کھائی گو منداری.....سو اور پچاس روپیا کی بات''۔

اور ٹھاکر میں جیسے یکدم مخصوص کھلاڑی والا جذبہ بیدار ہو گیا۔ جیسے ایک رنگ سا آیا۔ وہ کچھ سنبھلا اور تیوریوں میں خود بخود مساویانہ انداز پیدا ہو گئے۔ اب اس نے اپنی افتادی شکست کا دوسرے پینترے مقابلہ کرنا چاہا۔ بالکل اسی لہجے اور تیور سے جیسے وہ کسی برابر والے مدمقابل دوست سے معاملہ والی بات کر رہا ہے۔ اچھا تو پھر سینو گسائیں جی.....ایک ایک ٹکر دیکھیں گے۔ دیکھیں تو جرا کیسی نٹیا ہے تمہاری.....سیر بھر پکی چاندی پہ تولات ماردی''۔

''ہے سرکار! تیری میری کیا لڑائی.....ہاتھی کی ٹکر ہاتھی روکت ہے، راجہ ہاتھی منداری مینڈھا''۔

''ناگسائیں جی.....اس میں کیا بات ہے۔ مینڈھا لڑت ای اے ہیں اور پالیئی لڑان کو جات ہیں''۔ (اس میں کیا بات ہے.....مینڈھے لڑتے ہی ہیں، لڑانے ہی کو پالے جاتے ہیں)۔

''اے راجہ!.....تو راجہ ہم پرجا.....راجہ پرجا کی کیا لڑائی''۔

''ناگسائیں جی.....ہم تو لڑئیں کل سویرا کو.....جرور۔ بدکے''۔

''پھر سوچ لے ٹھاکر!.....ٹھاکر باپ اور منداری بیٹا!.....باپ بیٹا ہے تمہاری نٹیا کس بل کی''۔

''میرے مالک! منداری تیر و اور نٹیا تیری.....بوؤ (اوہ بھی) مینڈھا تیرا جیئو (یہ بھی) مینڈھا تیرا۔ پھر ٹکر کران کی کہا ماری جات ہے؟''

''بوتو ہے سب کچھ.....اوہتوں اوتھ۔آن۔پھر مانیں نائے ہم۔کل سکارے (سویرے) کوٹکر دیکھیں''۔

''اچھا تو پھر راجہ جی کے جے کہن ہے تو کریں تیار مینڈھا کو''۔خانہ بدوش نے گردن اُٹھا کر اور سینہ تان کر ٹھاکر کے انداز کا صحیح صحیح جواب دیتے ہوئے بالکل مساویانہ طرز سے کہا جیسے ایک سپورٹس مین دوسرے سپورٹس مین کا چیلنج قبول کرتا ہے۔

☆☆☆

ناہر سنگھ نے خیال کیا کہ بھلا یہ بھک منگے مداری کا مینڈھا اس کے مینڈھے کی ٹکر کیا روکے گا۔وہ تو اپنے مینڈھے کو ہر وہ چیز کھلاتا ہے جو وہ خود کھاتا ہے۔غلہ، گھی، دودھ کے سوا اس کے مینڈھے کی اور کوئی غذا نہیں ہے۔روہیل گڑھ کے ظفر یاب خان اور چوہان گڑھ کے شیر سنگھ کے وہ پہاڑ سے مینڈھے ''خوب راتب کھاتب'' اور ''کس بل'' کے چڑھے ہوئے اور سینکڑوں پالیاں مارے ہوئے ایک ٹکر توڑ نہیں۔پوری اس کے مینڈھے کے سامنے اس مداری کی مٹھی بھر کی ''نٹیا'' کس قابل ہے، تین میں نہ تیرہ میں.....جامن گولڑ کے پتوں پر پلا ہوا۔روٹی دانا بھلا مینڈھے کو کہاں سے کھلائے گا۔دن رات ریچھ، بکرا نچا نچا کر اپنا پیٹ نہیں بھر پاتا.....ایک ٹکر میں گرد برد ہو جائے گا۔ہاں پھرتی اور کس کا اچھا معلوم ہوتا ہے۔''کاٹھی'' کا ہلکا ہے۔اگر پیٹ بھرا رہے اور کھانے کو ملا رہے تو لڑائی کے کام کی ہے نٹیا.....سو وہ بیچتا نہیں۔

مطابقت واقعات کی ڈرامائی قسم کی ستم ظریفی! ادھر ترارہ کی آزاد فطرت پانچ ہزار سالہ حریف کے وار پر وار روک رہی تھی۔ادھر اس کی بیٹی حریف کے بیٹے کے مدمقابل نسوانی فولادیت اور وحشی سنگیت کے قدیم روایاتی ہتھیاروں سے ترکی بہ ترکی تھی۔وہ جنگل سے لکڑیاں لادے چلی آرہی تھی اور اس کے راستہ پر گھمنڈ سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔وہ دور سے اپنی وحشی ہرنی والی آنکھوں سے دیکھتی بلا خوف دندناتی سینہ تانے ہاتھوں سے گٹھا سنبھالے اپنے فطری شان استغنا کے ساتھ بڑھی چلی آئی اور جب وہ آٹھ دس قدم رہ گئی تو گھمنڈ سنگھ راستہ کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔اپنے معمول کے نشۂ پندار میں.....یہ بھک منگے خانہ بدوش کی لونڈیا، کیا چیز ہے بے چاری وہ تو اس جنگ کا شیر ہے.....اس کے سامنے اچھے اچھے ذخیلکار چماروں اور پاسیوں کی لونڈیاں جن کے دروازے پر ہزاروں روپیہ دھن نظر آتا ہے، بیگھوں رقبہ کے گھر اندر سے باہر تک بھرے ہی بھرے ہیں، چپ چاپ سرخم کر دیتی ہیں آج تک تو اس کا ہاتھ خالی گیا نہیں ہے۔اتنے ''ٹاپو'' میں، اور یہ تو بے چاری چیتھڑوں کی آڑ میں بسنے والی جس کے چوکھٹ تو درکنار دروازہ بھی نہیں اور اس کی نگاہ میں اگنی کا ڈیرہ گھوم گیا، ہزاروں لاکھوں پیوندوں کی آڑ بلکہ مجسمہ پیوند کاری جس کے سامنے ایک ریچھ، ایک بکرا، ایک مینڈھا، چار ہی گز جگہ پر ساری کائنات بس ایک ترچھی نظر میں رام ہو گئی۔قدم تو بڑھائے جا آگے یہاں سے بات بھی نہ نکل گی منہ سے ثابت''۔مگر وہ قدرے متعجب ہوا جب اس نے غور کیا کہ خانہ بدوش لڑکی کے ہاتھ پاؤں تو درکنار اس کی آنکھ کی چمک بھی ذرا برابر اس کے وجود سے متاثر نہیں ہوئی، وہ اپنی پوری لمبائی تک کھینچ گیا۔اور پورے تناؤ تک تن کر ترچھا کھڑا ہو گیا۔خانہ بدوش لڑکی اپنی فطری شان کے مطابق ذرا بھی آنکھ جھپکے بغیر بڑھتی رہی جیسے وہ ایک ڈمکورے یا پیڑ کے تنے کی جانب چل رہی ہے۔ہرنی کو اپنی کچھار میں بڑھتے ہوئے دیکھ کر شیر نے شکار پر جھپٹنے والا انداز بنایا۔گھمنڈ سنگھ نے اکڑا اتنا تر چھا تر چھا اس کی جانب دو تین قدم بڑھائے اور تصادم سے ایک قدم کے فاصلے پر دونوں کھڑے ہو گئے۔شیر نے اپنے سامنے بجائے ہرنی کے چڑھی کمان اور سونتی تلوار دیکھی اور عقاب کی آنکھ سورج کی آنکھ سے ذرا بھی نہ جھپکی.....ہزاروں سال پرانا

احساس برتری بھرپور بروئے کار آ گیا.....آج بیس پچیس سالہ تجربہ میں گھمنڈ سنگھ کو پہلی مرتبہ عورت کی بے پناہ قوت کا احساس ایک خانہ بدوش بھک منگی جنگلی نبیر تالونڈیا نے اپنی ایک جوابی نظر میں دلایا اور جیسے ردِعمل میں گھمنڈ سنگھ کے رگ و پے میں بجلی کی لہر والا جھٹکا محسوس ہوا۔ اس نے اپنی اقتصادی، سماجی، معاشرتی اور جسمانی جملہ قوتوں کو مجتمع کیا، مگر آخر الذکر بتوں کی مٹی تو اس کی ایک نگاہ میں ہی پلید ہو گئی تھی۔ یک دم اس کے تمام جسم میں ڈھیلا پن پیدا ہو گیا۔ اس کی شیر جیسی آنکھوں میں بھیڑ والی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ آہستہ سے ایک جانب کو ایک سیاسی پینترا سا بدل کر ہٹا.....

ہونٹوں پر مربیانہ قسم کی مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور قدرے مشفقانہ انداز میں کہا۔

''کہو؟! کہاں گئیں ہیں.....اگنی، جنگل سے لکڑیاں لیں''۔

''ہوں''!.....اگنی نے اس کے چہرے کی منقلب کیفیت کا اندازہ لگا کر اس کے انداز کے مطابق اپنا انداز بدل کر کہا، جیسے کنور کا کوئی برابر والا دوست کہتا اور پھر جیسے ایک مستفسرانہ کیفیت اس کے چہرے پر پیدا ہوئی اور کنور کی جانب دیکھ کر آہستہ سے مٹھاری اور چلنے کا انداز بنایا کہ کنور نے جھٹ سے کہا ''ہیں لکڑیاں.....منوں کٹی پڑی ہیں ہمارے گھر میں اُٹھائے منگائی ہوتیں۔ کاؤ چمار سے کہہ دیتیں ڈیرہ پر ڈال آتا گڑھا دو گڑھا''۔

''ایں راجہ! ہم جنگلی آدمی تیرے گھیر (مویشی خانے) کے ایندھن کی پکی ہم کیسے کھالیں''۔ اگنی نے کچھ ایسے مساویانہ انداز سے کہا جیسے اسے اپنے جنگلی ہونے پر اور کنور کے مویشی خانہ کے ایندھن کی پکی ہوئی روٹی نہ کھانے پر فخر سا ہے۔

''سو اس میں کی بات ہے۔ این ساری آسامی جلات ہے چمارون میں، پسیوں میں، کاچھیوں میں، گڈریوں میں سب جلات ہیں اور تم تو ہمارے مہمان ہو'' کنور نے سلونے انداز میں کہا۔

''نی راجہ۔ کرپا ہے۔ ہم تیرے گونتریا (مہمان).....ارے راجہ گونتر راجہ اسی کو سوہات (زیب دیتا) ہے.....اور تیرے گھر کے ایندھن کی پکی تیری پرجا کو پچت ہے (ہضم ہوتی) لڑکی نے قدرے سلونے تیوروں سے اپنے انداز اجنبیت کو قدرے کم کرتے ہوئے کہا جس سے کنور کی ہمت بڑھی۔ وہ قدرے اس کی جانب کو ہمکا اور نہایت ہی میٹھے انداز میں کہا ''اچھا راجہ کو گونتر راجہ ہی کو سہات ہے تو پھر تم رانی کیوں نہ بنیو''۔

''ہیں!'' نہایت ہی بھولے پن سے تعجب کے انداز میں اگنی نے کہا۔ ''رانی بنیں! کنور جی؟ رانی کیسے بنیں جمنے جنگلیں میں''۔ اور اس کے چہرے پر وہ کیفیت باقی رہ گئی جیسے اسے رانی نہ بننے پر اور جنگلوں میں جنم لینے پر ذرا بھی افسوس نہیں ہے۔ اور اس کے بھولے پن سے متاثر ہو کر کنور اس کے بالکل قریب پہنچ گیا اور مخصوص انداز میں کہا۔

''رانی جمنت ناہیں ہے۔ رانی بنت ہے۔ اگنی رانی بنتی ہے۔ راجہ بنات ہے رانی۔ اب جیسے ہم راجہ تمہیں رانی بنیں''۔ سنسان جنگل میں کنور اگنی کے تقریباً ملحق پہنچ گیا۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ اس کے مخصوص انداز کو پوری طرح سمجھ پائے۔ اپنی موٹی انگلی سے ایک تولہ سونے کی بھدی انگوٹھی اُتار کر اس کی جانب بڑھائی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا ''لیو سونا پہنو.....سونا.....اور رانی بن گئیں۔ رانی بنت کتنی دیر لگت ہے اگنی''۔

ہاتھ کے لمس اور سونے کی چمک پر بجلی سی لپک گئی۔ اگنی کے اوپر یک دم بپھری شیرنی والے انداز طاری ہو گئے۔ بھولی بھالی آزاد خانہ بدوش دوشیزہ! بھلا جنگلی گلاب اور لالہ صحرا گلچیں کی اصطلاحیں اور انداز کیا جانے اسے تو یہ خبر بھی نہ تھی کہ حسن کیا چیز ہے اور عشق کیا جذبہ ہے۔ دو تین

سال قبل ایک عجیب سی کیفیت اس کے تمام جسم میں محسوس ہوئی اور جیسے اس کے تمام جسم کا خون بدل گیا۔ گویا وہ پہلے کچھ اور تھی اور اب کچھ اور ہو گئی ہے۔ چند نادر احساسات اس کے تحت الشعور میں بیدار ہوئے۔ داخلی کیفیتوں کے ساتھ چند خارجی نشانیوں نے اس کے کان میں چپکے سے کچھ کہا، اسے اپنے وجود کا کچھ کچھ احساس ہوا۔ اب اس وقت اس بدتمیز راجپوت بچہ کی نازیبا حرکت نے پہلی مرتبہ اسے کسی غیر مرئی غیر مادی سے شے کی حفاظت کے لیے مادی حفاظت خود اختیاری کے جذبہ سے کہیں زیادہ شدت احساس کے ساتھ آشنا کر دیا۔ اور وہ اپنی ہستی سے گزر گئی۔ سخت لوہا نرم سونے کے مقابلے پر تن گیا، نہ معلوم کس جذبے کے تحت لکڑیوں کا گٹھا وہ گرا۔ اگنی بھڑک اٹھی۔

کلہاڑی کی گرفت پنجے میں مضبوط ہو گئی اور مارنے مرنے کا رنگ جم گیا۔ دہی کے دھوکے میں کپاس دبایا ہوا راجپوت بچہ جس نے کبھی شکست کا سین بھی نہ دیکھا تھا، ایک جنگلی بدوش بھک منگے کی چھوکری کے سامنے سے ہزیمت کھا کر مونچھیں چباتا، دانت پیستا، چٹیلے سانپ اور کٹی پتنگ کی طرح بل کھاتا ڈولتا، جنگل کی جانب چل دیا۔ برسوں بعد آج حکومت اور جوانی کا نشہ پہلی مرتبہ ہلکے سے خمار سے دوچار ہوا۔

☆☆☆

دوسرے دن بستی کے قریب مینڈھوں کا اکھاڑہ جمع ہوا، خبر سن کر دور دور کی خلقت جوق در جوق جمع ہونی شروع ہوئی۔ ہزاروں آدمیوں کے درمیان ہری گھاس کے فرش پر دونوں مینڈھے برسر مقابلہ آئے۔ ''چٹ چٹ چٹ..... چٹا چٹ۔ چٹ چٹ چٹا چٹ..... دھان آئیں، دھاں دھائیں، چٹ چٹ چٹا چٹ''۔ سینگوں سے چنگاریاں سی اڑیں..... پیچھے ہٹ ہٹ کر اور دوڑ دوڑ کر ٹکر ہوئی۔ اچھل اچھل کر اور دو پاؤں پر الف ہو ہو کر تصادم ہوا۔ جہاں تہاں کا زور لگا لگا کر اور گھٹنے ٹیک ٹیک کر نبرد آزمائی ہوئی۔ زلزلے کے وقت دو متحرک چٹانوں کے ٹکرانے کا اور کبھی پوری رفتار سے دوڑتی ہوئی دو ڈاک گاڑیوں کے انجنوں کے لڑ جانے کا سماں پیش نظر ہوا۔

ٹھاکر کے مینڈھے کو اُبھارنے اور ہمت بندھانے والی ساری خلقت تھی اور نقارہ خانہ میں طوطی کی صدا خانہ بدوش کی ٹٹکاریوں کی گونج بھی کبھی کبھی کانوں میں پڑ جاتی تھی۔ مجادلہ بحران پر پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ گز دو گز زمین پر اتوسا ہونے لگا۔ دونوں مینڈھوں کے سر سے خون جاری ہو رہا تھا۔ یک دم جہاں کا تہاں زور کرتے کرتے الگ ہو کر مینڈھے پیچھے میدان کے ایک کنارے پر اور دوسرا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا تو اپنے اپنے مالک کی ٹٹکاری پر بڑی تیزی سے جھپٹ کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔ ''چت دھڑائیں، دھائیں''۔ اور اس سہ ضربی قسم کی ٹکر کی تاب نہ لا کر ٹھاکر جی کا مینڈھا بھاگ کھڑا ہوا۔

اپنے ہر دل عزیز اور شکست نا آشنا مینڈھے کی ہار پر اگر مدمقابل کوئی برابر والا راجپوت یا پٹھان ہوتا تو ٹھاکر اور اس کے ندیموں اور ہمدردوں میں رنج و خفت کی لہر دوڑ جاتی، مگر ایک ادنیٰ کمزور آدمی کے مقابلے پر شکست ہوئی تھی۔ لہٰذا رنج و خفت کے بجائے ٹھاکر اور اس کے تمام ہمدردوں میں غصہ سوار ہو گیا اور وہ تو وہیں پر شاید ہنگامہ ہو جاتا، مگر کچھ ٹھاکر نے خود ہی اسے مناسب خیال نہ کیا اور اپنے جذبہ بہادری کے منافی سمجھا۔ اور نہ اس کے سمجھ دار ساتھیوں نے ہی مستحق خیال کیا کہ کھلے میدان شکست کے کھسیاہٹ میں خانہ بدوش کو کوئی سزا دی جائے۔ وہ سب کے سب بل کھا کر اور دانت پیس کر رہ گئے۔ بوڑھے کاشت کاروں نے ٹھاکر کے مینڈھے لڑانے کے فعل پر اعتراض کیا۔ نوجوان پارٹی کا مینڈھا اور بکرا

چھین لینے کو جی چاہا۔ ادھیڑ عمر کے تجربہ کاروں نے فوراً اسی وقت خانہ بدوش کو گاؤں کی حد سے باہر نکال دینے کی تجویز پیش کی۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ مجمع منتشر ہوتے ہی ہر ایک کے دل سے.....شکست غصہ اور جذبہ انتقام فرد ہو گیا، مگر ٹھاکر پچاس صدی کے ہارے ہوئے سے ہار کھا کر گھر کو ایسا آیا کہ جیسے اس پر آج بجلی گری ہے۔ اس کا جی دہاڑ مار کر رونے کو چاہتا تھا۔ بھلا بھک منگے منداری کا بٹیر سا مینڈھا اور ٹھاکر جی کے ہاتھی سے مینڈھے کو بھگا دے! ادھر کنور جی کے دل پر چھریاں سی چل رہی تھیں۔ ڈگڈگی بجا بجا کر چٹکی چٹکی مانگنے والے کی لونڈیا اور گھمنڈ سنگھ جیسے راجپوت پر کلہاڑی لے کر سیدھی وار جائے! پھر جس پر اس نے ہاتھ رکھا تھا، سر کر کے ہی چھوڑا تھا۔ بڑی بڑی چنچل چماریاں اور منہ زور پاسنیں تو ڈٹی نہیں گھڑی بھر۔ یہ کتنے بیچ میں بستی تھی بے چاری منداران! ویسے تو گاؤں کے اندر معمولی بات تھی۔ اور دیہاتی زمین داروں کا آئے دن کا مشغلہ اور بائیں ہاتھ کا کھیل کہ حکم دے دیتا تھا کہ پکڑ لاؤ، منداری اور مینڈھے دونوں کو اور باندھ دو چوپال کے نیم سے۔ اور ڈیرے سے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لانا کوئی بڑی بات تھی۔

ابھی اسی پچھلے پوس میں ہرجو آ چمار کی عورت پر کنور گھمنڈ سنگھ کی نظر پڑی۔ پہلے ڈورے ڈالے جب وہ ایسے ہاتھ نہ آئی تو جنگل میں اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ چمریا تھی خوب صورت اور ساتھ ہی ساتھ طبیعت کی کڑی۔ پردہ کر کے گھر میں بیٹھ رہی۔ کنور کو یوں دال گلتے نظر نہ آئی تو ایک روز دن دہاڑے گھر میں سے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لایا۔ اور دو دن مویشی خانہ والی اٹریا میں بند رکھا۔ جب ہرجو آ نے ٹھاکر جی کے سامنے اپنا استغاثہ گزارا تو انہوں نے ہزاروں گالیاں سب چماریوں کو دیں کہ ان کے بیٹے کا چال چلن خراب کیے دیتی ہیں اور ایسے قصے سال بھر میں دس پانچ ہو ہی جاتے تھے۔ جب کسی اکھڑ لونڈیا سے پالا پڑ جاتا تھا، مگر دونوں باپ بیٹا نہ معلوم کیوں اس وقت اپنی روایاتی حکومت کو اس یکہ و تنہا خانہ بدوش پر اس آزادی کے ساتھ استعمال کرتے جھجک محسوس کرتے تھے جیسا کہ وہ آئے دن بڑے خاندان اور بڑے دخیل کار کاشت کاروں کے درمیان استعمال کیا کرتے تھے۔ دونوں نے اپنی اپنی جگہ پر محسوس کیا کہ اب اس آسانی سے اس چیتھڑوں میں بسنے والے منداری کو طلب نہیں کر سکتے جس آسانی سے وہ اپنے گاؤں کے اچھے وسیع کھیتوں اور مکانوں کے مالک چمار، پاسی اور کاچھی گڈریوں کو مونچھ پکڑ کر بلوا لیتے ہیں۔ اب یہ پتہ نہیں کہ اس کا سبب آج کی ہزیمت تھی یا وہ ناتمام شکست جو نصف سو صدیوں سے خانہ بدوش نے تسلیم نہیں کی ہے۔

ستم اور حیلہ، حیلہ و ستم یوں بھی جنگجو قوموں کا طرہ امتیاز رہا ہے، پھر بگڑا سپاہی بہادری اور بزدلی میں اور مردانگی اور نامردی میں یوں بھی تمیز کرنے سے قاصر ہوتا ہے اور کھسیارے بھانڈ کی طرح دیوالی گاتا اور بگڑے شاعر کی طرح مرثیہ گوئی کرتا ہے اور ستم سے عاجز ہو کر صرف حیلہ ہی حیلہ پر اور کبھی رائے سے بے نیاز ہو کر خالی ہمت ہی ہمت پر عمل کر کے اپنی احمق بہادری کے شاعرانہ قصیدے پڑھتا ہے۔ لہٰذا اگر دونوں راجپوت بچے دن دہاڑے بیچ کھیت شکست کھا کر صرف حیلہ ہی حیلہ پر اپنے انتقام کا محل بنانے لگے تو کیا تعجب تھا۔ خون کے گھونٹ پینے کے بعد اس کا ردِ عمل ہوا اور وہ دونوں اپنی اپنی ایک ایک نئی ترکیب خانہ بدوش کے مینڈھے اور خانہ بدوش کی لڑکی کو شکست دینے کی سوچ کر چپ ہو گئے۔

☆☆☆

بھرا بھر برسات کی اندھیری باکھ والی رات، سناٹا! مینڈکوں اور جھینگروں کی آواز کا تسلسل اور تواتر! جیسے خاموشی کا جزرک رک کر چلتی ہوئی

ہلکی ہلکی پروائی کے نم جھونکے تاریکی کی بوجھل لہریں معلوم ہوتے ہوئے اور ہر جھونکا جیسے فضا کی سیاہیوں کو تاریک تر کرتا ہوا گرمی، نمی اور سیاہی سے تمام فضا کثیف!..... بھانت بھانت کی گھاس اور مٹی کی خوشبوؤں سے ہوا بھری ہوئی نیچے زمین سبزہ اور کیچڑ سے سیاہ! اوپر آسمان کالے کالے بادلوں سے اندھیرا!..... تاریکیاں ہی تاریکیاں!..... جیسے آسمان سے مہیب تاریکیوں کا مینہ برس رہا ہے۔ بحر ظلمات طغیانیوں پر ہے اور ساری کائنات تاریکیوں کے تھپیڑوں میں گم ہے۔

پہلی نیند کی جمود نما بے ہوشی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے وہ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کے ارادے سے قطعاً ناواقف اپنی اپنی شکست گاہ سے اسکیم بنا کر رات کی کالی چادر کی آڑ میں انتقام لینے چلے۔ بہ الفاظ دیگر راجپوت خون روز روشن میں شکست کھا کر اپنی اصل کی جانب پلٹ پڑا اور شب خون مارنے چلا۔ خانہ بدوش فطرت کی وسیع اور کالی کالی آغوش میں محو خواب تھا۔ تازہ ہوا، خالص پانی اور روشن فضا کے سوا مادی دنیا کے بہت سے احسانوں سے بے نیاز..... اس کا سر کنڈوں اور چیتھڑوں کا گھر، اس کا سیاہ ریچھ اس کا لوہیا مینڈھا حتیٰ کہ اس کا روپیلا بکرا اور سنہری بیٹی سب کچھ تاریکی میں حل تھے۔

دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کے ارادے سے ناواقف یکے بعد دیگرے چل دیئے پہلے ٹھاکر ایک فقیر کے نوجوان مضبوط اور دلیر لڑکے کو ساتھ لے کر روانہ ہوا، کیونکہ آج کی خدمت ہی کچھ ایسی تھی۔ خود دیہاتی گوشت خود ہندو خصوصاً ٹھاکر فقیروں سے لیتے ہیں، لہٰذا ٹھاکر نے اس تمام کام میں شروع ہی سے نوجوان فقیر کو مع اس کی ذبح کرنے والی مکھن پور کی چھری شریک رکھا۔ ایک صافی میں لپٹی ہوئی چھری بغل میں دبائے فقیر کے کان سے اونچی لاٹھی باندھے ٹھاکر دبے پاؤں دونوں ڈیرے کے قریب پہنچے۔ ریچھ یوں تو خلقی طور پر اندھا سا ہوتا ہے پھر تمام دن ڈنڈے کے بل پر ناچا ہوا، اندھیری رات کی ٹھنڈ میں مرا سا پڑا سوتا رہتا ہے۔ بکرا صبح سے شام تک ایک ٹانگ پر ٹنگے ٹنگے ویسے ہی سست پڑ جاتا ہے اور پھر خصی بکرا یوں بھی نیند کا متوالا ہوتا ہے۔ اپنے تھان پر چپ چاپ پڑا رہا جیسے سانپ سونگھ گیا ہے اور بحر ظلمات کی خاموش لہروں پر تیرتا ٹھاکر سیدھا مینڈھے کے تھان پر جا لگا، نہایت آہستہ آہستہ مینڈھے کے گلے کی مخصوص گھنٹی بجی جس سے اکھاڑے میں لڑائی کے وقت ٹھاکر کے کان خوب آشنا ہو گئے تھے۔ اسے سن کر انتقام کی آگ نے اس کے ٹھنڈے خون میں اُبال سا پیدا کر دیا وہ چل پڑے، تینوں ایک رفتار سے ٹھاکر برابر میں فقیر اور ان کے پیچھے پیچھے مینڈھا اپنی فطرت عادت کے مطابق نیچے کو سر جھکائے جھومتا جھومتا ہر حس سے بے نیاز بجز ٹھاکر کے قدموں کی حرکت کی پیروی کے، ٹھاکر ایک ہاتھ میں رسی پکڑے دوسرے ہاتھ سے کندھے پر ٹکی ہوئی لاٹھی کو سہارا دیئے اور فقیر ایک ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے دوسری بغل میں چھری دبائے، مینڈھے کو لیے تیز تیز بستی کی جانب چلے جا رہے تھے۔

ادھر چند ہی منٹ بعد گھمنڈ سنگھ دو تجربہ کار اور کارکردہ پاسیوں کو ساتھ لیے ڈیرے کے پیچھے والے دروازے پر پہنچ گئے۔ جاگتے ہی میں سوتی اور فرزنگی میں متوالی دن بھر کی تھکی ہاری اگنی محو خواب تھی۔ جوانی، تندرستی، حسن، محنت اور آزادی کے نشوں پر نیند کا نشہ شراب دو آتشہ بن کر چڑھا ہوا سونے پر سہاگا تھا۔ وہ تینوں تو خیر بہت دبے پاؤں ڈیرے میں داخل ہوئے، اگر اس وقت ڈھول بھی پیٹے جاتے تو بھی اگنی پر سے نیند کی دھند نہ اترتی چارپائی کا ہیولا قسم کی چیز نہایت سبک دستی سے ہاتھوں ہاتھ اُٹھالی گئی اور اگنی کو مطلق احساس نہ ہوا کہ اس کا سیج اُڑن کھٹولا بن گئی ہے۔

وہ خانہ بدوش کے ہیرے کو لے کر نہایت تیزی سے اڑے چلے جا رہے تھے اور بے باک و آزاد خانہ بدوش اپنے ہاتھ پاؤں اور ضمیر کا مختار، اپنے مینڈھے، بکرے، ریچھ اور اپنی اگنی کا تنہا بلا شریک و سہیم مالک، اپنے فولادی مینڈھے اور سیمیں بیٹی کی چوریوں سے لاعلم نیند کی سنگین لہروں تلے دبا پڑا تھا۔ اپنے مضبوط و آزاد آہنی اعصاب کی لچک ولہر بائیت اور اپنی بہادر فولادی فطرت کی لپک اور صلابت ہر چیز نیند کی چٹان سے دبائے ہوئے۔

نشہ انتقام اور نشہ حکومت، نشہ حیوانی مینڈھے اور اگنی کو نہایت استقامت اور سرعت کے ساتھ اپنے اپنے راستے بہائے لیے چلے گئے۔ اور ناہر سنگھ اور گھمنڈ سنگھ اپنا اپنا مال مسروقہ لے کر اپنی اپنی شکست گاہوں میں داخل ہوئے جن کا کمپاؤنڈ تو ایک تھا، مگر رُخ اور راستے دو تھے۔ ایک بڑی دو رُخی عمارت کے دو حصے شمال رویہ چوپال اور اس کا ایک دروازہ بیٹے کے استعمال میں تھا اور جنوب رُخ کی چوپال اور دروازہ باپ کے تصرف میں۔

کمپاؤنڈ میں اندھیرا تھا۔ ٹھاکر نے مینڈھے کی رسی فقیر کے ہاتھ میں دی اور پھاٹک کے بلند کواڑ میں بنی ہوئی کھڑکی میں سے اندر داخل ہو کر بھاری پھاٹک کھولا اور آگے پیچھے فقیر اور اس کے پیچھے مینڈھا چبوترے پر چڑھ کر سامنے والے دالان کی بغلی کوٹھڑی کی جانب بڑھے جس میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ ادھر چند ہی ساعت کے تفاوت کے کنور گھمنڈ سنگھ خوش و خرم اپنے پھاٹک میں داخل ہوا، کوٹھڑی کا دروازہ ٹھاکر نے کھولا، فقیر نے مینڈھا ذبح کرنے کے لیے بغل سے چھری نکالی..... ہڑ دم، ہڑ دم، ہڑ دم، اڑ اڑا دوں..... ارے یہ مینڈھا!!..... مینڈھا.....!!! یا دو ٹانگوں پر کھڑا ہوا ریچھ!!؟..... اور ان دونوں نے اپنے درمیان دہاڑے ہوئے ریچھ کو سینہ تانے ہاتھ پھیلائے کھڑا پایا۔ متعجب و بدحواس مونہوں سے یک دم اللہ اکبر اور رام رام نکلا۔ ٹھاکر ناہر سنگھ ساری چوکڑی بھول گئے اور ان کی کان سے اونچی شیام دار لاٹھی ہاتھ سے چھوٹ پڑی اور بجائے مینڈھے کے ریچھ کی یہ موٹی بالوں دار گردن اور پورا کھلا خوف ناک منہ..... اسے ذبح کرنے تو درکنار ٹھاکر کو خود اپنا ذبیحہ نظر آنے لگا۔ مکھن پور کی چھری کانپ کر گر گئی۔ اس خلقی اندھے جانور کی فطرت کی جانب سے اس کی باصرہ کا بدل اس کی غیر معمولی ذکی الحس جبلت سے پورا ہوتا ہے۔ یہ رنگ محفل دیکھ کر ریچھ سمجھ گیا کہ قضا سر پر کھیل رہی ہے اور جس جنس نے جنگل سے پکڑ کر گھر میں لا کر بٹیا بنا کر پال پوس کر اتنا بڑا کیا، وہ آج قتل کے درپے ہے، اسے بنی نوع انسان سے محبت کرنی سکھائی گئی تھی؟ اس کے دل میں تو انسانی عظمت ڈالی گئی تھی۔ وہ تو کالا ریچھ تھا، ہمالیہ کا کوئی خون خوار ریچھ کب تھا..... مگر مرتا کیا نہ کرتا..... ٹھاکر کی خون خوار آنکھیں اور فقیر کی چمک دار چھری کی مدافعت میں آج اسے یہ نمک حرامی بھی کرنی پڑی کہ سیدھے ہاتھ کا ایک لپوٹا ٹھاکر جی کے اُٹھے ہوئے گل مچھوں پر اور اُلٹے کا ایک تھپڑ میاں صاحب کی چڑھی ہوئی ڈاڑھی پر رسید کیا اور دونوں رخساروں پر سے آدھ آدھ پاؤ بوٹی نوچ کر راہِ فرار اختیار کر لی۔

☆☆☆

اِدھر ٹھاکر اور فقیر ریچھ کی رسی لیے پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے، اُدھر تیز رفتار اور تیز جذبات کنور گھمنڈ سنگھ اور اس کے پاسیوں نے اگنی کی چارپائی اس کے حجلہ عروسی میں داخل کر دی تھی، دونوں پاسی باہر چلے گئے۔ کنور نے اس سونے کی چڑیا کو اپنے دام میں بھرپور پھنسا پا کر اطمینان کا سانس لیا۔ نہایت آہستہ سے اندر سے کوٹھڑی کی زنجیر لگائی اور برابر کی کھڑکی کھولی۔ فتنہ خوابیدہ کروٹیں تو کواڑوں کے کھٹکے ہی پر بدلنے لگا تھا۔ چمپئی رخسار پر کنور کے ہونٹوں کے پہلے لمس نے محشر خاموش بیدار کر دیا اور اگنی کے اعصاب جن کی تعمیر کنور کے کھیتوں کے اُگے ہوئے مغلوج کن غلے سے

نہیں ہوئی تھی۔ اس لمس میں مجسم ترنگ بن گئے اور کچھ مشینی قسم کی حرکت میں ایک گھونسا راج کنور گھمنڈ سنگھ کی شدت جذبات اور احساس برتری میں پھولے ہوئے نتھنوں والی ناک اور چڑھے ہوئے ہونٹوں والے دہن پر پڑا جس سے گویا دانت تو حلق میں جا پڑے اور نتھنے رخساروں سے آملے اور بس جیسے اس کے ردِ عمل میں تو دہ بارود مشتعل ہو کر متحرک شعلے کی رفتار سے چلا کہ وہ کھڑکی میں سے دس بارہ فیٹ کی بلندی سے جست کرتی نیچے دکھائی دی اور دو زقندوں میں کمپاؤنڈ کی دیوار لے لی۔ ایک پاؤں دیوار سے ملحق چرنی پر ٹیک کر منڈیر پر اور ایک جست میں منڈیر سے نیچے باہر جا گری۔ اِدھر ریچھ اپنی فکر و استعداد کے مطابق کوٹھڑی سے بھاگ کر بجائے پھاٹک کی طرف جانے کے کمپاؤنڈ کی دیوار سے ملحق کھڑے ہوئے نیم چڑھا اور نیم کی کسی بلند باہر نکلی ہوئی شاخ سے کمپاؤنڈ کے باہر پھاندا.....ادھر اگنی دیوار سے نیچے گری، ادھر ریچھ نیم سے کودا۔ اور بیک وقت دونوں آگے پیچھے ہری ہری گھاس اور شبنم سے بھیگے ہوئے راستے پر چلتے دکھائی دیئے۔ اگنی اپنی مخصوص اصطلاح میں ریچھ کو پچکارتی ہوئی اور گویا پوچھتی ہوئی کہ تجھ پر کیا گزری!".....اور ریچھ اپنی مالکہ کو پہچان کر اس کے پیچھے آہستہ آہستہ "خوں، خوں خواں خوں"۔ کر کے گویا شکائتی انداز میں کہتا ہوا "واہ آدمی! آدمی تو بڑے اچھے ہوتے ہیں، روٹی کھلاتے ہیں، دودھ پلاتے ہیں، شہد چٹاتے ہیں۔ ترکاری اور پھل کھلاتے ہیں۔ "خوں۔ خوں خاؤں خاؤں خواں خوں"۔ یہ چھری مارنے والے بھی تیرے بھائی بند ہوتے ہیں!.....آدمی چھری بھی مارا کرتے ہیں!!.....آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں؟"

اور اگنی اپنے ریچھ کے آگے آگے رواں دواں چلی جا رہی تھی۔ شب خون مارنے والوں کی طرح دونوں چند منٹ تک کالی رات کا دامن چیرنے کے بعد اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ اگنی اپنے خیمے میں داخل ہوئی اور ریچھ سیدھا اپنے تھان پر پہنچا، جہاں مینڈھا بندھا ہوا تھا۔ مینڈھے کے قریب پہنچ کر ریچھ کا لہجہ بدل گیا۔ شکایت میں قدرے درشتی پیدا ہوگئی۔ "خوں خوں خوں عاؤں عاؤں عاں..... ہوم۔ ہوم۔ ہوم۔ ہام"..... گویا مینڈھے سے کہہ رہا تھا جاؤ جاؤ جاؤ.....اپنی جگہ پر جاؤ..... مالک نے مفت میں تمہارے تھان پر باندھ کر مجھ پر مصیبت نازل کرائی.....اور تمہاری گھنٹی میرے گلے میں باندھ دی۔ ہوں، ہوں.....ہوں تم پر تو روز ایسی ہی گزرتی ہوگی تم نے آج میری جگہ لے کر اپنی آفت میرے سر باندھی۔ خوں خوں خوں۔ اور لہجہ نرم ہوتا گیا، شکایت میں بجائے درشتی کے اپنائیت پیدا ہوتی گئی اور آہستہ سے "میں، میں" کر کے مینڈھا کھڑا ہو گیا۔ اور نیچے کو گردن جھکا کر اور سر کو آگے بڑھا کر گویا ریچھ کی شکایتوں کو سر آنکھوں پر لیا ہو۔ ریچھ کھونٹا ٹٹول کر اس کی رسی کھولنے لگا۔ دونوں میں سے کوئی بھی مالک کے تھان تبدیل کرنے میں مصلحت کو بغیر سمجھے اپنے اپنے تھان پر پہنچ گئے۔ اگنی بکرے کی جھول بچھا کر سو گئی۔ اور خانہ بدوش بدستور خراٹے لیتا رہا۔

مدھیانور کی عفریت

مدھیانور ایک چھوٹے سے گاؤں کا نام ہے جو اسی زرخیز وادی کے جنوب مشرق گوشے میں واقع ہے، جو دریائے مویار کے شمال اور نیل گری کی پہاڑیوں کے جنوب میں واقع ہے۔ اسی گاؤں میں تھوڑا آگے چل کر نیل گری کی پہاڑیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔

یہ چھوٹی سی زرخیز اور شاداب وادی روئے زمین پر کسی خطہ بہشت سے کم نہیں۔ زندگی کی گہما گہمی اور کشمکش سے گھبرا کر کسی ایسی ہی وادی میں پناہ لینے کو جی چاہتا ہے۔ گردونواح میں پہاڑیوں کے بلند سلسلوں کے سبب یہاں سال میں خاصی بارش ہوتی ہے۔ یہاں کی مٹی بہت زرخیز ہے۔ کچھ عرصہ پہلے یہاں جنگل ہی جنگل تھے مگر تہذیب کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ ساتھ جنگلاتی رقبہ کم ہوتا گیا اور لوگ مناسب جگہوں پر مکان بنا کر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ یہاں کی آب وہوا دن کے وقت گرم مگر رات کے وقت پہاڑوں کی سمت سے آنے والی سرد ہوا کے سبب خنک ہو جاتی ہے۔

مدھیانور کے زیادہ تر لوگ کسان ہیں، اگرچہ کچھ لوگوں نے مویشی بھی پال رکھے ہیں۔ یہ لوگ دن کے وقت اپنے مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ جنگل میں چرنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان مویشیوں کے دودھ سے گھی بنایا جاتا ہے جسے یہ لوگ ڈبوں میں بند کر کے اور چھکڑوں پر لاد کے طویل مسافت کے بعد شہروں میں لے جا کر فروخت کرتے ہیں، چونکہ مدھیانور کا گھی بالکل خالص ہوتا ہے، لہٰذا شہروں میں اس کی بڑی مانگ ہے۔ وہاں کے لوگ خاصے خوشحال ہیں اور پُرمسرت زندگی بسر کرتے ہیں۔ اچھی سڑک کی عدم موجودگی کے سبب بہت کم اجنبی اس وادی کا رُخ کرتے ہیں۔

ان مویشیوں میں سے کبھی کبھار کوئی چیتا یا شیر ایک آدھ مویشی اُٹھا لے جاتا ہے۔ اس کے علاوہ رات کے وقت اگر کوئی ہاتھی یا سور اِدھر آ جائے تو کھڑی فصلوں کا نقصان بھی کر جاتا ہے لیکن وہاں کے لوگ انہیں چھوٹا موٹا نقصان تصور کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ایسا نقصان لاعلاج ہے۔ لہٰذا وہ اس کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔

اس چیتے کو ''بڑا چیتا'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ عام چیتوں کی نسبت وہ جسمانی لحاظ سے بڑا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ دریائے مویار کو عبور کر کے نیل گری کی پہاڑیوں سے آیا تھا۔ اس نے آتے ہی گاؤں کے مویشیوں کو فراخ دلی سے شکار بنانا شروع کر دیا۔ وہ شیر جیسے انداز میں اپنے شکار کی گردن توڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ شروع شروع میں لوگوں کا یہی خیال تھا کہ کسی چیتے کی بجائے کوئی شیر اس علاقے میں آ گھسا تھا۔

پھر اس چیتے نے بڑی بہادری سے کام لے کر میرے دوست ہگ ہیل سٹون کی جاگیر پر حملہ کرنا شروع کر دیا اور ان کی دو تین بہترین نسل کی گائیں لے اُڑا۔ ہگ ہیل سٹون کی جاگیر اس وادی کے وسط میں ہے اور میں اسے دنیا کی بہترین جاگیروں میں شمار کرتا ہوں۔ مسٹر ہگ ہیل سٹون ایک بہترین ''انجینئر'' ایک عمدہ ''موجد'' اور ایک نامور ''شکاری'' بھی ہیں۔ جنگل صاف کر کے اپنی جاگیر کو جنم دینے اور اسے خوب صورت بنانے

میں انہوں نے جس قدر محنت کی ہے۔ بہت کم لوگ اس کے متحمل ہو سکتے ہیں۔

مسٹر ہگ اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر دوسرے ملکوں میں جاتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات انہیں کئی ماہ وہاں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ مندرجہ ذیل کہانی کا تعلق ان دنوں سے ہے جب وہ ایک طویل عرصے کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ جاتی دفعہ انہوں نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میں ان کی جاگیر کی دیکھ بھال کرتا رہوں۔ ایک دن اچانک مجھے مسٹر ہگ کے نگران کا خط ملا جس میں اس نے چیتے کی تباہ کاریوں کا ذکر کر رکھا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ اس نے میرے دوست کی دو تین بہترین نسل کی گائیں ہضم کر لی تھیں۔ خط پڑھتے ہی میں نے چیتے سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان دنوں میں نہایت ضروری کاموں میں اُلجھا ہوا تھا اور اگلے دو ہفتوں تک فرصت کی کوئی اُمید نہ تھی۔ مسٹر ہگ کے نگران کے خط کو مجھ تک پہنچنے میں پہلے ہی چھ دن لگے تھے۔ اس صورت حال میں میرا لڑکا ڈونلڈ میرے کام آیا اور اس نے چیتے سے نمٹنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ میں نے بھی خوشی خوشی ہر فرض اسے تفویض کر دیا، لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ ڈونلڈ کس طرح مدھیانور تک پہنچے۔ میری کار کا ایک اہم پرزہ ٹوٹ چکا تھا اور میرے خط کے جواب میں متعلقہ کمپنی نے ابھی تک وہ پرزہ بمبئی سے روانہ نہیں کیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اس جگہ سے اگر ڈونلڈ اپنی داستان خود ہی بیان کرے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ کیونکہ یہاں سے آگے میں نے داستان میں مزید حصہ نہیں لیا تھا۔ ماسوا ڈونلڈ کو چند نصیحتیں کرنے کے۔

☆☆☆

"جب والد صاحب نے مجھے مدھیانور جانے کی اجازت دے دی تو سب سے پہلا مسئلہ سفر کے لیے کار مہیا کرنی تھی۔ اچانک مجھے اپنے دوست رستم کا خیال آیا۔ جس کے پاس دو تین کاریں تھیں۔ لہٰذا تھوڑی سی ترغیب کے بعد میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے پر رضامند کر لیا۔ سفر کے لیے تیاری کرنے میں مجھے تین چار گھنٹے لگے۔ جاتی دفعہ میں نے والد صاحب کا ایک تعویز بھی..... اپنے ساتھ لے لیا۔ یہ تعویز انہیں ایک فقیر نے دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر وہ شکار پر جاتے وقت اپنے پاس رکھیں تو کسی جنگلی درندے سے نقصان نہ اُٹھائیں گے۔ والد صاحب اس تعویز کا کسی کے سامنے ذکر نہیں کیا کرتے تھے، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ لوگ ان کا مذاق اُڑائیں گے لیکن میں جانتا ہوں کہ انہیں اس پر بہت اعتقاد ہے اور شکار پر جاتے وقت اسے ہمیشہ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

سفر پر روانہ ہونے سے پہلے مجھے اپنے ایک دوسرے دوست کا خیال آ گیا۔ اس کا نام میڈرک بون ہے۔ وہ بڑا اچھا فوٹو گرافر اور ایک عمدہ شکاری بھی ہے۔ میڈرک سے پوچھا تو وہ بھی ہمارے ساتھ چلنے کو تیار تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم تینوں مدھیانور کے راستے پر رواں تھے۔ میرے پاس میری 423 ماؤزر رائفل تھی، جو 405 مانچسٹر رائفل سے کہیں زیادہ برتر ہے۔ موخر الذکر رائفل میرے والد صاحب کے پاس ہے اور وہ جانتے ہیں کہ میری رائفل ان سے برتر ہے۔ اس کے باوجود روایت پسند ہونے کے سبب وہ اپنی پرانی رائفل کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ 423 ماؤزر کے علاوہ میں اپنی 03006 سپرنگ فیلڈ رائفل بھی اپنے ہمراہ احتیاطاً لے گیا تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے والد صاحب نے یہ بھی نصیحت کی تھی کہ میں ہرن وغیرہ کے شکار سے احتراز کروں۔ میں ان کی نصیحتیں سن لیا کرتا ہوں مگر ان پر عمل کرنا میرے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔

مدھیانور کی آخری 17 میل کی مسافت واقعی بے حد تکلیف دہ تھی۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں پورے آٹھ گھنٹے لگے۔ مسٹر ہگ کی جاگیر کے نگران مسٹر ورگیس نے خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ یہ الگ بات کہ والد صاحب کے نہ آنے پر وہ قدرے مایوس ہوا تھا۔ نوجوانوں کے سلسلے میں بڑی دقت یہ ہے کہ انہیں ذمہ دار تصور نہیں کیا جاتا اور پرانی نسل کے لوگ ان پر اعتبار نہیں کرتے مگر وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ کسی زمانے میں وہ بھی جوان ہوا کرتے تھے۔

مسٹر ورگیس نے ہمیں بتایا کہ گزشتہ تین روز میں چیتے نے گاؤں کے چند مویشیوں کے علاوہ مسٹر ہگ کی ایک عمدہ نسل کی گائے بھی ہلاک کر دی تھی۔ سب سے فوری مسئلہ یہ تھا کہ چند نوجوان بچھڑے خریدے جائیں۔ اس معاملے میں رستم نے میری مدد کی۔ اس نے اپنی جیب سے چند نوجوان بچھڑے خریدے جنہیں ہم نے ان مختلف جگہوں پر باندھ دیا جہاں چیتے نے مویشی ہلاک کیے تھے۔ ان میں سے پہلا بچھڑا مسٹر ہیل سٹون کی جاگیر اور جنگل کی سرحد کے ساتھ باندھا گیا۔ دوسرا بچھڑا نصف میل پرے ایک ایسی جھیل کے کنارے، جس کے چاروں طرف گھنے بانسوں کا جنگل تھا۔ تیسرا بچھڑا مدھیانور گاؤں کے قریب اور چوتھا بچھڑا اس راستے پر جو مدھیانور کی طرف آتا تھا۔ اپنے ہمراہ والد صاحب کی مچان نہ لایا تھا کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ مسٹر ہیل سٹون کی جاگیر پر مجھے ان کی مچان مل سکے گی۔ میرا منصوبہ تھا کہ جونہی کوئی بچھڑا ہلاک ہو جائے، اسی کے قریب درخت پر مچان لگا کر بیٹھ جاؤں۔

ہم نے چاروں بچھڑوں کو زمین پر کھونٹے گاڑ کر اس کی پچھلی ایک ایک ٹانگ رسوں سے باندھ دی تھی۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ ایسے بیل یا بچھڑوں کی گردن میں رسہ باندھنا سخت غلطی ہوتی ہے۔ بعض اوقات چیتا اور خصوصاً شیر، ایسے جانور پر حملہ نہیں کرتا۔ یہ درندے اپنے شکار کی گردن پر حملہ کرتے ہیں اور بعض اوقات ان کی گردن میں رسہ دیکھ کر انہیں شک پڑ جاتا ہے کہیں انہیں پھانسنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا ہو۔

شام کے وقت ورگیس نے ہمیں بتایا کہ وہ گزشتہ دو راتوں سے بنگلے کے گرد و نواح میں ایک شیر کی آواز سن رہا تھا۔ لہٰذا جلدی سے میں نے بنگلے کے قریب والے بچھڑے کے پاؤں سے رسہ کھول کر وہاں لوہے کی زنجیر باندھ دی، ایسا میں نے اس خیال کے تحت کیا تھا کہ اگر شیر رات کے وقت بنگلے کے قریب والے بچھڑے کو ہلاک کر دے تو زنجیر کے سبب اسے اُٹھا کر نہ لے جا سکے۔ چونکہ جاگیر میں اور کوئی زنجیر موجود نہ تھی، لہٰذا میں نے باقی تینوں بچھڑے رسوں ہی سے بندھے رہنے دیئے۔

رستم اس رات مدھیانور کے گرد و نواح کے کھیتوں میں سور کا شکار کھیلنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا، کیونکہ گولی کی آواز نے چیتے کو ہراساں کر کے بھگا دینا تھا۔ اگلی صبح معائنہ کرنے پر چاروں بچھڑے زندہ ملے جس پر ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ والد صاحب نے مجھے سکھا رکھا تھا کہ شکار کو بڑے صبر اور تحمل کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا میں نے رستم کو سمجھایا کہ وہ صبر سے کام لے اور آئندہ ایک دو روز تک چیتے کو ہلاک کرنے کے سلسلے میں کسی قسم کی امید نہ رکھے۔ تیسری رات چیتے نے وہ بچھڑا ہلاک کر دیا جسے ہم نے جنگل کے قریب باندھا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اتفاق بھی ہوا کہ شیر نے اسی رات وہ بچھڑا بھی ہلاک کر دیا جو جھیل کے قریب بانس کے درختوں کے اندر باندھا گیا تھا۔

اب مجھے ایک عجب مسئلہ درپیش تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ”چیتے کو دفعہ کرو۔ پہلے شیر سے نمٹنا چاہیے“۔ لیکن دوسرے حالات پر

غور کرنا ضروری تھا۔ رستم نے مجھے یاد دلایا کہ میں مدھیا نور والوں کو صرف اس چیتے سے نجات دلانے آیا ہوں جوان کے اور مسٹر ہگ سٹون کے مویشیوں کے لیے مسلسل ایک خطرہ بن گیا تھا۔ اس کے برعکس شیر تو اتفاقاً اِدھر چلا آیا اور بچھڑے کو دیکھ کر اپنا شکار بنالیا تھا۔ لہٰذا میرا فرض تھا کہ میں پہلے چیتے سے نمٹوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور اس کی جگہ والد صاحب بھی ہوتے تو وہ بھی یہی کہتے۔ شیر پر گولی چلانے کا موقع ہاتھ سے کھونے کو جی نہ چاہتا تھا۔ میں نے ہر طرح رستم کو ترغیب دی کہ وہ چیتے کے انتظار میں بیٹھے مگر وہ اس بات پر اڑا رہا چونکہ مجھے چیتے کو ہلاک کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لہٰذا اس سے نمٹنا میرا فرض تھا۔ آخر صورتِ حال کے پیش نظر مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

میں نے مسٹر ہیل سٹون کی مچان لی اور شام سے پہلے مردہ بچھڑے سے تقریباً تیس گز دور ایک درخت پر اسے باندھ دیا۔ دوسرے مردہ بچھڑے کے قریب درخت پر مچان تیار کرانے کے لیے رستم کو دیہاتیوں کی مدد لینی پڑی۔ میں یہ بات درج کرنا بھول گیا تھا۔ بچھڑوں کو باندھتے وقت ہم نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ ان کے قریب کوئی نہ کوئی درخت ضرور ہوتا کہ بعد میں مچان تیار کرنے کے لیے ہمیں کوئی دقت نہ اُٹھانی پڑے۔ دونوں پارٹیاں شام کے چار بجے بنگلے سے روانہ ہو پڑیں۔ رستم کو زیادہ فاصلہ طے کرنا تھا۔ لہٰذا وہ مسٹر ورگیس کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ رات بسر کرنے کے لیے اس نے ضروری اشیاء مثلاً سینڈوچ، بسکٹ، پانی کی بوتل، ٹارچ اور مفلر وغیرہ لے لیے تھے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میڈرک اور میں بھی اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔

کسی مچان پر بیٹھنا ایک بیزار کن کام ہے اور میرے لیے اس پر خاموش رہنا انتہائی مشکل ہے۔ والد صاحب مجھے کئی مرتبہ بتا چکے ہیں کہ مچان پر بے حس و حرکت ایک بت کی طرح بیٹھے رہنا بے حد ضروری ہے۔ وہ ایسا کس طرح کرتے ہیں، میں نہیں جانتا۔ میں ان کے ہمراہ کئی دفعہ مچانوں پر بیٹھا ہوں۔ وہ اپنی ٹانگیں تہ کر کے اپنے نیچے کر لیتے ہیں پھر تھرمس میں سے چائے وغیرہ پیتے ہیں اور پھر باقی رات کے لیے بت بن جاتے ہیں، لیکن ایسی صورتِ حال میں مجھے بے چینی سی لگی رہتی ہے۔ میرے پاؤں اور ٹانگوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔ میری پشت اکڑ کر درد کرنے لگتی ہے اور مچھر میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ مجھے فقط کاٹتے ہی نہیں بلکہ میرے کانوں اور نتھنوں میں گھس جاتے ہیں۔ ان سے نجات پانے کا یہی طریقہ ہے کہ جونہی وہ پاؤں وغیرہ پر بیٹھیں انہیں ہاتھ مار کر ہلاک کر دیا جائے، لیکن والد صاحب نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ مچان پر ایسی حرکت ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن شاید وہ یہی بات بھول جاتے ہیں کہ ان کے پرانے اور گندے خون کی نسبت مچھروں کو میرا تازہ خون زیادہ لذیذ محسوس ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ہمارے بزرگوں کو ہمیں نصیحت وغیرہ کرنے میں کس قدر مزہ آتا ہے۔

سات بج چکے تھے اور اس دوران مچھروں نے میڈرک اور مجھ پر اپنی کارروائی شروع کر دی تھی۔ میں نے میڈرک کو پہلے ہی ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ مچھروں کو مارنے کی کوشش نہ کرے۔ یہی بات تھی کہ جب کبھی میں کسی مچھر کو مارتا تو وہ میرے پہلو میں کہنی چبھو دیتا۔ وقت گزرتا گیا اور پھر آٹھ بجے کے قریب ایک لمبی سی چیز جو اندھیرے میں خاکستری دکھائی دیتی تھی، نہ جانے کہاں سے نمودار ہو گئی۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ وہ چاندنی رات نہ تھی مگر ہر طرف ستاروں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور شاید آپ اس حقیقت سے واقف نہ ہوں کہ جنگل میں ستاروں کی روشنی زیادہ چمکیلی ہوتی ہے، اس روشنی میں میں درختوں اور اس چیز کو دیکھ سکتا تھا۔ لیکن مردہ بچھڑا مجھے دکھائی نہ دیتا تھا کیونکہ اس کا رنگ کالا تھا۔ وہ خاکستری سایہ حرکت

کرتا ہوا اس طرف آیا جدھر مردہ بچھڑا پڑا تھا۔ پھر مجھے بچھڑے کے پاؤں میں بندھی ہوئی زنجیر کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد گوشت کھانے ہڈیاں ٹوٹنے کی مدھم آوازیں خاموشی میں ابھرنے لگیں۔ میں آہستہ سے رائفل کو کندھے تک لایا مگر بدقسمتی سے میری ٹارچ جو رائفل کی نالی کے ساتھ نصب تھی، اچانک درخت کی ایک بڑی شاخ کے ساتھ ٹکرا گئی اور فضا میں ہلکا سا شور ابھرا۔ اس شور پر بچھڑے کی طرف سے ایک بلند غراہٹ سنائی دی اور وہ خاکستری سیاہ وجود میری بائیں جانب جنگل میں حرکت کرنے لگا۔ دوسرے لمحے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دس منٹ بعد وہ دوبارہ نمودار ہوا۔ مگر اس دفعہ میری بائیں جانب اور میرے عین نیچے۔ پھر مجھے چاٹنے کی آواز سنائی دی اور چیتا کتے کی طرح بچھڑے کے قریب اپنی اگلی ٹانگیں آگے کی سمت پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اس دفعہ میں نے رائفل بڑی احتیاط سے اُٹھائی اور ٹارچ کا بٹن دبا دیا۔ ٹارچ کی روشنی عین چیتے کے اوپر پڑی جو مجھ سے بیس گز دور پیٹ کے بل بیٹھا تھا۔ پھر میں نے رائفل کا گھوڑا دبا دیا اور 423 دندناتی اُٹھی۔ چیتا اپنے ایک پہلو میں گر پڑا۔ میرا خیال تھا کہ اس کا کام تمام ہو چکا تھا مگر اچانک وہ تیزی سے اُٹھا اور چھلانگ لگا کر جنگل میں غائب ہو گیا۔

یہ سارا وقت میڈرک بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ جونہی چیتا نظر سے اوجھل ہوا وہ درخت پر سے چھلانگ لگانے کی تیاری کرنے لگا مگر میں نے اسے روک لیا۔ میرے کان میں وہ سرگوشی کرنے لگا۔ ''آؤ اس کے پیچھے چلیں''۔ لیکن میں نے اسے بتایا کہ احمق بننے سے کوئی فائدہ نہیں اور اسے چیتے کا تعاقب کرنے کے لیے صبح کا انتظار کرنا پڑے گا۔

ہم مزید ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھے رہے پھر مچھر اس قدر ناقابلِ برداشت ہو گئے کہ ہم نے واپس بنگلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں پہلے اترا اور میڈرک نے مجھے میری رائفل پکڑا دی۔ رائفل پکڑانے کے بعد میڈرک اترنے لگا۔ جب چھ فٹ رہ گئے تو اس نے درخت سے چھلانگ لگا دی۔ جونہی وہ مدھم سے زمین پر گرا، ہمیں اپنے قریب سے ایک گرج سنائی دی، میں جلدی سے مڑا اور ٹارچ روشن کر کے رائفل کا منہ آواز کی طرف کر دیا لیکن ہمیں کچھ دکھائی نہ دیا۔ دو چار منٹ انتظار کر کے ہم چند قدم آگے بڑھے لیکن وہاں گھنی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور اندھیرے میں ان کے اندر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ پھر ہم اس جگہ گئے جہاں میں نے چیتے پر گولی چلائی تھی اور خون کے قطرے تلاش کرنے لگے۔

باقی رات بڑی بے آرام گزری۔ مچھروں اور رات کے آخری وقت کی سردی نے ہماری بُری حالت کر دی۔ بہر حال جوں توں کر کے وقت گزارا۔ صبح کے وقت ہماری حالت قابلِ دید تھی۔ درخت سے اترنے کے بعد ہم سورج طلوع ہونے کی اُمید لیے گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ جسموں کو تھوڑی دیر دھوپ میں رکھنے اور سکڑے ہوئے اعضا کو آرام پہنچانے کے بعد ہم چیتے کی طرف متوجہ ہوں گے۔ سات بجے کے بعد ہم چیتے کے خون کی تلاش میں نکل پڑے، تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ جس جگہ سے چیتا گھنی جھاڑیوں میں داخل ہوا تھا وہاں خون کے چند خشک قطرے پتوں پر جمے ہوئے تھے۔ پھر چالیس گز آگے مجھے زمین پر چیتے کا بہت سا خون دکھائی دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ چیتے کو گہرا زخم آیا تھا اور وہ اس جگہ آرام کرنے کی نیت سے لیٹا تھا۔ گزشتہ شب میڈرک کی آواز سن کر اسی جگہ وہ بڑی جرأت سے غرایا تھا۔ اس وقت مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ رات کو چیتے نے ہم پر حملہ نہ کر کے بڑا احسان کیا تھا۔

میڈرک نے اس جگہ کی تصویر اُتاری۔ وہ بڑا جوشیلا فوٹو گرافر ہے اور خطرناک سے خطرناک جگہ کی تصویر اُتارنے سے ہرگز نہیں گھبراتا۔

اس جگہ سے خون کی لکیر ایک سو گز تک صاف دکھائی دیتی تھی۔ یہ فاصلہ طے کرتے وقت چیتا ایک دفعہ مزید لیٹا تھا اور یہ بات میرے خیال کی تصدیق کرتی تھی کہ اسے گہرا زخم آیا تھا۔ پھر خون کی لکیر مدھم ہوتی گئی جس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ گولی کے زخم کے آگے چربی وغیرہ آگئی ہوگی جس کے سبب خون بہنا بند ہو گیا تھا۔

وہاں گھاس اور جھاڑیاں خاصی گھنی تھیں۔ لہٰذا ہم بڑی احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے لیکن چیتا کہیں دکھائی نہ دیا۔ راستہ آگے نکل جاتا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ جھاڑیوں کو بغور دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔

اس طرح میں نے کوئی سو گز کا فاصلہ طے کیا۔ میڈرک مجھ سے بیس قدم پیچھے ہاتھ میں کیمرا تھامے چلا آ رہا تھا۔ پھر اچانک یہ واقعہ رونما ہوا۔ مجھ سے چند گز آگے چیتا ایک جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ جلدی کے عالم میں وہ جھاڑی میں نے نظر انداز کر دی۔ جونہی میں اس جھاڑی سے نکلا، چیتا ایک گرج دار آواز کے ساتھ اس کے عقب سے نمودار ہو کر حملہ آور ہو گیا۔ میں برق رفتاری سے پیچھے مڑا اور اسے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا۔ خوش قسمتی سے میری گزشتہ شب کی گولی اس کے داہنے اگلے بازو پر لگی تھی اور وہ اسے گھسیٹ کر چل رہا تھا، ورنہ اس نے مجھے مڑنے کی مہلت کب دینی تھی۔ میں نے جلدی سے نشانہ لیا اور گولی اس کی گردن میں اُتار دی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے لڑکھڑایا مگر پھر آگے بڑھنے لگا۔ اس عرصے میں مجھے دوسری گولی چلانے کا موقع مل گیا۔

دوسری گولی چلانے کے بعد میں نے دیکھا کہ میڈرک عین چیتے کے عقب میں تھا اور اگر میرا نشانہ خطا ہو جاتا تو میڈرک نے یقیناً گولی کی زد میں آ جانا تھا، مگر اس عرصے میں وہ چیتے کے حملے اور اسے گولی لگنے کی تصویر اُتار چکا تھا۔ میڈرک کو اس خطرناک صورتِ حال میں تصویر اُتارنے کی کس طرح جرأت ہوئی۔ اس بات نے مجھے عرصہ دراز تک حیرت میں ڈالے رکھا حالانکہ سو میں سے ننانوے آدمی ایسی صورت حال میں بھاگ جاتے ہیں۔ اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر جوشیلا فوٹو گرافر ہے۔ فقط ایک تصویر کے لیے اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ اس نے فوکس کر کے بلا سوچے سمجھے بٹن دبا دیا تھا۔

جب ہم یہ اچھی خبر سنانے کی خاطر بنگلے کی طرف بھاگے تو رستم اور ورگیس پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ مچان پر رات کے دو بجے تک بیٹھے تھے چونکہ شیر اس وقت تک نہیں آیا تھا اور مچھروں نے کاٹ کر ان کا بُرا حال کر دیا تھا، لہٰذا انہوں نے واپس بنگلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

نو بجے تک ہم چیتے کو اُٹھا کر بنگلے میں لے آئے۔ اس کی کھال اُتارنے میں ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ وہ خاصا بڑا چیتا تھا۔ پیمائش کرنے پر وہ سات فٹ آٹھ انچ لمبا نکلا۔ وقت سے پہلے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے رستم کو رائے دی کہ ہمیں چل کر وہ بچھڑا دیکھنا چاہیے، جس کے پاس وہ رات کو شیر کا انتظار کرتا رہا۔ اس دوران میں ورگیس نے تیسرے اور چوتھے بچھڑے کو دیکھنے کے لیے آدمی بھیج دیئے تھے اور انہوں نے آ کر اطلاع دی تھی کہ وہ دونوں زندہ تھے۔

ہم رستم کی مچان پر پہنچے تو ہمیں معلوم ہوا کہ شیر رستم کے چلے آنے پر وہاں آیا تھا۔ شاید اس نے رستم اور ورگیس کو مچان پر بیٹھے دیکھ لیا تھا اور

جب وہ وہاں سے اُتر آئے تو وہ اپنے شکار پر پہنچ گیا تھا اس نے بچھڑے کا تین چوتھائی حصہ کھالیا تھا۔

رستم کو بڑی مایوسی ہوئی، مگر اس نے دوبارہ وہاں بیٹھنے کا تہیہ کرلیا۔ پھر اچانک مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے ورگیس کے ہمراہ ایک آدمی کو بھیجا کہ وہ چوتھا بچھڑا کھول کر وہاں لے آئے۔ انہیں واپس آنے میں دو گھنٹے لگے۔ ہم نے اسے مردہ بچھڑے سے تقریباً تیس گز دور باندھ دیا۔ میرا خیال تھا کہ شیر مردہ بچھڑے پر شاید دوبارہ آئے اور وہاں کچھ نہ پا کر شاید نئے بچھڑے پر حملہ کردے، لیکن رستم کو میرے خیالات سے اختلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شیر اس جگہ ایک زندہ بچھڑا دیکھ کر ڈر جائے گا۔ بہرحال میرے سمجھانے پر وہ مجھ سے متفق ہوگیا۔

کوئی ساڑھے پانچ بجے ہم تینوں یعنی رستم، میڈرک اور میں ضروری سامان لے کر مچان پر جا بیٹھے۔ ہم نے سب سے پہلے یہ کیا کہ مچان پر سے پرانے اور خشک پتے ہٹا کر وہاں تازہ پتے رکھوائے تاکہ ان کے درمیان ہم تینوں آسانی سے چھپ سکیں۔ فیصلہ ہوا کہ شیر کے آنے کی صورت میں سب سے پہلے رستم گولی چلائے گا اور اس کے بعد میں۔ میڈرک نے اپنے کیمرے کے ساتھ فلیش وغیرہ نصب کرلی تھیں اور وہ ایک دوسری ولولہ انگیز تصویر اُتارنے کی تیاری کرکے آیا تھا۔

شام ہوتے ہی مچھروں نے ہم پر یلغار کرکے پھر سے ہمارا جینا دوبھر کردیا، مگر ہم جوان اور جذبات سے بھرپور تھے۔ رستم عرصہ دراز سے ایک شیر شکار کرنے کی فکر میں تھا اور یہ موقع اسے بڑی مشکل سے ہاتھ آیا تھا۔ آٹھ پھر نو اور پھر دس بج گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد پہاڑیوں کی طرف سے ایک شیر کی آواز آئی۔ صاف ظاہر تھا کہ شیر ہماری طرف آرہا تھا۔ ہم تینوں ایک دم چوکس ہوکر بیٹھ گئے۔ شدت جذبات سے ہمارا دم گھٹا جارہا تھا۔

ہم انتظار کرتے رہے۔ میری مچان پر گزشتہ شب کی نسبت یہاں زیادہ اندھیرا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آس پاس بانسوں کے گھنے درخت تھے۔ میں نے رستم کے کان میں سرگوشی کی کہ وہ اتنی دیر تک انتظار کرے جب شیر نئے بچھڑے پر حملہ نہ کردے یا وہ اپنے پرانے شکار پر نہ آئے۔ پھر میں اپنی ٹارچ سے اسے گولی چلانے میں مدد دوں گا۔ خوش قسمتی سے زندہ بچھڑا سفید تھا اور ہم اسے اندھیرے میں تھوڑا بہت دیکھ سکتے تھے۔ اب بچھڑے کے اِردگرد بھاگنے کی کوشش کرنے اور پھنکارنے کی آواز آنے لگی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے آنے والے خطرے کو دیکھ لیا تھا اور اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔

دس منٹ تک مکمل خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد ایک تیز غراہٹ سنائی دی اور شیر زندہ بچھڑے پر پل پڑا۔ رستم شدت جذبات سے کانپ رہا تھا لیکن اس کے حواس بجا رکھنے کے لیے میں نے اس کا ایک شانہ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ پھر بچھڑے کے گلے سے ''گرگر'' کی ایک آواز نکلی جو گردن ٹوٹ جانے پر نکلا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

میں نے بدستور رستم کا کندھا مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ اس کے بعد دس منٹ تک مزید خاموشی طاری رہی، پھر شیر زمین پر بیٹھ کر بچھڑے کو چیرنے پھاڑنے لگا۔

ہم اب بھی خاموش بیٹھے رہے پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شیر بچھڑے کی آنتیں الگ کررہا ہو۔ اس وقت تک شیر اپنے شکار کی طرف متوجہ ہوچکا تھا۔ لہٰذا میں نے رستم کا شانہ چھوڑتے ہوئے اسے گولی چلانے کی تیاری کا اشارہ کیا۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ رائفلیں اوپر اُٹھائیں۔کوئی دس سیکنڈ کے بعد میں نے اپنی ٹارچ کا بٹن دبا دیا۔دو ٹارچوں کی روشنی میں شیر صاف طور پر ہمیں اپنی طرف گھورتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔چند سیکنڈ گزر گئے اور میں حیران تھا کہ آخر رستم گولی کیوں نہیں چلا رہا اور جب میں اپنی رائفل کا گھوڑا دبانے ہی والا تھا تو مجھے رستم کی دونالی رائفل 0450,400 کی گرج سنائی دی۔

رستم نے ایک ساتھ دونوں گولیاں چلا دی تھیں۔اس رائفل کا خاصا زور سے دھکا لگا ہوگا۔اس کے باوجود دونوں گولیاں صحیح نشانے پر بیٹھی تھیں اور وہ کندھے کے اوپر شیر کی گردن میں پیوست ہوگئی تھیں۔شیر نے بڑی تیزی سے جنبش کی اور آگے کی سمت جھک گیا جیسے سونے کی تیاری کر رہا ہو۔اس کی دم چند مرتبہ ہلنے کے بعد ساکت ہوگئی۔رستم نے اپنا پہلا شیر مار لیا تھا۔

ہم مزید نصف گھنٹہ تک انتظار کرتے رہے لیکن شیر نے کسی قسم کی جنبش نہ کی پھر ہم مچان سے اتر آئے مگر ہماری ٹارچیں ابھی تک شیر پر جمی ہوئی تھیں۔ہمارے قریب پہنچنے پر بھی شیر نے جنبش نہ کی۔ظاہر ہے کہ وہ مر چکا تھا۔رستم خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔اس نے ایک شیر شکار کر لیا تھا۔پیمائش کرنے پر وہ نو فٹ چار انچ لمبا نکلا۔

ہم خوشی خوشی بنگلہ واپس آئے۔رستم شیر کا شکار کرنے اور میں مدھیا نور کو چیتے سے نجات دلانے پر خوش تھا،مگر ہم دونوں کی نسبت میڈرک زیادہ خوش تھا۔جس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک بہترین فوٹو اُتاری تھی۔اگر میری بجائے چیتا اس پر حملہ کر دیتا تو اس صورت میں یا تو اسے گہرے زخم آتے یا پھر اسے تکلیف دہ موت کا سامنا کرنا پڑتا۔

جب میں نے والد صاحب کو سارا واقعہ سنایا تو انہوں نے ہمیں مبارکباد دی۔لیکن اس وقت تک انہیں یہ پتہ نہ چلا کہ میڈرک کس طرح معجزانہ انداز میں میری گولی اور چیتے کے حملے سے بچا تھا۔

دوسرے دن جب انہوں نے تصویر دیکھی تو وہ ہمیں ملامت کرنے لگے۔اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ وہ یوں ہی بے سود ناراض ہو رہے تھے،مگر اب میں جان گیا ہوں کہ بوڑھا ہمیں ملامت کرنے میں حق بجانب تھا۔

میں نے دو بڑی غلطیاں کی تھیں۔اول چیتے کو تلاش کرتے وقت میں نے جھاڑیوں کو بغور نہ کھنگالا تھا اور چیتے کو دیکھے بغیر آگے گزر گیا تھا۔دوم،اپنی ولولہ انگیزی میں،میں نے یہ دیکھے بغیر گولی چلا دی تھی کہ میری گولی کی عین سیدھ میں ایک آدمی کھڑا تھا۔لیکن وہ جو کہاوت ہے کہ تقدیر مبتدیوں کی مدد کرتی ہے۔واقعی سولہ آنے صحیح ہے۔

آدم خور کا تعاقب

میرا نام راؤ سوراج سنگھ ہے۔ میں سیکنڈ رائل لانسر میں رسالدار ہوں۔ میں اس روز بیٹھک میں بیٹھا سوچوں میں غرق تھا۔ وہی آدم خور میرے خیالوں کا مرکز تھا جو ستر انسانوں کو ہضم کر چکا تھا۔ کل ہی اس نے ہمارے گاؤں کے ایک سنار سنگت رائے کو چٹ کیا تھا۔ میں کئی شیر ہلاک کر چکا تھا مگر وہ قاتل ابھی تک زندہ تھا۔ دفعتہً قدموں کی چاپ نے میرے خیالوں کو منتشر کر دیا۔ ایک قومی ہیکل جوان نے آ کر اپنا تعارف کرایا۔ میرا نام ہیبت خاں ہے۔ میں سرحدی پٹھان ہوں۔ 18 پونا ہارس میں رسالدار ہوں۔ مجھے آپ کے دوست رسالدار راؤ عباس علی خاں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ مجھے سیر و شکار کا بہت شوق ہے۔

میں نے آدم خور کے بارے میں پوری روداد بیان کی تو انہوں نے کہا، ''راؤ صاحب خدا مدد کرے گا۔ ہمارا علاقہ چتوڑ سے آگے سرسبز پہاڑوں اور ہری بھری شاداب وادیوں پر مشتمل ہے۔ یہ سارے کا سارا خونی درندوں کا مسکن ہے''۔

دوسرے دن صبح بھیلوں نے آ کر بتایا۔ ''راؤ صاحب۔ سنگت رائے کی نصف لاش مل گئی ہے۔ پہاڑ کے دامن میں ایک نشیب میں پڑی ہے۔'' ہم نے قریب ہی مچان تیار کیا اور سورج غروب ہوتے ہی کھانے سے فارغ ہو کر مچان پر جا بیٹھے۔

ہیبت خان رائفل لیے خاموش بیٹھا تھا اور میں طرح طرح کے خیالوں میں گم تھا۔ ذرا سا کھٹکا ہوتا اور میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ قریب ہی ایک جنگلی مرغ صبح صادق کا انتظار کیے بغیر اذان دیئے جا رہا تھا۔ ساتھ ہی گیدڑوں کی ہو ہو اور موروں کی پہو پہو نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ یکا یک سناٹا چھا گیا جیسے تمام کائنات کو ناگ نے ڈس لیا ہو۔ دس بارہ سانبھر دوڑتے ہوئے آئے اور مچان کے قریب سے چوکڑیاں بھرتے ہوئے غائب ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ آدم خور آ رہا ہے۔ ہیبت خاں نے سرگوشی میں کہا ''راؤ صاحب، پہلا فائر مجھے کرنے دیں''۔ اچانک بلا کے سناٹے میں ہڈی ٹوٹنے کی آواز نے بدن میں جھرجھری پیدا کر دی۔ معاً ٹارچ روشن ہوئی اور ہیبت خاں کی رائفل نے شعلہ اُگلا۔ گولی شیر کی پیشانی توڑتی ہوئی دور نکل گئی۔ وہ سنگت رائے کی نصف لاش پر گرا اور پلک جھپکتے میں اُٹھ کر جست لگائی اور مچان سے ٹکراتا ہوا سامنے گر گیا۔

ہیبت خاں نے دوبارہ فائر کیا، گولی گردن میں سوراخ کرتی ہوئی پار نکل گئی۔ شیر پھر کودا اور وہیں گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ ہیبت خاں بڑے غضب کا نشانہ باز تھا۔ ہم دونوں سنگینیں تانے مچان سے اترے تو شیر مر چکا تھا، لیکن یہ عام شیر تھا جس ظالم کا پورے علاقے میں چرچا تھا، وہ نہیں تھا۔ دن نکلتے ہی بھیلوں نے آ کر شیر کی کھال اُتاری تو سامنے دس بارہ بھاٹ آ کر رونے لگے۔ ایک نوجوان کو تو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

ایک بھاٹ نے بتایا۔ ''راؤ صاحب، اس نوجوان کی شادی کو دس دن گزرے ہیں۔ آدم خور پن گھٹ سے نو بیاہتا دلہن کو اُٹھا کر غائب

ہو گیا، لیکن چشم دید گواہ کوئی نہیں ہے۔ شیر گاؤں کے چار انسانوں کو پہلے چٹ کر چکا ہے"۔

میں نے شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ دلہن کسی بدکار کے ساتھ فرار ہو سکتی ہے، لیکن بھاٹوں نے یقین دلایا کہ دلہن بے حد شریف اور شرمیلی ہے۔ اس کے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شیر پہاڑ سے پن گھٹ کے قریب اترتا ہے اور انسان کا شکار کر کے غائب ہو جاتا ہے۔ تاہم میرے دل میں طرح طرح کے خدشات جنم لے رہے تھے۔

بالآخر میں اور ہیبت خان دلہن کے قاتل آدم خور کی تلاش میں چل پڑے۔ اور ایک بھاٹ کے ہاتھ شیر کی کھال گھر بھیج دی۔ ہم پہاڑ پر چڑھے اور پن گھٹ کے دوسری طرف اُتر گئے، وہاں گاؤں کے لوگ موجود تھے۔ عورتیں بین کر رہی تھیں۔ لوگوں نے بتایا کہ آدم خور صبح دلہن کو اُٹھا کر لے گیا ہے۔ ہم نے غور سے دیکھا تو شیر کے پنجوں اور خون کے نشانات دور تک جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ نشانات کے ساتھ ساتھ چل دیئے جو پہاڑ کے نیچے بائیں طرف گھنے جنگل میں داخل ہو رہے تھے۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ آدم خور چند گھنٹوں کے وقفہ سے دوسرے آدمی کا شکار نہیں کر سکتا۔ یہی خیال ہیبت خاں کا تھا، اب یہ خیال پختہ ہو گیا کہ یقیناً دلہن کسی آوارہ شخص کے ہمراہ فرار ہوئی ہے۔ ہم بھوکے پیاسے آدم خور کے تعاقب میں چلے جا رہے تھے۔ صرف ایک سہما ہوا بھاٹ ہمارے ساتھ تھا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ آسمان پر بادل چھا گئے اور اچانک تیز مینہ برسنے لگا۔ پورے تین گھنٹے بعد بارش بند ہوئی۔ گرد و غبار دھل کر درختوں پر بہار آ گئی۔ ہم بری طرح بھیگ چکے تھے۔ نشانات غائب ہو چکے تھے۔ یہ ہماری مہم کا بہت بڑا المیہ تھا۔ بادل نخواستہ ہم پھر گھنے جنگل میں آدم خور کو تلاش کرنے میں جت گئے۔ بائیں جانب دیکھا، دس بارہ فٹ لمبے دو کالے ناگ نظر آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک نیولہ ان پر حملہ آور ہوا۔ دونوں ناگوں نے پھن اُٹھا کر نیولے کو ڈسنے کی کوشش کی لیکن وہ کمال پھرتی سے وار بچا گیا۔ نیولے نے پھر حملہ کیا، بڑی پُرلطف جنگ تھی۔ ناگ زمین پر پھن مار مار کر تھک چکے تھے لیکن نیولہ تازہ دم اور پُرسکون تھا۔

اس کے جسم میں بلا کی پھرتی تھی۔ دونوں ناگ اپنی آگ میں تپ کر بل کھاتے نیولے کی طرف تیزی سے لپکتے۔ اور اپنے پھن زمین پر مار مار کر نڈھال ہو جاتے۔ ہم پتھر کے بت بنے، بغیر پلک جھپکائے، اس سنسنی خیز جنگ سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک قریب ہی ایک جھنڈ سے سہمی سہمی انسانی آوازیں اُبھریں۔ ہم ادھر لپکے اور جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ معاً ایک آدمی کے بھاگنے کی آواز سنی، لیکن میں نے تعاقب کر کے اسے پکڑ لیا۔ ابھی اس سے کچھ پوچھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک حسین عورت درختوں کے جھنڈ سے نکل کر شرمائی ہوئی ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے گرج دار آواز میں پوچھا، کون ہو تم اور اس سے تمہارا کیا تعلق ہے۔

میرا نام آشا ہے۔ میں قریب کے گاؤں میں بیاہی ہوں اور یہ ہمارے گاؤں کے کمہار کا لڑکا ہے۔ بچپن سے ہماری دوستی ہے۔ میں اس کے ساتھ پن گھٹ سے بھاگی تھی۔ میں نے عورت کو بھاٹ کے ساتھ گاؤں کی سمت روانہ کر دیا۔ اس کے اغوا کا مسئلہ جلدی حل ہو گیا تھا۔

گھنے جنگل میں ہم آہستہ آہستہ بڑھتے رہے۔ اب شام ہو چکی تھی۔ چند پرندے شکار کیے۔ گیلی باڑ کو بمشکل جلا کر اس سے ایندھن کا کام لیا اور بارش کا پانی پی کر ایک درخت پر چڑھ گئے۔ مختلف جانوروں کی ملی جلی آوازوں نے ماحول کو خاصا ڈراؤنا بنا دیا تھا پھر جانوروں کی آوازیں مدھم

پڑنے لگیں اور ایک پُراسرار سناٹا چاروں طرف چھانے لگا۔ پورا جنگل موت کا خوف ناک روپ دھار رہا تھا۔ ہمیں افسوس تھا کہ ابھی تک شکار کا فطری لطف نہ اُٹھا سکے۔

کہیں دور دو شیر زور سے گرجے تو سارے جنگل کو سانپ سونگھ گیا۔ ماحول کی ہولناکی میں اضافہ ہوگیا۔ میں اور ہیبت خاں درخت سے نیچے اُترے اور شیروں کی آوازوں کے تعاقب میں چل دیئے۔ راستے میں ایک درخت کے نیچے کئی چیتل اور سانبھر کھڑے تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی چوکڑیاں بھرتے ہوئے غائب ہوگئے۔ اچانک ایک انسانی چیخ بلند ہوئی اور فضا میں ہل چل مچاتی ختم ہوگئی۔ ہیبت خاں نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''یقیناً آدم خور نے کسی انسان کا شکار کیا ہے''۔

ہمیں طویل ہولناک اور تاریک جنگل سے نکلنا مشکل ہو رہا تھا۔ انسانی آواز کے ختم ہوتے ہی ہم دونوں لرز کر رہ گئے۔ اچانک ایک ڈراؤنی اور پُراسرار آواز اندھیرے جنگل میں گونجی جیسے بھوت ایک خاص انداز میں ہمیں ڈرا رہے ہوں۔ ہیبت خاں تو مسلمان تھا لیکن میں بھی راجپوت ہونے کے ناطے بھوت پریت کا قائل نہ تھا، ہم نے نصف گھنٹے تک اس خوف زدہ آواز کا تعاقب کیا۔ اس پُراسرار راز کو جاننے میں کامیابی نہ ہوئی۔ بس ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آواز محض ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے اس جنگل میں مسلط ہے، مگر ہمارا اصل مشن آدم خور کا مقابلہ کرنا تھا۔ ہم اس آواز کی پرواہ کیے بغیر اپنے کام میں جتے رہے۔ ہماری مہم بڑی سخت تھی۔

ڈراؤنا جنگل تھا کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا، خدا جانے کتنی لمبی رات تھی۔ جب خدا خدا کر کے جنگل سے نکلے تو ایک تیز رفتار ندی نے راستہ روک لیا۔ ہم نے ندی کے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ ندی کا پانی اس قدر تیزی سے بہہ رہا تھا کہ اس کی لہروں میں ہاتھی کھڑا رہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک پچھلی تاریخوں کا چاند نمودار ہوا تو پورا جنگل نورانی شعاعوں میں نہا گیا۔

صبح صادق تھا۔ ہیبت خاں نے وضو کر کے نماز ادا کی اور ہم نے پھر ندی کے ساتھ ساتھ سفر شروع کر دیا۔ ندی کے تیز پانی میں چار انسانی لاشیں بہتی ہوئی آئیں اور آگے نکل گئیں۔ ان کے بعد ایک گیدڑ بہتا ہوا آیا اور پانی کی لہروں نے اسے کنارے پر پہنچا دیا۔ وہ نڈھال ہو کر سامنے گر پڑا ہم نے اس کو وہیں چھوڑا اور آگے بڑھ گئے پھر ایک زرد رنگ کا اژدہا لہروں میں لپٹا نظر آیا اور پلک جھپکتے میں تیز پانی کی لہروں میں جکڑا آگے نکل گیا۔ کچھ دور چلے تو ندی پار ایک چھوٹا گاؤں آباد تھا۔ وہاں چار آدمی ندی کے کنارے کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''ہم شکاری ہیں اور آدم خور کے تعاقب میں پہاڑوں اور جنگلوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں''۔ ان میں سے ایک بولا ''ہم کشتی لاتے ہیں آج آپ لوگ ہمارے ہاں مہمان رہیں''۔ ہم نے کشتی کے ذریعے ندی پار کی۔ گاؤں والوں نے ہماری بہت خاطر تواضع کی۔ اس گاؤں میں اہیر قوم کے لوگ آباد تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آدم خور ہمارے دو آدمی ہضم کر چکا ہے۔ رات کے وقت ایک حجام قریب کے گاؤں سے آ رہا تھا۔ آدم خور نے اسے ہڑپ کر لیا۔ ہمارے آدمی اس کی لاش کی تلاش میں گئے ہیں۔ شام کو آئیں گے، آپ لوگ سو جائیں۔

دونوں کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ گرم دودھ پیتے ہی ہمیں نیند نے آلیا۔ شام کو آنکھ کھلی تو انہوں نے بتایا کہ پہاڑ کے نیچے ایک گڑھے میں حجام کی نصف لاش پڑی ہے۔ ہم نے وہاں ایک مچان تیار کروا دی ہے۔

شام کو کھانا کھانے کے بعد ہم مچان کی طرف چلے گئے۔ گاؤں کا ایک شخص ہیرالال ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے پاس توڑے دار بندوق تھی۔ ابھی ہم بمشکل چند قدم ہی چل پائے تھے کہ ایک لحیم شحیم آدمی آتا دکھائی دیا۔ وہ وہیں کھڑے ہو کر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے بتایا کہ میرا نام راؤ سوراج سنگھ ہے۔ میں انگریزی فوج میں رسالدار ہوں۔

وہ بولا ''راؤ صاحب! میں آپ کے ساتھ مچان پر بیٹھتا لیکن آپ کو پتہ ہے کہ راؤ اور رانا یکجا شکار کھیلیں تو ضرور خون ریزی ہوتی ہے۔''

اتنا کہہ کہ رانا صاحب اپنے گھر چلے گئے اور ہم مچان پر جا بیٹھے۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی آہٹ میرے جسم میں سنسنی دوڑا دیتی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ یکا یک چوپائے بھاگتے ہوئے آئے۔ ہیبت خاں نے ٹارچ جلائی۔ وہ سب سانبھر تھے۔ بہت پریشان اور گھبرائے ہوئے ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ حجام کی بچی کھچی لاش ہمارے سامنے گڑھے میں پڑی تھی۔ دور سے شیر کی گرج سنائی دی اور کچھ دیر بعد آدم خور دبے قدموں آتا دکھائی دیا۔

اس کی اچانک آمد سے ہم سناٹے میں آ گئے۔ اس سے پہلے کہ ہم سنبھل پائیں، وہ حجام کی نصف لاش اُٹھا کر چل دیا۔ ہیبت خاں نے ٹارچ جلائی اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بے قراری کی حالت میں، میں نے لبلبی دبائی، ہیبت خاں فائر کرنے کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے، دونوں گولیاں شیر کا پیٹ پھاڑتی ہوئی نکل گئیں۔ وہ کہری شیر تو نہیں تھا مگر توانائی اور قد کاٹھ میں اس کا مدمقابل تھا۔ لاش کا نصف حصہ چھوڑتے ہی پلٹا اور جست مار کر مچان کے نزدیک لہراتا ہوا نیچے گرتے ہوئے غائب ہو گیا۔ بڑا عیار درندہ تھا، میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جنگل کا شہنشاہ ہمیں بے وقوف بنا کر بھاگ جائے گا۔

ہیرالال بولا۔ ''اس بلا کا یہی انداز ہے۔ شاید نشانہ چوک گیا''۔

ہیبت خاں نے بڑے پرسکون لہجہ میں کہا ''دونوں گولیاں اس کے بدن کے پرخچے اُڑاتی ہوئی نکل گئی ہیں''۔

ہم سنگینیں تان کر مچان سے نیچے اُترے۔ لہو کا نشان ہماری رہنمائی کرتا ہوا گھنے جنگل کی طرف جا رہا تھا۔ ہیرالال گھبرا گیا کہ میں زخمی شیر کا دو بدو مقابلہ دیکھنے کی تاب لانے سے رہا۔ میں واپس اپنے گاؤں جا رہا ہوں اور وہ چلا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ ہیرالال کا یہ فیصلہ درست ثابت نہ ہوا۔ ہوا یوں کہ آدم خور کی راستے میں ہیرالال سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ شیر نے اسے وہیں دبوچ کر اس کا کام تمام کر دیا اور اس کی لاش اور بندوق وہیں پڑی رہی۔ ہم تمام رات زخمی آدم خور کے تعاقب میں پھرتے رہے۔ صبح تھک ہار کر اہیروں کے گاؤں کے قریب پہنچے تو وہیں ہیرالال کی لاش پڑی تھی۔ اس کی توڑے دار بندوق گاؤں والے لے گئے جو بھری ہوئی تھی اور ہیرالال کو اسے استعمال کرنے کی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی۔ لاش کے گرد لوگ جمع تھے، پھر وہ روتے پیٹتے لاش اُٹھا کر گاؤں کو چل دیئے۔

اگلے روز صبح بیدار ہوئے اور ناشتے کے فوراً بعد اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ آدم خور کے پنجوں کے نشان ندی کے ساتھ ساتھ جاتے دکھائی دیئے۔ آگے پتھریلی زمین آئی۔ پنجوں کے نشان غائب ہو گئے۔ تھوڑی دور چلے تو خوف ناک جنگل آیا جو پہلے جنگل سے بھی زیادہ تاریک اور ڈراؤنا تھا۔ زخمی شیر بڑا خطرناک، انتہائی قوت برداشت کا مالک دکھائی دیتا تھا۔

وہ ہمارے لیے ایک سنگین مسئلہ بن چکا تھا۔ اندھیرے جنگل میں آگے بڑھے تو بڑا وحشیانہ منظر تھا۔ پورا جنگل چھوٹی بڑی پہاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔ جگہ جگہ جنگلی مرغ آپس میں لڑ رہے تھے۔ دس بارہ بھیڑیوں نے غار سے نکل کر ہم پر حملہ کیا۔ ہم نے ایک ساتھ دو فائر کیے۔ دھماکوں کی ہولناک آواز کے ساتھ دو بھیڑیئے تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے۔ باقی دوڑ کر غاروں میں جا چھپے۔ پورے جنگل پر سناٹا چھا گیا۔ آدم خور کی موجودگی میں دوسرے درندے اس طرح آزاد نہیں رہ سکتے۔

جنگل کے بادشاہ کی موجودگی میں چڑیا تک خوف زدہ رہتی ہے۔ شیر شدید زخمی تھا، خدا جانے کدھر نکل گیا۔ اس کا تعاقب ہمارے لیے بڑا مہنگا ثابت ہو رہا تھا۔ جنگل میں تاریکی تھی۔ دن ڈھلے جب اندھیرا اور بڑھا تو ہم ایک پہاڑی پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گئے۔ اس جنگل میں سیاہ رنگ کے سانپ ہی سانپ تھے۔ ہمارے پاؤں میں فوجی بوٹ تھے۔ اس لیے قدرے محفوظ تھے۔ درختوں پر بھی ناگ دکھائی دے رہے تھے۔ ناگوں میں صفت ہے کہ وہ چھیڑے اور پاؤں تلے دبے بغیر وار نہیں کرتے۔ ہیبت خاں بولا۔ ''راؤ صاحب سانپوں میں شیر کا کیا کام، ہمیں اس موت کے جنگل سے دن غروب ہونے سے قبل نکل جانا چاہیے''۔

ہم دونوں تیز رفتاری سے چل پڑے۔ آگے بڑھے تو ران جتنے موٹے سیاہ ناگوں نے ایک چیتل کو ہلاک کر کے کھانا شروع کیا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے اپنے ایک ایک فٹ چوڑے پھن پھیلا کر ہماری طرف تیز نہ جھپکنے والی آنکھوں سے دیکھا اور اپنی زبان اندر باہر کر کے ہمیں ڈرانے لگے۔ ہم نے رائفلوں سے فائر کرنے کا ارادہ کیا لیکن شیر کا خیال آتے ہی اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ ہم خاموشی سے سانپوں اور اژدہوں کی باشاہت کی حدود سے آگے نکل گئے۔ سامنے ایک تالاب تھا، وہاں رائفلوں کے بٹ دھوئے اور غور سے دیکھا تو تالاب کے پانی میں بھی سیاہ ناگ تیر رہے تھے۔ خدا کی پناہ بڑا خوف ناک اور ہیبت ناک جنگل تھا۔ آگے ایک نالے پر وضو کر کے ہیبت خان نے نماز ادا کی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا، کوئی جاندار نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس مخصوص جنگل پر صرف ناگوں کی حکومت ہے۔

ہمیں اپنی منزل کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ آگے ایک تاریک سرنگ تھی۔ اس میں بھی بڑے بڑے سانپ رینگ رہے تھے۔ یہ سرنگ کے دہانے کا ذکر ہے۔ سرنگ کے اندر بھگوان جانے کیا بلائیں تھیں۔ آگے بڑھے تو اِدھر اُدھر پہاڑیاں تھیں۔ ہم ایک پہاڑی پر چڑھے، وہاں بھی خون خوار سانپ بہت سے درختوں پر چڑھے خرمستیاں کر رہے تھے۔ ان زہریلی بلاؤں سے بچتے بچاتے، ہم بائیں طرف سنگلاخ چٹانوں پر اتر گئے، نیچے اترے تو آگے ندی آ گئی۔ ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور ایک مقام پر ندی پار کر کے ناک کی سیدھ میں چل پڑے۔ دو میل آگے صدیوں پرانا ایک مکان تھا۔

اس پر بھیلوں کا قبضہ تھا۔ ہم وہیں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بھیلوں سے سانپوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے گھبرائی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ انہیں اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم ان خون خوار سانپوں کے نرغے سے زندہ نکل کر آئے ہیں۔ شاید وہ لوگ ان خوف ناک ناگوں کو غیر مرئی قوت سمجھتے تھے اور ان کی گرفت سے بچ نکلنا ان کے نزدیک ناممکن تھا۔ کافی دیر بعد ہم انہیں اس بات کا یقین دلانے میں کامیاب ہوئے کہ ہم واقعی زندہ ہیں۔ وہاں پانی کا عجیب شور تھا۔ شور کے بارے میں پوچھا تو بھیلوں نے بتایا کہ پہاڑ کے پیچھے ایک بہت تیز رفتار

ندی ہے جس کی خوف ناک لہریں پہاڑ سے ٹکراتی گزرتی ہیں۔ یہ وہی شور تھا، اگر ہاتھی لہروں میں پھنس جائے تو تنکے کی طرح بہتا ہوا غائب ہو جائے اور یہ ریت کے پہاڑ نما ٹیلے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ سینکڑوں میل میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سورج مغرب میں پہاڑ کے پیچھے غروب ہونے لگا۔ شفق کی خوں رنگ سرخی ہرے بھرے پہاڑوں پر لہو کی طرح پھیلی تو بے حد دل کش اور حسین مناظر سے طبیعت میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد گھپ اندھیرا پھیل گیا، ناچار رات وہیں بسر کی۔ صبح ہم پہاڑ پر چڑھے اور نیرنگی قدرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دوسری طرف اُتر گئے۔ آگے ندی سینہ تانے بہہ رہی تھی۔ اس کی تیز لہروں میں چوپاؤں کی لاشیں بجلی کی رو کی طرح گزر رہی تھیں۔ اب ہم ناگوں کا علاقہ اور آدم خور کو بھول چکے تھے اور ہماری منزل بھٹک چکی تھی۔

میں نے راجستھانی راجپوت ہوتے ہوئے بھی کسی شکاری مہم میں ان علاقوں کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم ندی کے کنارے کنارے چل رہے تھے، جو بڑی ہیبت ناک اور پُراسرار آواز کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ پانی کا شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ ہماری زبانیں گنگ ہو چکی تھیں لیکن میرا ذہن بیدار تھا اور آگے بڑھے تو مینا قوم کے لوگوں کا گاؤں آیا۔ یہ لوگ سخت متعصب ہوتے ہیں۔ ان کے چالیس اونٹوں کی قطار چل رہی ہو۔ اگلے اونٹ پر کھانا بندھا ہو اور پچھلے اونٹ سے مسلمان کا ہاتھ لگ جائے تو کھانا بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ اپنا اپنا خیال ہے، ہندو راجپوتوں میں تعصب اور مذہبی جنون نہیں ہوتا اور وہ مسلمان سے گھل مل کر رہتے ہیں۔ سامنے سے ایک بڑھیا آتی دکھائی دی۔

میں نے ندی پار جانے کا راستہ پوچھا تو وہ بولی آگے چل کر ندی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتی ہے اور وہیں ایک کشتیوں کا پل ہے۔ اس سے ندی پار کی جاتی ہے۔ ہم ایک میل اور چلے تو کشتیوں کا پل آیا۔ وہ عبور کیا تو سامنے بنجاروں کے جھونپڑے تھے، ہم جھونپڑوں میں داخل ہوئے تو ایک افسوس ناک اطلاع ہماری منتظر تھی۔ قریب کے جھونپڑوں میں بنجاروں کے بین کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک سسکیاں لیتے بنجارے کو ہم بمشکل گفتگو کرنے پر رضامند کر سکے۔ اس نے روتے روتے بتایا کہ اس کے دو نوجوان لڑکے رات ''باڑے'' کے باہر سو رہے تھے۔ ایک زخمی آدم خور نے ان دونوں پر حملہ کیا اور ان کی ادھ کھائی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ایک اور ڈرے سہمے ہوئے بنجارے نے جو قریب جھونپڑے میں چھپا یہ دہشت ناک منظر دیکھ رہا تھا ہمیں بتایا کہ وہ آدم خور اپنا کام کر کے چلتا بنا۔

اس کی زبانی ہی ہمیں اس بات کا علم ہوا کہ آدم خور زخمی تھا۔ ہم نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ ہم اسی آدم خور کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ ہمارے سمجھانے پر وہ بمشکل اپنے ایک آدمی کی آدھ کھائی لاش کو اس جگہ چھوڑنے پر رضامند ہوئے جہاں سے وہ اسے اُٹھا کر لائے تھے۔

☆☆☆

ہم لاش کے سامنے ایک درخت پر بیٹھ گئے۔ سورج غروب ہوا اور پہلی تاریخوں کا چاند نمودار ہوا۔ پورا جنگل دودھیا روشنی میں نہا گیا۔ یکا یک گیدڑوں کی ہوکا ہوکا اور موروں کی پہو پہو نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ پھر اچانک پورے ماحول کو سانپ سونگھ گیا۔ ایک دھاڑ گونجی اور آدم خور آتا دکھائی دیا۔ ہمارے اعصاب تن گئے، وہ بنجارے کی نصف لاش کے قریب آیا۔ دم ہلا کر اس نے چاروں طرف دیکھا پھر لاش کو سونگھا، اس کا پیٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ زخم مندمل ہو چکے تھے۔ گولیوں کے دو ہرے زخم تھے۔ مجھے معاً ایسا محسوس ہوا، وہ درندہ نہیں بلکہ بھوت یا کوئی مافوق الفطرت مخلوق

ہے، لیکن ذہن پر زور دیا تو مسئلہ حل ہو گیا کہ دونوں گولیاں آنت اور اوجھری چھو کر کم نقصان دہ جگہ پر سوراخ کرتی ہوئی معدہ کے اوپر سے نکل گئی تھیں اور شیر اسی سج دھج سے زندہ تھا، ہم نے دم سادھ کر اس کی حرکات وسکنات پر نگاہیں جما دیں۔ اس نے لاشعوری طور پر درخت کی سمت دیکھا، ہماری رائفلوں سے دو شعلے نکلے وہ زمین پر گرا اور پلک جھپکتے میں جست بھر کر درخت سے ٹکراتا ہوا غائب ہو گیا۔ ایک مرتبہ پھر وہ مکار ہمیں جل دینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

ہم نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور خطرہ مول لے کر درخت سے نیچے اُتر آئے۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک مرتبہ پھر ہم اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ قریب ہی کسی کی جان لیوا چیخوں سے پہاڑ گونج اُٹھے، ساتھ ہی شیر کی غراہٹ سے پورا علاقہ لرز گیا۔ ہم تیزی سے آوازوں کی سمت بڑھے۔ ابھی تھوڑی دور ہی پہنچے تھے کہ بستی کی طرف سے ایک شخص بھاگتا ہوا ہماری سمت آتا دکھائی دیا۔ غالباً وہ ٹارچ کی روشنی دیکھ کر ہماری طرف آیا تھا۔ قریب پہنچتے ہی وہ دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ ہیبت خان نے اسے کندھے پر اُٹھایا اور قریب ہی ایک خالی قطعہ زمین پر لٹا کر اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے اسے ہوش آیا۔ خوف کے مارے اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور زبان گنگ ہو گئی تھی۔ بڑی مشکل سے اٹک اٹک کر اس نے ہمیں بتایا کہ اس کا آمنا سامنا ابھی ابھی آدم خور سے ہوا اور بمشکل وہ ایک درخت پر چڑھ کر اس سے بچنے میں کامیاب ہوا ہے۔ وہ بضد تھا کہ شیر کے مرنے تک وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔

اتنے خطرناک اور مکار آدم خور کی تلاش رات کے اندھیرے میں کرنا اس کی خوراک بننے کے علاوہ اور کیا تھا۔ ہم نے تعاقب کا ارادہ ملتوی کر دیا اور قریب ہی ایک نالے کے نزدیک ایک محفوظ چٹان پر رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ میں اور ہیبت خان تو تھوڑی دیر بعد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے جب کہ مقامی کمہار خوف کے مارے ہمارے نزدیک ہی بیٹھا رہا۔

ابھی ہمیں سوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک کمہار کی چیخوں نے ہڑبڑا کر اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ہیبت خاں نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی جس سے تمام خون نچڑا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس کی حالت بگڑنے لگی۔ بمشکل اس نے ڈرتے ڈرتے ہمیں بتایا کہ ابھی ابھی آدم خور یہاں سے ہو کر گیا ہے، وہ نالے کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہمیں گھورتا رہا اور کمہار خوف کے مارے چلا بھی نہ سکا۔

اس نے آدم خور کی واپسی کے بعد شور مچایا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آدم خور ہمت کرتا تو ہمیں سوتے میں شکار کر لیتا، لیکن بھگوان کو ہمیں بچانا مقصود تھا۔ اس لیے شاید آدم خور نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ ہم نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسی وقت جان کا خطرہ مول لے کر اس کے تعاقب میں چل دیئے۔ ابھی کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ شیر کی خوف ناک گرج سے فضا لرز گئی۔ اچانک آدم خور گھنے جنگل سے نکلا اور ہمیں دیکھتے ہی فوراً رُک گیا۔

ہم دونوں لرز اُٹھے۔ شیر کی آنکھوں سے انتقام کی آگ برس رہی تھی اور وہ ہم پر جھپٹنے کے لیے تیار تھا۔ ہم نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ایک ساتھ فائر داغ دیئے، لمحے بھر کے لیے اس نے اپنا جسم تولا اور زمین پر گر پڑا۔ گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں، مگر وہ بے حد سخت جان اور دلیر تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود حملہ آور ہوا۔ میں حیران تھا کہ یہ شیر ہے یا کوئی چھلاوہ، ہم دونوں نے نشانہ لیا، لیکن فائر کرنے کی نوبت نہ آئی۔ شیر جست لگا

کر گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔ عجیب موذی اور ظالم سے پالا پڑا تھا۔ ہم ان پہاڑوں اور گھنے جنگلوں سے اکتا گئے تھے۔ روزانہ میلوں کا سفر طے کر رہے تھے۔ طبیعت اب واپس فوجی ہنگاموں میں پہنچنے کو مچل رہی تھی، لیکن یہ گوارا نہ تھا کہ شیر سے شکست مان لی جائے۔ ہم ایک مرتبہ پھر تاریک جنگل میں داخل ہو گئے، بس یہی خیال تھا کہ زخمی درندہ بہت چوکنا اور ظالم ہوتا ہے۔

یکا یک آسمان پر گھٹا چھا گئی۔ تاریک جنگل میں اندھیرا اور بڑھ گیا۔ درخت بھوتوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ ہم دبے پاؤں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے، جب اچانک ہم دونوں ٹھٹھک کر رُک گئے، ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔

اس مرتبہ ہیبت خان نے ٹارچ کی روشنی شیر پر ڈالی۔ میں بندوق چھپائے فائر کے لیے تیار تھا، لیکن درندہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ ظالم ختم ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود ہم خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ ہم نے شیر پر دو فائر کیے، اس نے ہلکی سی آواز میں غرانا چاہا لیکن آواز آدم خور کے گلے میں اٹک گئی۔ آگے بڑھے تو وہ نزع کی حالت میں تھا، ہم نے دو فائر اور کیے۔ اب سخت جان اور عیار آدم خور ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

ہم ایک قریبی درخت پر چڑھ گئے۔ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس مرحلے پر جب ہم مایوس ہو چلے تھے۔ قدرت نے ہماری مدد کی اور اس موذی کی ٹھکانے لگانے میں ہم کامیاب ہوئے۔ صبح صادق نمودار ہوتے ہی میں نے ہیبت خاں کو شیر کی لاش کے قریب چھوڑا اور خود گاؤں کی سمت روانہ ہو گیا۔

جب میں نے گاؤں کے لوگوں کو آدم خور کی ہلاکت کی اطلاع دی تو وہ جوش مسرت سے رقص کرنے لگے اور شور مچاتے میرے ساتھ جنگل کی طرف چل دیئے۔ ہم نے آدم خور کی کھال اُتاری جو بے شمار گولیوں کے سوراخوں سے داغ دار تھی۔ شیر کی کھال لے کر بنجاروں کے جھونپڑوں میں پہنچے تو خوشی کا جشن منایا گیا۔

آدم خور نے جس شخص کا بھائی چٹ کیا تھا، اس نے غصہ میں کھال پر پچاس جوتے رسید کیے، یہ انتقام کا انوکھا طریقہ تھا۔ انہوں نے ہمارے لیے بہترین کھانا تیار کیا۔ ہم کھانے کھاتے ہی سو گئے۔ بیدار ہوئے تو پورے علاقے میں آدم خور کی ہلاکت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ بے شمار لوگوں نے آکر آدم خور کی کھال دیکھی اور ہمارے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے۔

ناگ کی موت

اس دلچسپ اور پُر حوصلہ داستان کا تعلق اس جنگ عظیم سے ہے جو سیگولی بنگلے میں رکی ٹکی اور ناگ اور ناگینہ کے درمیان لڑی گئی اور ناگ اور ناگینہ دونوں کی موت پر ختم ہوئی۔ رکی ٹکی ایک بہادر نیولا تھا۔ قد و قامت میں بلی سے چھوٹا مگر لمبائی میں اس سے کہیں لمبا چست و چالاک اور تیز و طرار، گہرا خاکستری رنگ، سرخی مائل آنکھیں اور لال لال لب جیسے پان کھایا ہوا ہو۔

سیگولی بنگلہ، سیگولی شہر سے کوئی چار فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس بنگلے کو چاروں طرف سے لیموؤں اور نارنگیوں کے باغ نے گھیرا ہوا تھا جب ان درختوں پر پھول کھلتے تو ان کی مہک دور دور تک پھیل جاتی۔ ماحول بڑا پُر سکون تھا لیکن یہ بنگلہ ایک عرصے سے غیر آباد پڑا تھا۔ بنگلے کی عمارت اگرچہ پرانی تھی لیکن مضبوط اور خوب صورت تھی اور اب تو مناسب مرمت اور سفیدی نے اس کا حسن نکھار دیا تھا۔ حکومت ان دنوں اس علاقے میں سڑکوں اور نہروں کا جال بچھا دینے پر تلی ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے یہ بنگلہ ساز و سامان سے آراستہ کر کے اپنے ایک انجینئر مسٹر اسٹیفن کے حوالے کر دیا تھا۔ چنانچہ اب اس بنگلے میں مسٹر اسٹیفن ان کی میم الزبیتھ اور دس بارہ سالہ لڑکا ولیم رہ رہے تھے۔

رات بڑے زور کی بارش ہوئی۔ یہ موسم سرما کی پہلی بارش تھی جس نے برس برس کر جل تھل ایک کر دیا تھا۔ صبح جب ولیم بستر سے اُٹھا تو یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ رات بارش ہوئی تھی۔ ناشتے سے فراغت پا کر اس نے اپنی ماں سے پوچھا ''ممی! کیا میں باغ میں جا سکتا ہوں؟''

''ہاں بیٹے تم وہاں جا سکتے ہو مگر ذرا احتیاط سے جانا، راستے میں ہر طرف پانی اور کیچڑ ہے، کہیں تم گر نہ جاؤ''۔ اس کی ماں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، ممی میں خیال رکھوں گا''۔ ولیم نے کہا اور باغ کی طرف چلا گیا۔

رات کی بارش نے باغ کے پھولوں اور پودوں کو بڑی فراخ دلی سے غسل دیا تھا۔ یہ سب ولیم کو بہت بھلے لگے۔ آسمان پر بادل اب بھی چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار برس رہی تھی۔ ایسے میں ولیم کا جی چاہا کہ وہ پورے باغ کا چکر لگائے۔ چنانچہ وہ قدم بڑھاتا چلا گیا۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پانی سے پُر تھے۔ یکا یک اس کی نظر ایک چھوٹے سے گڑھے پر پڑی جہاں پانی کی سطح پر ایک جانور پڑا ہوا تھا جسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خاموش اور بالکل ساکن۔

''یہ جانور کیا ہے؟'' اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر اس نے ایک لکڑی سے اسے ہلایا جلایا لیکن وہ تو اکڑا پڑا تھا۔ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر اس نے اس کو دم سے پکڑا اور اوپر اُٹھا لیا پھر وہ اسے اسی حالت میں بنگلے میں لے گیا۔

''ممی! دیکھو تو یہ کیا ہے؟'' وہ دور ہی سے چلایا۔

''ارے یہ تو نیولا ہے، تم اسے کہاں سے اُٹھا لائے؟'' ممی نے کہا۔

''ممی میرا خیال ہے، یہ پانی میں ڈوب کر مر گیا ہے۔ کیا میں اسے دفن کر دوں؟'' ولیم نے جواب دیا۔

''ٹھہرو بیٹا! میں دیکھتی ہوں، کہیں یہ زندہ نہ ہو۔ آؤ میرے ساتھ''۔ ممی نے کہا۔

ماں بیٹے کو ساتھ لے کر باورچی خانے میں پہنچی جہاں چولہے میں آگ جل رہی تھی۔ اس نے نیولے کو آگ کے قریب رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں ولیم یہ دیکھ کر خوشی سے چیخ اُٹھا کہ نیولے میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کے بدن میں حرکت ہونے لگی تھی پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ انگڑائی لی اور چھینک ماری۔ اب اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس نے ماحول کو قطعی اجنبی پایا پھر اسے یاد آیا کہ وہ تو گزشتہ رات اپنے بل میں تھا۔ آرام سے سو رہا تھا کہ نہ جانے بل میں کہاں سے پانی آ گیا۔ اس نے بل میں سے نکلنے کی کوشش بھی کی تھی مگر ناکام رہا۔ اس کے بعد کیا ہوا، اسے کچھ معلوم نہ تھا اور اب وہ اس چولہے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

''ممی یہ تو اب ٹھیک معلوم ہوتا ہے''

''تم تھوڑا سا دودھ پیالی میں لے آؤ، شاید یہ بھوکا بھی ہے''۔ ممی نے کہا۔

ولیم نے چھوٹی پیالی کو دودھ سے بھرا اور اس کے آگے رکھ دیا۔ نیولا واقعی بھوکا تھا۔ اس نے جھٹ اپنا منہ پیالی میں ڈال دیا اور جلدی ہی تمام دودھ اپنے پیٹ میں انڈیل لیا۔ اب مسٹر اسٹیفن بھی باورچی خانے میں پہنچ گئے۔

''الزبیتھ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟۔ ارے یہ نیولا کہاں سے آ گیا؟''۔ انہوں نے نیولے کو دیکھ کر کہا۔

''آپ کا بیٹا اسے باغ سے اُٹھا کر لایا ہے، یہ تو بالکل مردہ سا تھا، خدا کا شکر ہے اب ٹھیک ہے''۔ الزبیتھ نے جواب دیا۔

''ڈیڈی! کیا ہم اسے پال لیں؟'' ولیم نے اپنے باپ سے پوچھا۔

''نہیں ولیم''۔ الزبیتھ بیچ میں بول پڑی۔ ''اس جنگلی کیڑے کا کیا اعتبار کہیں وہ تمہیں نقصان نہ پہنچائے''۔

''الزبیتھ! ایسا نہیں ہوگا میں نے کئی لوگوں کو نیولا پالتے ہوئے دیکھا ہے وہ انسان سے محبت کرتا ہے اور اس سے جلد مل جاتا ہے''۔

''تب میں یہ نیولا ضرور پالوں گا''۔ ولیم نے کہا۔

''ہاں تم یہ نیولا ضرور پال سکتے ہو لیکن شرط یہ ہے کہ اس سے پیار سے پیش آؤ، اس کی دم نہ کھینچو اور نہ اسے پنجرے میں بند کرو ورنہ یہ بھاگ جائے گا''۔ مسٹر اسٹیفن نے کہا۔

''ٹھیک ہے ڈیڈی، میں اس سے دوستانہ برتاؤ کروں گا''۔ ولیم بولا۔

نیولے کا بدن اب سوکھ گیا تھا اور اس کے بدن اور دم کے بالوں کی چمک لوٹ آئی تھی۔ وہ خاصا باوقار لگ رہا تھا۔

''ولیم! تم اسے کھانے کے لیے کچھ گوشت دو''۔ مسٹر اسٹیفن نے کہا۔

ولیم اٹھا اور اس نے کچے گوشت کی تین چار بوٹیاں نیولے کے آگے ڈال دیں۔ نیولے نے انہیں بے حد پسند کیا اور جلدی جلدی ان سے اپنا پیٹ بھر لیا پھر اس نے پہلی مرتبہ آواز نکالی۔ ''رک ٹک ٹک۔''

''رک ٹک ٹک۔رک ٹک ٹک''۔ولیم نے ان کلمات کو دہرایا۔''ڈیڈی میں نے اپنے دوست کا نام سوچ لیا''۔ولیم نے کہا۔''رکی ٹکی''۔

''اچھا نام ہے ہم بھی اسے یہی کہا کریں گے''۔مسٹر اسٹیفن نے کہا۔میم صاحب نے بھی اس انوکھے نام کی تعریف کی۔

باورچی کو ادھر آتے ہوئے دیکھا تو مسٹر اسٹیفن، الزبیتھ اور ولیم باورچی خانے سے باہر نکل گئے۔رکی ٹکی کو ولیم نے اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھالا ہوا تھا۔اچانک اس نے اپنا جسم اُٹھایا اور ولیم کے کندھے پر چڑھ گیا پھر اس کے سر پر سے ہوتا ہوا دوسرے کندھے پر آ گیا۔اب دھوپ نکل آئی تھی۔لان میں کچھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔مسٹر اسٹیفن، الزبیتھ اور ولیم وہاں بیٹھ گئے۔رکی ٹکی نے ولیم کے کندھے سے چھلانگ لگائی اور دھوپ میں گھاس پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔اب وہ تازگی محسوس کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اُٹھا اور اس نے یہ دیکھنے کے لیے بنگلے کا چکر لگایا کہ یہاں اور کیا کچھ ہے، وہ کافی دیر تک بنگلے میں پھرتا رہا۔پہلے وہ غسل خانے میں گیا وہاں باتھ ٹب پانی سے بھرا ہوا رکھا تھا۔وہ اس پر اتنی تیزی سے چڑھا کہ اپنے زور میں پانی میں گر گیا اور ڈوبتے ڈوبتے بچا۔باتھ روم کی تلاشی لے کر وہ مسٹر اسٹیفن کے کمرے میں پہنچا اور ان کی میز پر چڑھ کر قلم دان میں بھری ہوئی نیلی سیاہی میں اپنا منہ ڈال دیا پھر فوراً اپنا منہ وہاں سے ہٹا کر نیچے فرش پر کود گیا اور اپنا منہ فرش پر رگڑنے لگا۔سیاہی بڑی تلخ تھی اور اس کا ذائقہ اسے بالکل پسند نہ آیا۔ممی کے کمرے میں زیادہ تر سنگھار کی چیزیں پڑی ہوئی تھیں، ظاہر ہے کہ میک اپ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھیں، قدرت نے اسے لال لال ہونٹ دے کر لپ اسٹک سے بے نیاز کر دیا تھا۔رات کو وہ ولیم کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا گیا وہاں اس نے گھوم پھر کر دیکھا کہ لیمپ کیسے جلتا ہے پھر وہ اس کے بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔سونے سے پہلے ولیم کے والدین یہ دیکھنے کے لیے اس کے کمرے میں آئے کہ وہ کیا کر رہا ہے، لڑکا سو رہا تھا لیکن وہ اس کے تکیے پر بیٹھا ہوا تھا، تمام رات وہ بڑا بے چین رہا جب بھی ذرا کھٹکا ہوتا تو وہ فوراً باہر نکل جاتا۔

صبح ناشتے کے لیے رکی ٹکی ولیم کے کندھے پر سوار ہو کر آیا۔ڈیڈی اور ممی اسے دیکھ کر خوش ہوئے، انہوں نے اس کو دودھ، گوشت اور اُبلا ہوا انڈا دیا جنہیں اس نے کمال رغبت سے کھایا۔آج وہ کل کی نسبت زیادہ تندرست اور چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ باغ کی طرف نکل گیا۔اس نے دیکھا کہ ایک درخت کی شاخ پر ایک شکر خورہ اور اس کی مادہ بیٹھے ہوئے آنسو بہا رہے ہیں، پاس ہی ان کا خوب صورت گھونسلا بھی تھا۔

''کیا بات ہے، تم لوگ رو کیوں رہے ہو؟''اس نے پوچھا۔

''ہم بہت بدقسمت ہیں، آج صبح ہمارے دو بچے گھونسلے سے نیچے گر گئے تھے جنہیں ہماری فریاد کے باوجود ناگ کھا گیا۔''شکر خورے نے جواب دیا۔

''ہوں! واقعی یہ بڑے افسوس اور رنج کی بات ہے لیکن یہ ناگ کون ہے؟''اس نے دریافت کیا۔

شکر خورہ کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ پاس ہی گہری گھاس میں سرسراہٹ محسوس ہوئی اور سیاہ ناگ نے اپنا دو فٹ لمبا پھن اُٹھایا اور اسے پوری طرح پھیلا کر غصے سے لہرانے لگا، اس نے رکی ٹکی پر اپنی نظریں جما لیں اور پھنکارتے ہوئے کہا۔

''ناگ کون ہے؟ ناگ میں ہوں اور تم کون ہو ذلیل چوہے؟''

ناگ کہنے کو تو اسے ذلیل چوہا کہہ گیا تھا مگر پہچان گیا تھا یہ تو نیولا ہے، اس کا ازلی و ابدی دشمن۔

رکی ٹکی ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے اتنا بڑا ناگ اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ پھر اسے یاد آ گیا کہ یہ ناگ بہت بڑا سہی مگر ہے تو سانپ ہی اور کتنے ہی مردہ سانپ اس کی ماں نے لا لا کر اسے کھلائے تھے۔ اسے اپنی ماں کی تعلیم بھی یاد آ گئی کہ ہم نیولوں کا مقصدِ زندگی سانپوں سے لڑنا بھڑنا ہے اور ان کی نسل کو تباہ و برباد کرنا ہے۔

جب رکی ٹکی کو ناگ کی حقیقت معلوم ہو گئی تو وہ بھی جوش میں آ گیا۔ غصے کے مارے اس کی دم کے بال پھول گئے اور اس نے نڈر ہو کر ناگ کو جواب دیا۔ ''میں کوئی بھی ہوں لیکن کیا یہ اچھی بات ہے کہ تم اتنے بڑے ناگ ہو کر ننھے ننھے بچوں کو کھا جاؤ۔ ان سے تو تمہارا پیٹ بھی نہیں بھرے گا''۔

ناگ اس لمحے کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس باغ میں ایک نیولے کی موجودگی اس کے لیے جلد یا بدیر موت کا پیغام لا سکتی ہے۔ آخر وہ پھنکارا: ''یہ دیکھنا میرا کام ہے لیکن تم دخل اندازی کرنے والے کون ہو؟ بہتر ہے میرے راستے سے ہٹ جاؤ اور فوراً یہ باغ چھوڑ دو، ورنہ اچھا نہ ہوگا''۔

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پیچھے سے ناگینہ گھاس میں رینگتی ہوئی رکی ٹکی کے قریب آن پہنچی، وہ اس پر حملہ کرنا چاہتی تھی کہ شکر خورے کی نظر اس پر پڑی وہ چلایا۔ ''میاں نیولے ناگینہ خبردار!''

رکی ٹکی اُچھلا، پلٹا اور ناگینہ کی کمر پر آ گیا، لیکن ناگینہ نے اسے جھٹک کر الگ کر دیا، اگر کوئی پرانا تجربہ کار نیولا ہوتا تو وہ ناگینہ کی کمر توڑ ڈالتا۔ رکی ٹکی نے اسے کاٹا تو سہی مگر وار اوچھا پڑا۔ ویسے بھی ناگ اور ناگینہ سے بیک وقت جنگ لڑنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

''بدمعاش شکر خورے! میں جلد ہی تم سے نمٹوں گا''۔ ناگ پھنکارا۔

رکی ٹکی کی آنکھیں مارے غصے کے گرم اور سرخ ہو رہی تھیں، وہ کنگرو کی طرح اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی دم بار بار بل کھا رہی تھی لیکن ناگ اور ناگینہ میدان چھوڑ کر جا چکے تھے چنانچہ وہ بھی اُٹھا اور بنگلے کی طرف چلا گیا۔ راستے میں اسے ولیم مل گیا جس نے اسے اُٹھا لیا اور پیار کیا۔ لیکن جونہی ولیم اسے لے کر چلا رکی ٹکی نے دیکھا کہ قریب ہی گھاس میں کوئی چیز حرکت کر رہی ہے، رکی ٹکی نے فوراً چھلانگ لگائی اور اس پر ٹوٹ پڑا۔ یہ کریٹ سانپ تھا۔ کریٹ سانپ بہت چھوٹے قد کا سانپ ہوتا ہے لیکن ناگ کی طرح سخت زہریلا ہوتا ہے۔ رکی ٹکی نے اسے پکڑنے کی بڑی کوشش کی لیکن یہ چھوٹا سا سانپ، سانپ نہیں، بجلی تھا۔ تڑپ کر کبھی اِدھر ہو جاتا کبھی اُدھر، لیکن قابو میں نہ آ رہا تھا۔ ادھر ولیم اس کے خطرناک ہونے سے بے خبر تماشا دیکھنے میں مصروف تھا کہ مسٹر اسٹیفن کی آواز آئی۔

''کیا ہے ولیم تم کیا دیکھ رہے ہو؟''

''ڈیڈی جلدی اِدھر آیئے اور ہمارے نیولے کی لڑائی دیکھیے'' ولیم چلایا۔

کریٹ بے قابو ہو کر بھاگنے لگا تھا لیکن رکی ٹکی بھلا اس کو کب چھوڑنے والا تھا۔ وہ لپک کر اس کی گردن پر سوار ہو گیا اور بری طرح اسے کاٹا کہ سانپ کا تمام زور ختم ہو گیا، اتنے میں مسٹر اسٹیفن بھی اپنی ہاکی لے کر آ گئے اور اس کی دو تین ضربوں نے کریٹ کا کام تمام کر ڈالا۔ جب مسٹر

اسٹیفن نے الزبیتھ کو اس خطرناک سانپ کے متعلق بتایا تو وہ بڑی پریشان ہوئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور رکی نکی کی دلیری کی تعریف کی جس کی وجہ سے ولیم اس خطرناک سانپ کے حملے سے بچ گیا۔

رات رکی نکی کو بہترین کھانا ملا جسے اس نے پیٹ بھر کر کھایا۔ وہ اپنے آج کے کارنامے پر بڑا خوش تھا لیکن ناگ اور ناگینہ ابھی زندہ تھے۔ ولیم اسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گیا اور اسے اپنے پاس سلایا، جب ولیم سو گیا تو رکی نکی بستر سے اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہاں اندھیرے میں اس نے ایک چھچھوندر کو جاتے ہوئے دیکھا تو وہ اس کے پیچھے دوڑا۔

''ٹھہرو تم نیولے، ہم چھچھوندروں کو نہیں پکڑا کرتے''۔ چھچھوندر نے کہا۔

''کیوں؟'' نیولے نے پوچھا۔

''ذرا میرے قریب آؤ''۔

''اف تم میں سے تو بڑی بُری بو آ رہی ہے''۔

''ہاں یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی ہم سے نفرت کرتا ہے''۔

''ٹھیک ہے، تم جا سکتی ہو''۔

''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے''۔

''کیا؟''

''کل تم اور تمہارے صاحب نے کسی سانپ کو مارا تھا''۔

''ہاں مارا تو تھا''۔

''وہ سانپ کریٹ تھا، ناگینہ کا بھتیجا۔ وہ نہایت غصے میں تھی اور اپنے ناگ سے بدلہ لینے کے لیے کہہ رہی تھی۔ شاید آج رات ہی، تم سب لوگ ہوشیار رہو، ہاں ذرا سنو تو، یہ سرسراہٹ سی کیا ہے، کہیں ناگ اور ناگینہ تو قریب نہیں آ رہے''۔

''کچھ آہٹ تو میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ میں ابھی جا کر تمام کمروں کو دیکھتا ہوں''۔

☆☆☆

رکی نکی نے چھچھوندر کا شکریہ ادا کیا اور بنگلے میں واپس چلا گیا۔ اس نے ولیم کا کمرہ دیکھا، وہاں مطمئن ہو کر وہ ممی کے کمرے میں گیا، وہاں ہر چیز اسے ٹھیک نظر آئی۔ پھر وہ صاحب کے کمرے میں داخل ہوا اور اس کا بہ نظر غائر جائزہ لیا۔ ناگ کے حملے کا یہاں زیادہ احتمال تھا کیونکہ کریٹ کے مارنے والوں میں اس کے ساتھ صاحب بھی شامل تھے لیکن یہاں بھی اسے خطرے کا احساس نہ ہوا۔ باورچی خانہ بھی درست حالت میں تھا۔ اب غسل خانہ باقی رہ گیا تھا۔ جوں ہی وہ غسل خانے میں داخل ہوا، غسل خانے کی نالی سے باہر باغ میں اسے ناگ اور ناگینہ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے سنا ناگینہ کہہ رہی تھی کہ جب تک یہ لوگ یہاں موجود ہیں۔ وہ کم بخت نیولا بھی یہیں رہے گا۔ تم ایسا کرو کہ سب سے

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت
ابا قہ
طاہر جاوید مغل
دو جلدوں میں مکمل
قیمت فی جلد 400 روپے
بہترین کمپوزنگ خوبصورت جلد اور عمدہ طباعت کے ساتھ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور 7247414
تقسیم کار
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

پہلے اس آدمی کو ڈسو جس نے آج میرے بھتیجے کو مارا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کی بیوی اور بچہ اور یہ نیولا بھی یہاں سے چلے جائیں گے"۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ اس کی موت کے بعد نیولے کا مسئلہ حل ہو جائے گا"۔ ناگ نے پوچھا۔

"ہاں میں یقین سے کہتی ہوں، جب یہ لوگ یہاں نہیں آئے تھے۔ یہاں کوئی نیولا نہیں تھا۔ یہ بنگلہ خالی پڑا تھا اور ہم لوگ بادشاہ اور ملکہ کی طرح اس باغ میں رہ رہے تھے۔ اب تو مجھے اپنے بچوں کا بھی ڈر ہے، وہ چند ہی دنوں میں انڈوں سے نکلنے والے ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کے لیے بھی جگہ کی ضرورت محسوس ہوگی۔" ناگینہ نے کہا۔

"اچھا شب بخیر۔ میں رات اس غسل خانے میں گزاروں گا اور صبح تمہارے پاس آ کر تمہیں خوش خبری سناؤں گا"۔ ناگ نے کہا۔

رکی ٹکی نے ناگ اور ناگینہ کی یہ باتیں بڑے غور سے سنیں۔ پھر خاموشی طاری ہوگئی، اب پیشتر اس کے کہ ناگ غسل خانے کی نالی کے ذریعے غسل خانے میں داخل ہوتا، رکی ٹکی نے قریبی الماری میں اپنے لیے پناہ گاہ تلاش کر لی جہاں سے وہ ناگ کی نقل و حرکت کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نالی سے ناگ کا سر برآمد ہوا اور پھر اس کا جسم بھی جو بلاشبہ پانچ فٹ لمبا تھا۔ اس نے اپنا پھن اُٹھایا اور اسے پانی کے ڈول میں ڈال کر پانی پینے لگا۔ پیاس بجھی تو وہ اپنا منہ نالی کے قریب لے گیا اور کہنے لگا۔

"میری پیاری ناگینہ تم سن رہی ہو نا، جب بڑے صاحب نے کریٹ کو مارا تھا تو اس کے ہاتھ میں ہاکی تھی لیکن جب وہ صبح نہانے کے لیے یہاں آئے گا تو اس کے ہاتھ میں ہاکی نہیں ہوگی اور میں اس سے بخوبی نمٹ لوں گا"۔ لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ رکی ٹکی نے سوچا کہ ناگینہ چلی گئی ہے۔

☆☆☆

ناگ کو یہاں کا ٹھنڈا ماحول بہت پسند آیا۔ اس نے ڈول کے گرد اپنے آپ کو لپیٹنا شروع کر دیا تا کہ اس کے پورے جسم کو ٹھنڈک محسوس ہو۔ رکی ٹکی اسے نہایت خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد اسے اطمینان ہو گیا کہ ناگ اب سو چکا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس طاقتور دشمن پر کیسے حملہ کیا جائے۔ آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی نتیجہ برآمد ہو، وہ اپنے اس طاقتور دشمن سے ضرور جنگ کرے گا وہ الماری سے دبے قدموں اتر پڑا اور رینگ رینگ کر آگے بڑھنے لگا۔ ناگ کا پورا جسم ڈول کے گرد لپٹا ہوا تھا لیکن اس نے اپنا سر فرش پر ڈال رکھا تھا۔ اب وہ ناگ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا، مزید تاخیر کو اس نے نامناسب سمجھا، وہ ایک دم جھپٹا اور اس نے ناگ پر حملہ کر دیا۔ اس نے اس کی گردن کو اپنے منہ میں دبا لیا۔ ناگ فوراً جاگ اُٹھا، اس کے غیظ و غضب کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، وہ اپنے جسم کے پیچ کھول چکا تھا اور غصے سے اپنے پورے بدن کو فرش پر دے دے کر مار رہا تھا۔ رکی ٹکی کی ہڈی پسلی ایک ہو رہی تھی لیکن اس نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ جوں جوں ناگ اپنے بدن کو اِدھر اُدھر فرش پر مارتا توں توں رکی ٹکی کے دانت اس کی گردن میں پیوست ہو رہے تھے اور وہ اس کو کسی طور پر چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ غسل خانے میں ایک قیامت برپا تھی۔ ڈول، بالٹیاں، ڈونگے، صابن دانیاں غرض ہر شے تہ و بالا تھی۔

رکی ٹکی پر جو کچھ بیت رہی تھی، اس کا علم اس بے چارے کے سوا کس کو تھا۔ چھیڑنے کو تو اس نے یہ جنگ چھیڑ دی تھی لیکن اس کا انجام اس قدر بھیانک ہوگا، وہ اس سے بے خبر تھا۔ ناگ کی گردن تو اس نے دبا رکھی تھی لیکن اس کا جسم چابک کی مانند رکی ٹکی کی تواضع کر رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو جاتا۔ اس نے دھائیں دھائیں کی خوف ناک آوازیں سنیں جیسے کمرے میں بادل گر جا ہو، بجلی کڑکی ہو۔ دھماکا اس قدر زبردست تھا کہ اس کے منہ سے ناگ کی گردن چھوٹ گئی جس کا اسے کمال افسوس تھا۔ یہ رکی ٹکی کے جذبات تھے لیکن ہوا یہ تھا کہ اس جنگ کے شور و شغب سے مسٹر اسٹیفن کی آنکھ کھل گئی۔ اپنی ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے جنگ کا یہ منظر دیکھا تو ٹارچ چوکیدار کو دے کر بندوق سے دو فائر ناگ پر کیے جن سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ رکی ٹکی کو اس وقت ناگ کے چھوٹ جانے کا افسوس ہوا تھا لیکن اس واقعہ کے تھوڑی دیر بعد جب وہ سنبھلا تو ناگ کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم دیکھ کر بے حد مسرت محسوس کر رہا تھا لیکن ناگینہ ابھی باقی تھی۔

اسی اثناء میں الزبیتھ بھی وہاں آ گئی۔ مسٹر اسٹیفن نے بڑے پیار سے رکی ٹکی کو اپنے ہاتھوں میں اُٹھا لیا اور اپنی بیوی کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ ''الزبیتھ! اس چھوٹے سے جانور نے ایک مرتبہ پھر ہمیں بچا لیا،'' جب الزبیتھ نے ناگ کے مردہ جسم پر نظر ڈالی تو اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ اگلی صبح، وہ بڑا خوش و خرم تھا، وہ اپنے رات کے کارنامے پر حیران تھا کہ کیا واقعی ناگ ختم ہو چکا ہے لیکن وہ ناگینہ! جب اسے اپنے شوہر کا انجام معلوم ہوگا تو کیا اس کی آتش انتقام بھڑک نہ اٹھے گی۔ وہ کم بخت اکیلی پانچ ناگوں سے کم خطرناک نہیں ہے اور ہاں وہ اس کے انڈے کہاں ہیں، ان کا بھی تو کچھ کرنا ہے۔ خیر میں چلتا ہوں اور اپنے دوست شکر خورے سے ملتا ہوں۔

آج اس نے ناشتے کی بھی پروا نہ کی۔ وہ سیدھا باغ میں پہنچا اور دیکھا کہ شکر خورہ اور شکر خوری خوشی کے گیت الاپ رہے ہیں۔ آج ان کا ایک دشمن ختم ہو چکا تھا۔

''خاموش خاموش! بے وقوف پرندو! ابھی خوشی کے گیت گانے کا موقع نہیں آیا''۔ رکی ٹکی نے پکارا۔

''ناگ مر گیا، ناگ مر گیا، رکی ٹکی نے اسے پکڑا۔ بڑا صاحب بندوق لے آیا اور ناگ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اب وہ ہمارے بچوں کو کبھی نہ کھائے گا''۔ پرندے بدستور گاتے رہے۔

''یہ تو درست ہے، مگر ناگینہ ابھی باقی ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے''۔ رکی ٹکی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ناگینہ غسل خانے کی نالی میں ناگ سے ملنے کے لیے آئی، مگر ناگ وہاں کہاں تھا۔ اسے تو خاکروب نے اپنی بالٹی میں اُٹھایا ہوا تھا اور اسے گندگی کے ڈھیر پر پھینک رہا تھا۔ آؤ ہم عظیم رکی ٹکی کی عظمت کو سلام کریں اور اس کی دلیری کے گن گائیں''۔ پرندے گانے میں مصروف تھے۔

''خدا کے لیے ذرا خاموش ہو جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ ناگینہ نے انڈے کہاں دیئے ہوئے ہیں؟ تمہیں معلوم نہیں، اگر انڈوں سے بچے نکل آئے تو معاملہ کتنا سنگین ہو جائے گا''۔ رکی ٹکی نے کہا۔

''تربوزوں کی کیاری میں، جہاں تمام دن سورج چمکتا ہے۔ اس نے تین ہفتے پہلے انڈے دیئے تھے، وہ اب بھی وہیں موجود ہوگی''۔ شکر خورے نے جواب دیا۔

''میرے پیارے بھائی'' رکی ٹکی نے کہا۔ ''تم ایسا کرو کہ تربوزوں کی کیاری کے قریب جاؤ! اور وہاں اس طرح پھڑ پھڑاؤ کہ جیسے تمہارا بازو ٹوٹ گیا ہے اور تم سے اُڑا نہیں جا رہا ہے، تم یہ کام کرو اور میں تمہارے پیچھے پیچھے چلا آتا ہوں''۔ رکی ٹکی نے شکر خورے سے کہا۔

''یہ کام میں بہتر طریقے سے کروں گی''۔ شکر خوری نے کہا، چنانچہ وہ اُڑ کر تربوزوں کی کیاری کے قریب پہنچی اور پھڑ پھڑانا شروع کر دیا۔ ناگینہ واقعی وہاں موجود تھی۔ اس نے جو شکر خوری کو پھڑ پھڑاتے دیکھا وہ انڈوں سے اُٹھی اور اس کی طرف لپکی لیکن شکر خوری پھڑ پھڑاتی ہوئی، مخالف سمت جا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ناگینہ انڈوں سے زیادہ سے زیادہ دور چلی جائے اور رکی ٹکی کو موقع مل جائے کہ وہ تمام انڈوں کو ضائع کر دے۔

''ہائے میرا بازو ٹوٹ گیا۔ مجھے شریر لڑکے نے پتھر مار کر زخمی کر دیا ہے، مجھے کس قدر تکلیف ہے''۔ شکر خوری چلا رہی تھی۔ ناگینہ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی تھی، وہ کہہ رہی تھی کہ اب میں تم کو نہیں چھوڑوں گی اور تم ہی کیا میں تمہارے شکر خورے، اس ذلیل چوہے، بڑے صاحب، اس کی میم اور ان کے بچے سب سے نمٹوں گی۔ میں دیکھوں گی، میرے ناگ کو مار کر تم میں سے کون زندہ رہتا ہے، ٹھہرو تم جاتی کہاں ہو؟''

شکر خوری اس طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی، ناگینہ کو کافی دور لے گئی۔ رکی ٹکی نے یہ منظر دیکھا تو لپک کر تربوزوں کی کیاری میں پہنچا، اس نے دیکھا کہ وہاں پچیس انڈے رکھے ہوئے ہیں جن سے عنقریب بچے نکلنے والے ہیں۔ اس نے جلد از جلد انڈوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ اب تین انڈے باقی رہ گئے تھے کہ شکر خورہ تیزی سے اڑتا ہوا رکی ٹکی کی طرف آیا اور کہنے لگا۔ ''غضب ہو گیا، میرے دوست ناگینہ شکر خوری کو چھوڑ کر بنگلے کا رُخ کر چکی ہے، جلد وہاں پہنچو'' رکی ٹکی نے چلتے چلتے دو انڈے اور ضائع کر دیئے اور تیسرے کو منہ میں لے کر بنگلے کی طرف دوڑ پڑا، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ناشتہ کی میز پر گھر کے مکین گم صم بیٹھے ہیں اور ان کے چہرے خوف سے زرد ہیں۔ اس لمحے رکی ٹکی کی نظر ناگینہ پر پڑی جس کا دو فٹ اونچا پھن غیظ و غضب کے عالم میں ادھر ادھر لہرا رہا تھا اور ولیم تو بالکل ہی اس کی زد میں تھا۔

ناگینہ کو دیکھتے ہی رکی ٹکی چلایا۔ ''ناگینہ! تمہارا انڈا!!'' ناگینہ نے فوراً اپنا پھن موڑا اور دیکھا کہ ایک انڈا فرش پر پڑا ہے۔

''میرا انڈا مجھے دے دو، ورنہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا''۔ یہ کہتے ہوئے ناگینہ تیزی سے انڈے کی طرف مڑی لیکن رکی ٹکی انڈے کو اپنے دونوں پنجوں کے درمیان رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔

''بولو کیا قیمت دو گی، تم اپنے اس انڈے کی ایک ناگ کے بچے کی، لیکن تمہیں پتہ ہے تمہارے دوسرے انڈوں کا کیا حال ہے؟ کیڑے مکوڑے ان کو کھا رہے ہیں''۔ رکی ٹکی نے کہا۔

ناگینہ کو ادھر متوجہ دیکھا تو مسٹر اسٹیفن تیزی سے اُٹھے اور الزبیتھ اور ولیم کو ناشتے کی میز سے اُٹھا کر ڈرائینگ روم میں محفوظ جگہ پر لے گئے۔ انہوں نے بندوق اُٹھائی، کارتوس لگائے اور باہر نکل گئے۔

''مجھے میرا انڈا دو، میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں آج ہی یہاں سے چلی جاؤں گی اور پھر کبھی اِدھر کا رُخ نہیں کروں گی''۔ ناگینہ گڑگڑائی۔

''تمہیں ضرور جانا پڑے گا لیکن کہیں باہر نہیں بلکہ کوڑے کے ڈھیر میں، اپنے ناگ کے پاس، بڑے صاحب بندوق لینے گئے ہیں اور ابھی تمہارا فیصلہ کر دیا جائے گا''۔ رکی ٹکی نے جواب دیا۔

ناگینہ کو اب غصہ آ گیا تھا، وہ تیزی سے اس پر جھپٹی لیکن رکی ٹکی طرح دے گیا۔ وہ اب لڑتے لڑتے برآمدے سے باہر چلے جا رہے تھے۔ اس لڑائی میں رکی ٹکی انڈے کو بھول گیا تھا اور وہ ابھی تک برآمدے کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اچانک ناگینہ پلٹی، برآمدے میں آئی اور انڈے کو منہ میں اُٹھا کر تیر کی طرح باہر نکل گئی۔ اب ناگینہ کا تعاقب نہ صرف رکی ٹکی کر رہا تھا بلکہ مسٹر اسٹیفن بھی اپنی بندوق ہاتھ میں لیے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ ناگینہ کی رفتار اس گھوڑے کی طرح تیز تھی جس پر چابک برس رہے ہوں۔ ایسے میں مسٹر اسٹیفن کے لیے ناگینہ کا نشانہ لینا قریب قریب ناممکن ہو چکا تھا۔ اس منظر کو شکر خوری نے بھی دیکھا، کچھ سوچا، اُڑی اور اپنے پر ناگینہ کے منہ پر مار مار کر اس کی رفتار کی تیزی کو قدرے کم کر دیا، ادھر ناگینہ کا بل بھی قریب آ گیا تھا۔ شکر خوری نا اُمید ہو کر بل سے آگے کی طرف اُڑتی چلی گئی، جوں ہی ناگینہ نے اپنا منہ بل میں داخل کیا۔ ''دھائیں'' ''دھائیں'' مسٹر اسٹیفن کی بندوق کے دو فائر ہوئے جنہوں نے ناگینہ کے جسم کو چھلنی چھلنی کر دیا۔ رکی ٹکی اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا چلا آ رہا تھا، اسے کوئی چھرا تو نہ لگا ہاں فائروں کی خوف ناک آوازوں نے اسے بے ہوش ضرور کر دیا تھا۔

رات کو رکی ٹکی نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ پھر وہ ولیم کے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ رات گئے جب الزبیتھ ولیم کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ نہ صرف ولیم بلکہ اس کی بغل میں رکی ٹکی بھی آرام سے محوِ خواب ہے۔ دونوں ناگ مر چکے تھے اور ان کے پچیس انڈے ضائع ہو چکے تھے۔

تساؤ کے آدم خور

تساؤ کے آدم خور..... شکاریات کے موضوع پر ایک مستند کتاب اور حقائق پر مبنی سچا واقعہ..... یوگنڈا (کینیا) کے دو خونخوار شیر جو آدم خور بن گئے تھے..... ایک سال کی قلیل مدت میں 140 انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے والے تساؤ کے آدم خور..... جنہوں نے یوگنڈا میں بچھنے والی ریلوے لائن کا کام کھٹائی میں ڈال دیا تھا۔ جو لومڑی سے زیادہ مکار تھے اور چھلاوہ کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ اس سچے واقعے پر انگلش فلم ''Ghost & The Darkness'' بھی بنائی گئی۔ جون ہنری پیٹرسن (فوجی اور ریلوے لائن کام کا انچارج) کی کتاب (The Man-Eaters of Tsavo) کا اُردو ترجمہ **کتاب گھر** پر **شکاریات** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

انعام

میں ایک جنگل میں شکار کی تلاش میں سفر کر رہا تھا کہ اچانک مجھے چلتے چلتے رُکنا پڑا، پیچھے کچھ آواز سنائی دی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک ریچھ پر نظر پڑی جو دور سے بھاگتا چلا آ رہا تھا۔

میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یا تو ریچھ نے مجھے دیکھ لیا ہے اور اب حملے کی خاطر میری جانب بڑھ رہا ہے یا کسی درندے سے ڈر کر بھاگ آیا ہے۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی جہاں چھپ کر جان بچا سکتا۔ میرے قریب ہی ایک درخت تھا، میں یہ سوچ کر تیزی سے اوپر چڑھ گیا کہ اگر ریچھ نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا تو یقیناً بھاگتا ہوا، آگے نکل جائے گا اور جب وہ کافی دور چلا جائے گا تو میں نیچے اتروں گا۔ اب میں زمین سے بیس پچیس فٹ کی اونچائی پر تھا، میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور ریچھ کو آتے ہوئے دیکھنے لگا۔

ریچھ جب ذرا قریب پہنچا تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، وہ اچانک رُکا، ایک نظر مجھ پر ڈالی اور نہایت تیزی سے اسی درخت پر چڑھنے لگا جس پر میں تھا، میری جان ہی نکل گئی۔

سوچنے سمجھنے کی سوجھ بوجھ جاتی رہی۔ دل کی دھڑکن خوف ناک حد تک تیز ہو گئی اور جسم میں خون منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ یوں معلوم ہونے لگا جیسے ابھی گرنے والا ہوں۔ لیکن ریچھ مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے تیزی سے میرے قریب سے گزرا اور ایک دو گز اوپر جا کر ایک موٹی شاخ پر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ بندوق جو میرے ہاتھ میں تھی معجزانہ طور پر گرنے سے بچ گئی تھی۔

ریچھ کبھی میری طرف اور کبھی اس طرف جس طرف سے وہ آیا تھا، دیکھتا۔ اب میں نے اندازہ لگایا کہ ریچھ کچھ بوکھلایا ہوا ہے اور غالباً کوئی درندہ اس کے تعاقب میں ہے، چند لمحے ہی گزرے ہوں کہ میں نے ایک شیر کو تیزی سے آتے دیکھا۔ اب معمہ حل ہو گیا۔ یقیناً یہی ریچھ کا تعاقب کر رہا تھا۔ اب میں اپنے آپ پر پوری طرح سے قابو پا چکا تھا۔

شیر جب ہم سے چند گز کے فاصلے پر پہنچا تو رُک گیا۔ اس نے شاید ہماری بو پا لی تھی۔ شیر نے اپنا بڑا سا سر اوپر اُٹھایا اور درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے جلد ہی ہمیں ڈھونڈ لیا اور غصے میں غرایا۔ وہ خوش بھی ہوا ہو گا کہ وہ ایک شکار کے تعاقب میں نکلا مگر اب دو شکار اس کے سامنے تھے۔ ایک ریچھ اور دوسرا میں۔ مجھے شیر سے زیادہ خوف محسوس نہیں ہوا کیونکہ میں اتنے فاصلے پر تھا کہ وہ جست لگا کر مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

شیر ہمارے درخت کے نیچے آ چکا تھا۔ وہ کچھ دیر تو کھڑا ہمیں گھورتا رہا پھر وہیں بیٹھ گیا لیکن اس کی نظریں اب بھی ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ اب میرے لیے بڑا پریشان کن لمحہ تھا۔ میں دو درندوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ شیر کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ کب تک بیٹھا رہے گا، آخر کبھی تو اسے جانا ہی ہو گا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ریچھ کو مار گرایا جائے، ایک تو ریچھ سے جان بچے گی، دوسرے شیر بھی شاید بندوق کی آواز

سے بھاگ جائے، میں نے فوراً بندوق کی نالی ریچھ کی طرف کر دی۔ ٹریگر دبانے ہی والا تھا کہ ریچھ نے کمال پھرتی سے نالی کا اگلا سرا پکڑ لیا اور نالی کو نیچے کی طرف جھٹک دیا اور پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ میں نے دوبارہ بندوق ریچھ کی طرف کی مگر اس بار بھی ریچھ نے بندوق کی نالی نیچے کر دی۔ میں نے کئی بار ریچھ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار اس نے بندوق نیچے کر دی۔ اس نے چند ایسے اشارے بھی کیے جن سے میں بخوبی سمجھ گیا کہ ریچھ مجھے شیر کو مارنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ میں نے ریچھ سے نظریں ملائیں تو اس کی آنکھوں میں التجا کی جھلک دیکھ کر مسکرا دیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ ریچھ مجھے نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ دوسرے ہی لمحے میں شیر کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

شیر بدستور سر اُٹھائے ہوئے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے بندوق کی نالی شیر کی طرف کی، سر کا نشانہ لیا اور اللہ کا نام لے کر گولی چلا دی۔ شیر کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ دوسرے ہی لمحے وہ زمین پر پڑا، ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میں نے ایک اور فائر کیا اور درندہ خاموش ہو گیا۔ اب میں ریچھ کی طرف دیکھنے لگا۔ ریچھ کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا اور شیر کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید اسے ابھی تک اس کے مرنے کا یقین نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ احتیاط سے آہستہ آہستہ درخت سے نیچے اترا اور ایک طرف کو چلا گیا۔ میں نے سمجھا کہ شاید واپس جانے لگا ہے مگر وہ ایک درخت کی چھوٹی سی سوکھی ٹہنی اُٹھا کر واپس آ گیا۔

ریچھ شیر کے قریب آیا اور ٹہنی کا دوسرا سرا شیر کے کان میں زور زور سے گھمانے لگا۔ جب شیر کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو ریچھ کو یقین آیا کہ واقعی شیر مر چکا ہے میں ریچھ کی اس چالاکی پر بڑا حیران ہوا۔

ریچھ نے شیر کے مرنے کا یقین کر لینے کے بعد ایک دفعہ میری طرف دیکھا جیسے وہ میرا شکریہ ادا کر رہا ہو اور پھر جس طرف سے آیا تھا، اسی طرف تیزی سے بھاگتا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆

اب میں درخت سے نیچے اتر آیا۔ میں بہت جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا، کیونکہ ڈر تھا کہ کہیں ریچھ کی نیت میں فتور نہ آ جائے اور وہ دوبارہ آن ٹپکے۔ چنانچہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ایک طرف چل دیا۔ میں ابھی چند فرلانگ تک ہی گیا ہوں گا کہ پیچھے سے دوبارہ ریچھ کی آواز سنائی دی، میں نے فوراً گھوم کر دیکھا۔ ریچھ کچھ فاصلے سے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اس دفعہ وہ درخت کی لمبی ٹہنی بھی کندھے پر اُٹھائے ہوئے تھا۔

میں نے دل میں کہا پہلے تو کسی طرح جان بچ گئی، اب کی بار مارے گئے۔ اب کسی جگہ چھپنا بے سود تھا کیونکہ ریچھ مجھے دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ وہاں کھڑا رہا اور دل میں دعا کی "یا خدا جس طرح تو نے پہلے بچا لیا تھا، اس دفعہ بھی بچا لے"۔

ریچھ ہر لمحے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ بندوق بھی اب خالی تھی، اس سے پہلے کہ میں بندوق بھرتا ریچھ سر پر پہنچ گیا۔ میں یہی خیال کر رہا تھا کہ ابھی ریچھ حملہ آور ہوا چاہتا ہے۔ مجھے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا محسوس ہوا، لیکن یہ کیا! ریچھ ٹہنی میرے پاس پھینک کر واپس بھاگنے لگا، میں نے ٹہنی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا اور ریچھ کو جاتا دیکھتا رہا۔ جب ریچھ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ٹہنی کی طرف متوجہ ہوا۔ میں یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ ٹہنی کے ایک سرے پر شہد کا ایک چھتہ لگا ہوا تھا اور اس پر شہد کی مکھیاں بھی نہ تھیں۔ میں نے جب اسے ٹٹولا تو اسے شہد سے بھرا ہوا پایا۔ یہ شاید

شیر کے ہلاک کرنے کے صلے میں میرا انعام تھا۔

شام ڈھلے تک مجھے اور کوئی بھی شکار نہ مل سکا اور میں نے ایک ایسے غار کو شب بسری کے لیے منتخب کیا جس کے قریب ہی ایک بہت بڑی جھیل تھی۔ غار کچھ اونچائی پر واقع تھا، جہاں سے جھیل صاف طور پر نظر آتی تھی۔ غار کے بائیں جانب ایک اونچی پہاڑی تھی، دائیں طرف کی پہاڑیاں زیادہ اونچی نہ تھی۔ غار کا منہ اور سامنے کا حصہ دن کو تو روشن رہتا لیکن جب سورج غروب ہونے کو ہوتا تو بائیں جانب کی پہاڑی کے سائے کی وجہ سے غار کے اس حصے میں قدرے اندھیرا چھا جاتا، جس کی وجہ سے غار کے منہ پر بیٹھا آدمی تو جھیل اور آس پاس کے علاقے بخوبی دیکھ سکتا تھا مگر جھیل کے نزدیک سے اسے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔

سورج غروب ہونے کو تھا، میں غار کے منہ پر بیٹھا جھیل اور اِرد گرد پھیلے ہوئے ہرے بھرے درختوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک شیر درختوں کے پیچھے سے برآمد ہوا۔ وہ خراماں خراماں جھیل کی طرف آ رہا تھا۔ غالباً پیاس بجھانے کی فکر میں تھا۔ غار کے منہ پر اندھیرا تھا مگر پھر بھی میں ذرا اندر کو سرک گیا کہ کہیں جنگل کے بادشاہ کی نظر نہ پڑ جائے اور مفت میں کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔

شیر جھیل کے کنارے پہنچا اور منہ پانی میں ڈال دیا۔ شیر کو پانی پیتے ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ایک کالے رنگ والے جانور نے اپنا بڑا سا منہ پانی سے باہر نکالا۔ میں نے اس قسم کا آبی جانور پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ جانور چشم زدن میں شیر کو دبوچ کر پانی میں لے گیا۔ پانی میں اُچھل کود شروع ہو گئی اور آبی جانور اور شیر میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ میں بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ جنگل میں درندوں کے درمیان اس قسم کی لڑائی دیکھنا نصیب ہوئی۔

شیر کئی بار پانی سے اُبھرا لیکن دوبارہ دبوچ لیا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شیر کا انجام کیا ہوگا۔ میرا تمام جسم لرز رہا تھا اور منہ اور گلا خشک محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر تک یونہی جنگ جاری رہی اور پانی میں شور و غل مچا رہا۔ آخر کار شیر ایک جھٹکے سے جھیل کے باہر کچھ فاصلے پر آن گرا۔ پانی کے جانور نے اسے باہر پٹخ دیا تھا، شیر کا بُرا حال تھا۔ اس کے نتھنوں سے خون بہہ رہا تھا، سارا جسم بھیگا ہوا تھا اور کپکپا رہا تھا۔ اس بے چارے کا یہ حال دیکھ کر مجھے بڑا ترس آیا، شیر زمین پر لیٹ گیا اور کافی دیر تک یوں ہی پڑا رہا پھر وہ اُٹھا اور سر جھٹکتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ آبی درندہ اب شاید زور آزمائی سے کافی تھک چکا تھا یا کوئی زخم کاری کھا چکا تھا اس لیے دوبارہ پانی سے نمودار نہ ہوا۔

میں نے سن رکھا تھا کہ شیر اگر کسی سے مار کھا جائے تو بدلہ ضرور لیتا ہے۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو شیر کو آزمانے کا اس سے بہتر موقع شاید پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔ چنانچہ میں نے اگلے روز بھی اسی جگہ قیام کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے دن جب آفتاب غروب ہونے لگا اور درختوں کے سائے لمبے ہو چلے تو میں غار میں آ بیٹھا اور بے چینی سے شیر کا انتظار کرنے لگا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، میری بے قراری اور جوش میں اضافہ ہوتا گیا جس طرف بھی ذرا آہٹ ہوتی میری منتظر نگاہیں ادھر اُٹھ جاتیں۔

آخر انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں اور شیر درختوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی اور خوشی کے مارے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اس شیر کو پہچان لیا تھا، یہ وہی شیر تھا جس پر کل ایک نا سمجھ جانور نے حملہ کر کے خواہ مخواہ

دشمنی مول لی تھی۔ آج شیر اپنی طاقت کو لوہا منوانے اور اس گستاخ آبی درندے کو سزا دینے کے لیے میدان میں اتر آیا تھا۔

اب شیر بالکل ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا اور بے حد جاہ و جلال سے چل رہا تھا۔ اس کے چہرے اور حرکات و سکنات سے محسوس ہوتا تھا جیسے انتقام کی آگ سے بھڑک رہا ہے۔ شیر خاموشی سے قدم اُٹھاتا ہوا جھیل کے کنارے پر پہنچ گیا۔ مگر آج پانی نہیں پیا بلکہ مستعدی سے جھیل کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں پانی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنا دائیاں پنجہ پانی میں ڈالتا اور پانی کھنگالتا، شاید اپنے مدمقابل کو حملے کی دعوت دے رہا تھا۔ شیر کو پنجہ پانی میں مارتے ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ پانی میں جنبش ہوئی اور آبی درندے نے سر باہر نکالا۔ اس نے سمجھا، شاید آج پھر کوئی شکار اس کا لقمہ بننے کو تیار کھڑا ہے لیکن وہ اس سے بے خبر تھا کہ آج اس کا سامنا شکار سے نہیں بلکہ موت سے ہوگا۔

آبی درندے نے سر پانی سے باہر نکالا ہی تھا کہ شیر کا طاقتور پنجہ اس کے سر سے ذرا پیچھے پڑا اور دوسرے ہی لمحے وہ جھیل کے باہر پڑا مرغ بسمل کی طرف تڑپ رہا تھا۔ شیر نے اسے کئی دفعہ فضا میں اُچھالا اور وہ ہر بار زور سے زمین سے ٹکرایا۔ یہاں تک کہ اس کی روح نے اس کے جسم سے رشتہ منقطع کر لیا۔ شیر انتقام لے چکا تھا۔ اس نے ایک زوردار دھاڑ سے نعرہ فتح بلند کیا اور ٹہلتا ہوا درختوں کے پیچھے روپوش ہو گیا۔

شیر نے جس آبی درندے کو ہلاک کیا، وہ کالے رنگ کے بھینس سے بھی کوئی پانچ چھ گنا بھاری جانور تھا۔ اس کی شکل و شباہت عجیب و غریب تھی۔ اسے دیکھ کر کسی بلا کا سا گمان ہوتا تھا۔

طاہر جاوید مغل کے قلم سے جہانی استاد
کی ہنگامہ خیز سرگزشت
پندرھواں حصہ شائع ہو گیا ہے
تاوان
قیمت فی حصہ 60/- روپے
مکمل ایک تا پندرہ حصے دستیاب ہیں

علیم الحق حقی کے شہرہ آفاق قلم سے
نئی سج دھج کے ساتھ دو بہترین کتابیں
شناخت
قیمت=/100 روپے
گمرونداں
قیمت=/100 روپے

محی الدین نواب کے قلم سے معاشرے
کے اردگرد گھومتی ہوئی کہانی
کچے رشتے
قیمت -/150 روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
Ph: 7247414

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

پہاڑوں کی گود میں

یہ سطریں جن بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان بیٹھ کر سپردِ قلم کر رہا ہوں، ان کا تعلق دنیا کے بلند ترین اور انتہائی دشوار گزار سلسلہ کوہستان سے ہے، ان عظیم پہاڑوں کی وادیوں میں بسنے والے سادہ لوگ بھی سخت جانی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ گو اب ان کی سخت کوشی و سخت جانی ہماری تہذیب، ڈستی جا رہی ہے اور ان کی ایمان داری اور خوش معاملگی کو ہم مہذب شہریوں کی بے ایمانی اور بد معاملگی کا گھن لگ گیا ہے۔

کچھ عرصہ پیشتر تک یہاں کے پہاڑوں میں مارخور، اڑیال اور اسی قبیل کے مختلف جانوروں کی خاصی بہتات تھی۔ چنانچہ شکار کا فن بھی خوب پروان چڑھا، مگر بے دردی سے جانور مارے جانے کی وجہ سے شکار پہلے عنقا ہوا، پھر اس پر پابندی لگی اور اس کے بعد قدرتی طور پر شکاری بھی ختم ہونا شروع ہو گئے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ گلگت کے علاقے میں ہر کس و ناکس کو جو بندوق پکڑ کر فائر کر سکتا ہو یا جسے محض شکار کا شوق ہو، شکاری کہلانے کا حق نہیں ہے، یہاں شکاری صرف وہ کہلا سکتے ہیں جو بہترین نشانہ باز ہونے کے علاوہ جسمانی اور دماغی صلاحیتوں، نیز سخت جانی میں لوگوں سے بہت ممتاز ہوں۔ اس بات کا انداز آپ یوں لگا سکتے ہیں کہ ہر گاؤں اور ہر قصبے میں ایسے خاصے لوگ ہوا کرتے تھے جن کے پاس اپنی بندوق ہوتی تھی اور جو وقتاً فوقتاً شکار کی مہموں پر جاتے رہتے تھے مگر اس کے باوجود بڑے بڑے قصبوں میں بھی مشکل سے واحد شکاری پایا جاتا تھا اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ میری معلومات کے مطابق ہنزہ و نگر کے علاقوں کے اکثر قصبوں میں ایک بھی شکاری نہیں۔ بے چارے شکاری جو شکار کا گوشت، کھال اور مشک نافہ وغیرہ فروخت کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے، شکار کی کم یابی شکار پر سرکاری پابندی کی وجہ سے بے کار ہو گئے اور وقت سے پہلے ہی بغیر کوئی جانشین تیار کیے اس دنیائے فانی سے یکے بعد دیگرے کسمپرسی کے عالم میں رخصت ہو گئے ہیں یا ہونے والے ہیں۔ واقف کار حضرات سے یہاں کے شکاریوں کی سخت جانی، سخت اعصابی اور مافوق الفطرت بہادری کے عجیب عجیب واقعات سننے میں آئے ہیں مگر اس مضمون میں ان واقعات پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے جس کے راوی کے کردار کی متعدد شریف اور قابلِ اعتبار حضرات نے تائید و تصدیق کر دی ہے۔ اتفاق سے اس کسوٹی سے گزرنے کے بعد زیادہ تر ایسے واقعات رہ گئے ہیں جن میں مرکزیت فن شکار سے زیادہ شکار کے دوران پیش آمدہ مافوق الفطرت باتوں کو حاصل ہے۔

ستمبر 66ء میں راقم الحروف کا تبادلہ مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے معدنی ترقیاتی منصوبہ برائے شمالی علاقہ جات کے سربراہ کی حیثیت سے گلگت ہو گیا۔ طے پایا کہ مجھے گلگت بذریعہ جیپ براستہ وادی کاغان پہنچنا چاہیے۔ دیگر ضروری سامان کے ساتھ ہم نے اپنی بندوق بھی ساتھ رکھ لی۔ بنیادی طور پر بندوق کو جانی حفاظت کے لیے رکھا گیا تھا مگر اس کو کیا کہیے کہ جب ہم لوگ وادی کاغان عبور کر کے وادی سندھ میں داخل ہوئے تو علاقہ چلاس میں شامت اعمال کے مارے دو عدد جنگلی کبوتر سڑک کے ساتھ پہاڑی ڈھلوان پر بیٹھے نظر آئے۔ شکار کو اتنا قریب دیکھ کر

رہا نہ گیا، فائر کیا تو دونوں غریب گر گئے۔ آگے چلے تو اتفاق سے مزید دو عدد کبوتروں کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ ہمارے اس شکار اور کبھی نہ خطا جانے والے نشانے نے جیپ ڈرائیور کو بڑا متاثر کیا۔

قصہ مختصر اپنے اس ڈرائیور کے طفیل ہم گلگت میں اور کم از کم اپنے عملے میں بڑے شکاری، مشہور ہو گئے۔ اس بات پر ہم بڑے شاداں تھے کہ بیٹھے بٹھائے صرف چار عدد کبوتر مار لینے پر بڑے شکاری کا خطاب مل گیا، مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ جلد ہی گلگت سے کوئی دس میل کے فاصلے پر وادی دینیور کے بالائی سرے۔ علاقہ جات پر ارضیاتی سروے کے لیے جانا پڑا۔ اس علاقے کی سطح سمندر سے تقریباً 9 ہزار فٹ بلند ہے۔

وہاں ایک ہفتے کا قیام تھا جس کے لیے ہم اپنے ساتھ تنبو بھی لے گئے تھے وہاں آمد کے دوسرے یا تیسرے روز بارت گاؤں کا ایک لڑکا ہمارے کیمپ میں آیا اور مجھ سے دریافت کرنے لگا کہ میں شکاری ہوں؟ میں لڑکے کے اس اچانک سوال پر پہلے کچھ بوکھلایا پھر قریب رکھی ہوئی بندوق پر ایک نظر ڈالی، اپنے دبلے پتلے اور غیر متناسب جسم پر نگاہ دوڑائی، لاغر، بازوں پر مچھلیاں محسوس کرنے کی ناکام کوشش کی، پھر چہرے پر رعب پیدا کرنے کی سعی کرتے ہوئے لڑکے کی طرف بے نیازی سے دیکھ کر اثبات میں گردن ہلا دی۔ یہ جواب پا کر غریب لڑکا بولا۔ ''ہمارے گاؤں میں بھی ایک شکاری ہے۔ میں اسے آپ کے آنے کی خبر دوں گا''۔ دوسرے دن ایک ادھیڑ عمر کا سادا سا عام قد و قامت کا مگر قدرے گٹھے ہوئے بدن والا شخص سامنے آیا۔ چہرے کی جھریاں اور کھڑے خدوخال ماضی کی سختیوں کی داستانیں کہہ رہے تھے۔ وہ بڑے مطمئن اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس علاقے میں مارخور خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور اگر شکار کا پروگرام بنایا جائے تو وہ ساتھ دینے اور رہبری کرنے کے لیے بلا معاوضہ تیار ہے۔ اس کے پاس اپنی بندوق اور کارتوس ہیں اور وہ ہم پر کسی بھی قسم کا بار ڈالنا نہیں چاہتا۔ خیر صاحب یہاں تک تو حالات امید افزا تھے مگر جب شکار کے پروگرام کی تفاصیل طے کی جانے لگیں تو اپنی سٹی گم ہو گئی۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ ہمارے کیمپ کی بلندی تقریباً 9 ہزار فٹ تھی اور جہاں ہمیں دوسرے دن علی الصبح چل کر تیسرے پہر تک پہنچنا تھا۔ وہ جگہ کیمپ سے تقریباً 4 ہزار فٹ اور برف کی دائمی لائن سے ذرا نیچے واقع تھی یعنی اس مقام کی سطح سمندر سے تقریباً 13 ہزار فٹ بلند تھی اور پہاڑ تقریباً عمودی تھا وہاں پہنچ کر رات کسی غار میں بسر کرنی تھی اور دوسرے دن علی الصبح وہاں مارخوروں کا شکار کھیلنا تھا چنانچہ شکاری صاحب کے سامنے اپنے شکاری پن کا بھرم رکھنے کو سرکاری کام کی زیادتی اور اس کی اہمیت کا بہانا بنایا اور اس کے ساتھ شکاری مہم پر جانے سے معذرت کی مگر اپنے ایک فیلڈ انٹلنٹ کو جو 65ء کی کشمیر کی جنگ میں بحیثیت کمانڈو تو شجاعت دے چکا تھا شکاری کے ساتھ دوسرے دن بندوق لے کر جانے کی اجازت دے دی دوسرے دن اس دور کنی شکاری پارٹی کو ہم نے بڑے شوق سے رخصت کیا تیسرے دن جب ہم کیمپ میں فیلڈ سے واپسی پر اور مارخور کا متوقع گوشت پکانے کی تیاریاں کر رہے تھے تو دن ڈھلے یہ منظر دیکھا کہ شکاری پارٹی اپنے کمبل اور بندوقیں اٹھائے گھسٹتی واپس آ رہی ہے آگے آگے شکاری تھا اور پیچھے ہمارا کمانڈو انٹلنٹ جس کا بہت برا حال تھا، وہ بمشکل پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ قریب آیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے برسوں کا بیمار اور قریب الموت ہو۔ راستے میں کہیں پیر پھسلنے سے ٹانگ پر چوٹ آئی تھی اور غریب لنگڑا ہو گیا تھا۔

معلوم ہوا کہ شکار نہیں ملا۔ متوقع مارخوروں کا غول تو دیکھا گیا اور وہ شکاریوں کی گھات کی جانب آ بھی رہا تھا مگر شومی قسمت سے یا تو اسے

شکاریوں کی موجودگی کا کسی آہٹ سے علم ہو گیا تھا یا پھر اس کا موڈ کسی اور تحریک سے بدل گیا اور وہ ہمارے شکاریوں کی رینج میں آنے سے پہلے ہی پلٹ گیا۔ اس واقعے سے یہ بات ہم پر بہت اچھی طرح واضح ہو گئی تھی کہ مارخوروں کا شکار بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور اس علاقے میں شکاری کا ٹائٹل کم از کم ہمارے لیے بڑا مہنگا اور جان لیوا ثابت ہو گا۔

اس کے بعد ہم نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے گلگت میں مارخوروں کے شوق میں آنے والی امریکن شکاریوں کی ایک جماعت کا حشر بھی دیکھا۔ یہ جماعت دو دن پیشتر بڑے طمطراق سے بے تحاشہ ساز و سامان خدام و حشم اور مقامی رہبروں کی خاصی بڑی نفری کے ساتھ روانہ ہوئی تھی اور بہت بری حالت میں راستوں کے کھڈوں میں گر پڑ کر واپس آئی لیکن یہ لوگ اپنے وطن خالی ہاتھ کیوں جاتے؟ ذلت سے بچنے کی تدبیر یہ کی گئی کہ بازار سے مارخور کا نیم حنوط شدہ سر خریدا اور نشانی کے طور پر ساتھ لے گئے، یہ بے چارے لاہور کے کسی کاروباری ادارے کے امریکی پرنسپلز تھے اور کوئی پیشہ ور یا ماہر شکاری نہ تھے۔ ان کے بازار سے مارخور کا سر خریدنے کی بات مجھے ایک امریکی یا کینڈین سیاح نے بتائی جو اسی زمانے میں گلگت آیا ہوا تھا۔

☆☆☆

غرض ان تمام مشاہدات سے میرے دل پر ان مقامی شکاریوں کی ہیبت بیٹھتی چلی گئی جو ان پہاڑوں پر مارخوروں کا نہ صرف شکار کرتے ہیں، بلکہ انہیں پیٹھ پر لاد کر نیچے بھی لاتے ہیں۔

دسمبر میں اپنے ڈارکوٹ کے ٹرپ کے دوران مجھے جناب حسین علی خاں مغپون کے در دولت پر ایک مہمان رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ اپنی جوانی کے زمانے میں راجہ صاحب بڑے اچھے شکاری رہے ہیں۔ ان کی صحت، وجاہت، بلند حوصلگی اور خوش مزاجی کا تذکرہ بعض غیر ملکی سیاحوں نے اپنی کتابوں، یادداشتوں اور خطوط وغیرہ میں بھی کیا ہے۔ اس وقت راجہ صاحب کی عمر ستر سال سے تجاوز کر گئی ہے اور دمے کی بیماری نے خاصا کمزور کر دیا ہے۔ راجہ صاحب بڑے صاف گو اور جرأت مند انسان ہیں۔ بے حد خوش مزاج اور حاضر جواب۔ اس زمانے میں راجہ صاحب بھی تشریف لائے ہوئے تھے (حاجی صاحب چند سال پیشتر انتقال کر گئے ہیں)۔ حاجی صاحب اس زمانے میں خاصے بوڑھے اور حد درجہ کمزور ہو چکے تھے۔ ایام جوانی میں زبردست شکاری رہے تھے اور شکار کا شوق جنون کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ ان کی شکاری زندگی میں بڑے عجیب و غریب واقعات سے پیش آئے تھے۔ ذیل میں ان سے براہ راست طور پر سنے ہوئے واقعات میں ایک واقعہ قلم بند کرتا ہوں ہاں یہ عرض کر دوں کہ ان سے یہ واقعہ سنانے کی درخواست میری طرف سے راجہ صاحب نے کی تھی اور حاجی صاحب کے کچھ سنانے سے پہلے راجہ صاحب اور دیگر مقامی شرکائے محفل نے بیک زباں کہا تھا..... حاجی صاحب کی پوری زندگی ہمارے سامنے ہے ان کا کردار ہمیشہ صاف اور بے داغ رہا ہے اور ہم سب ان کی باتوں کے سچ ہونے کا یقین رکھتے ہیں اور کسی قسم کا شبہ نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ اس نشست میں صرف حاجی صاحب کی آپ بیتی سنوانے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ ورنہ غیر مصدقہ شکاری واقعات تو مقامی لوگوں سے لاتعداد سنے جا سکتے ہیں۔

حاجی صاحب مرحوم کی شخصیت کے بارے میں میرا بھی یہی تاثر ہے کہ وہ پابند شرع سیدھے اور صاف گو انسان تھے ان کی باتوں میں جھوٹ یا بناوٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔

حاجی صاحب نے اپنا پہلا اور انوکھا واقعہ یوں شروع کیا۔ ایک مرتبہ میں اپنے ایک ملازم کے ساتھ مارخور کے شکار کی مہم پر روانہ ہوا۔ میرا یہ ملازم خود بھی بڑا ماہر شکاری، انتہائی نڈر اور سخت جان تھا۔ یہ بہار یا گرمیوں کا موسم تھا۔ شام کے وقت ہم نے مارخوروں کے ایک غول میں سے ایک وجیہہ مارخور شکار کیا۔ گولی میں نے چلائی مگر مارخور کو ذبح میرے شکاری ملازم نے کیا۔ شام کا وقت تھا اور ہم کافی تھک بھی گئے تھے۔ اس لیے طے پایا کہ شکار کردہ مارخور کو اسی طرح چھوڑ دیا جائے۔ دوسرے دن علی الصبح اُٹھ کر اسے بنایا جائے گا اور بعد ازاں واپس روانہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ مارخور کو اس قدرے مسطح جگہ پر لایا گیا جہاں کھلے آسمان کے نیچے رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا، کیونکہ اس جگہ کوئی مناسب غار وغیرہ نہ تھا، نیز باہر ہونے میں اس لیے بھی مضائقہ نہ تھا کہ موسم خوشگوار تھا۔ ہم نے مارخور کو ایک طرف ڈال دیا اور کچھ فاصلے پر ہم اپنے اپنے کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ موسم بالکل صاف اور خوشگوار تھا اور وہ قمری مہینے کی کوئی درمیانی رات تھی، ہم دونوں لیٹتے ہی سو گئے۔ رات کو کسی وقت، اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ چمکیلی چاندنی سے پورا علاقہ دن کی طرح روشن ہے۔ دور اور نزدیک کی ہر چیز بالکل صاف نظر آ رہی ہے اور عجب پُر کیف منظر ہے۔

اچانک بائیں جانب نظر اُٹھی جہاں مارخور پڑا ہوا تھا اور خوف کی ایک تیز لہر میرے بدن میں دوڑ گئی، سانس رُک گیا اور دل بیٹھتا ہوا محسوس ہونے لگا..... کیونکہ مارخور کی جگہ چمکتے ہوئے سفید کفن میں لپٹی ہوئی ایک انسانی لاش رکھی ہوئی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا اور کوئی انسان نظر نہ آتا تھا، معاً میرا خیال اپنے ملازم کی طرف گیا اور میں نے گردن گھما کر برابر لیٹے ہوئے ملازم کی طرف دیکھا تو دوسرے ہولناک منظر نے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے۔ ملازم کی کیفیت یہ تھی کہ چت پڑا تھا۔ گردن اور ٹھوڑی اوپر کو اُٹھی ہوئی تھی اور سر زمین پر ٹکا ہوا تھا، منہ بھیانک انداز میں کھلا ہوا تھا اور زبان باہر لٹک رہی تھی۔

دونوں آنکھیں حلقوں سے اُبل آئی تھیں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے کسی نے بڑی بے رحمی سے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر فوراً میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے اوسان بحال کیے، اپنا جسم، اپنا کمبل اور ساتھ رکھی ہوئی بندوق کو ٹٹولا اور محسوس ہوا کہ ہر چیز جوں کی توں ہے، اپنی جگہ ہے اور میں ان سب چیزوں کو واضح طور پر دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔

یکا یک پھر میں نے اپنی بائیں جانب نظر کی کہ شاید وہ انسانی لاش میرا وہم ہو مگر کفن میں لپٹی لاش بدستور وہیں پڑی تھی اور اس کی ہر تفصیل بالکل واضح تھی، تمام پتھر بھی بالکل ویسے ہی پڑے ہوئے تھے جیسے ہم نے سونے سے پہلے چھوڑے تھے اگر کوئی چیز نہیں تھی تو مارخور کی لاش میرے دل میں یکا یک پھر ملازم کا خیال آیا اور فوراً پلٹ کر ایک مرتبہ پھر داہنی طرف دیکھا تو وہ اسی حالت میں ساکن و جامد اور بے حس و حرکت پڑا تھا"۔

"جیسے جیسے مجھ پر یہ بات واضح ہوتی گئی کہ یہ سب حقیقت ہے، مجھ پر خوف غلبہ کرتا گیا اور میں نے اپنا منہ ایک دفعہ پھر کمبل میں چھپا لیا اور دہشت سے بے ہوش ہو گیا۔ بہر حال جب دوبارہ آنکھ کھلی اور میں نے ڈرتے ڈرتے کمبل سے منہ باہر نکالا تو معلوم ہوا کہ سورج نکلے خاصی دیر ہو چکی ہے اور موسم صاف ہونے کے باعث ہر طرف چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ ابھی میں ادھر ادھر دیکھنے اور صورتِ حال پر غور کرنے بھی نہ پایا تھا کہ میرے کانوں میں شکاری ملازم کی آواز آئی۔ وہ ہنستے ہوئے مجھ سے کہہ رہا تھا، صاحب آج تو آپ نے کمال ہی کر دیا، اتنی دیر سے سو کر اُٹھے ہیں۔ چلئے واپسی کی تیاری کرتے ہیں، میں نے مارخور کا تیا پانچا کر لیا ہے"۔

میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو اپنے ملازم کو نہ صرف زندہ سلامت پایا، بلکہ دیکھا کہ وہ نہایت اطمینان اور سکون سے بنے ہوئے مارخور کو پیٹھ پر لادے جانے والے بوجھ کی شکل میں ترتیب دے رہا تھا۔ میں اپنے ملازم کی گلا گھٹی ہوئی لاش دیکھ چکا تھا مگر اب وہاں اس جیسی کوئی چیز نہ تھی۔ سوائے لپیٹے ہوئے کمبل کے اب یہ سب میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا پھر دن کی روشنی و گرمی سے میرے اعصاب پوری طرح بیدار ہو گئے تھے اور ہمت عود کر آ گئی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً ساتھ رکھی ہوئی بندوق اُٹھائی اور زمین سے جست کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بندوق کی نالی ملازم کی طرف کر دی اور ڈپٹ کر کہا۔

''سچ سچ بتا تو کون ہے؟ ورنہ ابھی گولی مار دوں گا''۔

ملازم میری اس حرکت سے ہکا بکا رہ گیا اور تعجب سے کہنے لگا۔ ''آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا آپ مجھے بھی نہیں پہچانتے؟'' غرض کافی بحث و تکرار کے بعد بھی جب مجھے اس غریب اور سیدھے آدمی سے کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی تو زچ ہو کر میں نے اس سے کہا ''تو جو کچھ بھی ہے، میرے قریب بالکل نہ آئیو ورنہ میں تجھے گولی مار دوں گا''۔

قصہ مختصر، میں نے مارخور کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس میں سے جو کچھ نیچے لے جایا جانا تھا، وہ سب ملازم پر لدوایا اور اسے اپنے آگے آگے چلنے کا حکم دیا۔ اس کے پیچھے میں چلا اور بھری ہوئی بندوق کی نال تمام راستے ملازم کی طرف رکھی۔ ملازم بے حد پریشان تھا اور سخت متعجب کہ مجھے یکا یک یہ کیا ہو گیا ہے۔

اللہ اللہ کر کے ہم لوگ نیچے اپنے گاؤں پہنچے، میں نے ملازم کو اس کے گھر چھوڑا اور حکم دیا کہ وہ میرے پاس کسی صورت میں نہ آئے۔ ساتھ ہی یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ مارخور کا گوشت یا کھال کوئی چیز مجھے نہ بھجوائے۔ دراصل مجھے ملازم اور مارخور ہر دو کے اصلی، ہونے کا یقین ہی نہ تھا کہ خود اپنی آنکھوں سے رات کو کئی بار بصد ہوش و حواس ملازم کو مرا ہوا اور مارخور کو انسانی میت میں تبدیل شدہ دیکھ چکا تھا، لیکن آہستہ آہستہ مجھ پر اس کا اثر زائل ہونا شروع ہو گیا اور میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ ملازم کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے اور اصل معاملہ کچھ اور ہی ہو گا۔

اس واقعے کے تیسرے دن مجھے اطلاع ملی کہ ملازم اچانک بیمار پڑ گیا ہے اور اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ تقریباً تین دن سخت تکلیف اور اذیت میں رہنے کے بعد وہ غریب اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ میرے ذہن پر پھر اس واقعے کی تفصیل ابھر آئی اور میں نے غریب ملازم کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرنے سے بھی پرہیز کیا، تاہم میں اس امر پر حیران تھا کہ یہ قصہ کیا ہے، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ بہرحال کچھ عرصے تک تو مجھ پر اس واقعے کا اثر رہا اور میں کسی شکاری مہم پر نہ گیا۔ رفتہ رفتہ بات آئی گئی ہو گئی اور ایک مرتبہ پھر میں شکار کی مہموں پر جانے لگا، مگر اس کے بعد ایسا کوئی اور مافوق الفطرت واقعہ پیش نہ آیا۔

اسی محفل میں حاجی سلطان ولی صاحب نے اپنی شکاری زندگی کا ایک اور عجیب واقعہ سنایا۔ یہ واقعہ پہلے واقعے کی طرح پراسرار تو نہیں، مگر غیر معمولی ضرور ہے۔ ہوا یہ کہ حاجی صاحب ایک دن ایک بلند پہاڑ پر مارخور کے شکار کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ شام کا وقت ہو گیا تھا، اور جس مقام پر وہ لوگ تھے، وہ وادی سے کئی ہزار فٹ بلند تھا لیکن وہاں سے نیچے وادی اور اس کی گزرگاہیں صاف نظر آتی تھیں۔ اس موقعے پر ان کی شکاری

پارٹی کئی آدمیوں پر مشتمل تھی، یہ پارٹی وہاں رات بسر کرنے کا بندوبست کر رہی تھی کہ اچانک ساتھ کھڑی ہوئی چٹان سے انھیں انسانوں کے بات چیت کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگی۔ آوازیں ان کی جانی پہچانی تھیں، یعنی ان کے گاؤں کے لوگوں ہی کی تھیں جو آپس میں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ چٹان کے قریب تر جانے سے آوازیں زیادہ واضح ہوگئیں۔ مختلف آہٹوں سے یہ اندازہ با آسانی ہوتا تھا کہ بات چیت کرنے والے چل رہے ہیں۔ ساتھ ہی ایک گھنٹی کی سی آواز بھی انسانی آوازوں کے ساتھ سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز جانوروں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹی کی آواز سے مشابہ تھی۔ یہ لوگ سخت متعجب ہوئے، اسی حالت تحیر میں ناگاہ شکاری پارٹی کے ایک رکن کی نظریں نیچے وادی میں ایک راستے پر گڑ گئیں۔ وادی میں پیدل راستے پر دو آدمی ایک بار بردار گدھے کے ساتھ خراماں خراماں چلے جا رہے تھے، وہ اتنی دور تھے کہ ننگی آنکھ سے مشکل ہی سے نظر آ رہے تھے۔ دوربین لگا کر دیکھا گیا اور ان کی حرکات وسکنات سے اندازہ کیا گیا تو یہ عقدہ کھلا کہ وہ آوازیں انہیں لوگوں اور گدھے کے گلے سے بندھی ہوئی گھنٹی یا اس پر لدے ہوئے سامان کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہو رہی ہیں۔ کچھ دیر بعد جب شاید ان لوگوں نے کوئی موڑ کاٹا تو وہ آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ حاجی صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس مقام پر مجھے لے جائیں گے تاکہ اس خاص چٹان کی ماہیت وساخت پر مزید کام کیا جا سکے مگر افسوس کہ حالات نے مجھے اس کی اجازت نہ دی کہ فوراً بعد میرا گلگت سے مظفر آباد (آزاد کشمیر) تبادلہ ہوگیا۔

یہ آپ بیتی گلگت کے علاقے، استوار کے گاؤں ہرچو کے مشہور شکاری جناب حاجی محمد امیر صاحب کی ہے بدقسمتی سے یہ عظیم شکاری تقریباً 119 سال کی عمر میں اپریل 1976ء میں اپنے گاؤں ہرچو میں انتقال کر گئے۔ اس واقعے کے اصل راوی، ہنزہ یاقوت پراجیکٹ، کے ایک باریش، دین دار اور فرض شناس افسر جناب عبدالرحمٰن (نائب جیولوجسٹ) ہیں جو حاجی صاحب کے نواسے ہیں۔ عبدالرحمٰن صاحب نے یہ واقعہ اپنے نانا سے دوسرے عزیزوں کے ساتھ کئی مرتبہ سنا تھا؟ تاہم میری درخواست پر کچھ عرصہ پیشتر ایک مرتبہ پھر اپنے گاؤں جا کر اپنے والد اور دیگر بزرگوں سے اس واقعے کی مزید تفاصیل حاصل کیں اور ایک ایسا تحریری بیان تیار کر کے میرے حوالے کر دیا جس پر ان کے متعلقہ کافی بزرگ متفق تھے۔ عبدالرحمٰن صاحب اور بہت سے دیگر مقامی لوگوں کے مطابق، حاجی محمد امیر بڑے دین دار، راست گو، سادہ اور جفاکش انسان تھے۔ ایک سو انیس سال کی عمر میں بھی وہ چاق و چوبند تھے اور کسی طرح پچپن یا ساٹھ سال سے زیادہ دکھائی نہ دیتے تھے۔ حاجی صاحب وہ سب کام بنفس نفیس انجام دیتے جو گلگت کے پہاڑی گاؤں میں ایک عام آدمی کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حاجی صاحب نے اپنی زندگی میں تقریباً چار ہزار مارخور شکار کیے۔ گلگت کے بہت بڑے متعلقہ لوگوں کے قول کے مطابق وہ گلگت کے سب سے بڑے شکاری تھے۔

زیر بحث واقعہ تقریباً ستر (70) سال پہلے پیش آیا جبکہ ایک دن اپنے زمانہ جوانی میں حاجی صاحب مارخور کے شکار کی مہم پر ہرچو گاؤں کے نواحی پہاڑوں میں گئے ہوئے تھے۔ صبح سے تیسرے پہر تک انہیں کوئی شکار نظر نہ آیا، مگر شام کو جب یہ مارخوروں کی گزرگاہ پر بنائے ہوئے ایک شکاری مورچے میں گھات لگائے بیٹھے تھے، ایک بڑا اڑیال خراماں خراماں ٹہلتا ہوا اپنی جانب آتا نظر آیا، شاید نیچے چراگاہوں میں پیٹ بھر کر حسب معمول شب باشی کے لیے اپنے ٹھکانے کی جانب جا رہا تھا۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا، فوراً شست باندھی اور اڑیال کے کچھ اور نزدیک آ جانے پر فائر داغ دیا۔ گولی اڑیال کے پیٹ پر لگی اور پار نکل گئی۔ اس کے جسم سے خون بہنے لگا، مگر حالات کے برعکس وہ واپس مڑ کر بھاگنے کے بجائے شکاری کی طرف

دوڑنے لگا۔ حاجی صاحب اس کے اس رویے پر قدرے حیران تھے اور دوسرا فائر کرنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ وہ قریب آ کر اچانک مڑا اور پھر واپس بھاگنے لگا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے اپنی دوربین وغیرہ وہیں پھینکی اور خود رائفل لے کر اڑیال کے پیچھے دوڑنے لگے۔ کچھ فاصلے پر جا کر اور مناسب موقع پر انہوں نے دوسرا فائر کیا جو شکار کی اگلی ٹانگ پر لگا اور وہ لٹک گئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رُکا اور پھر دوڑنے لگا۔ اتفاق سے تیسری گولی اس کی اگلی دوسری ٹانگ پر لگی۔ اڑیال پھر چند لمحے کے لیے رُکا اور اس مرتبہ اس نے راستہ بدلا اور پہاڑ پر چڑھنے کے بجائے، نشیب کا رُخ کرنے کی بجائے، وہ ایک پہاڑی گاؤں دشکن کی جانب جا رہا تھا۔ یہ گاؤں، ہرچوگاؤں کے بالائی علاقے میں بجانب شمال مغرب میں واقع ہے۔ حاجی صاحب اڑیال کا پیچھا کرتے ہوئے دشکن گاؤں کے علاقے میں پہنچے تو وہاں کے چرواہے اپنے اپنے مویشی لے کر پہاڑوں سے اتر رہے تھے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ کسی نے حاجی صاحب یا ان کے اڑیال کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ گویا کوئی انہیں دیکھ ہی نہ رہا ہو، حتیٰ کہ اڑیال اور پھر خود وہ جب بھیڑ بکریوں کے ایک ریوڑ کے درمیان سے گزرے تب بھی کسی نے ان دونوں کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ بالآخر شکار اور شکاری دونوں گاؤں میں داخل ہو گئے۔ اچانک اڑیال نے پھر اپنا رُخ بدلا اور اب وہ گاؤں کے بڑے نالے کی جانب دوڑ رہا تھا۔

نالہ عبور کر کے جب وہ دوسری طرف چڑھ رہا تھا تو حاجی صاحب نے ایک اور فائر اس پر داغ دیا۔ گولی کھا کر غریب اڑیال واپس نالے میں گر گیا۔ حاجی صاحب بھی اسے ذبح کرنے کے لیے نالے میں کود پڑے، مگر جونہی اڑیال کے قریب پہنچے وہ یکایک اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور اگلی دونوں ٹانگوں سے بالکل انسانوں کے سے انداز میں ان کی کولی بھر لی۔ اڑیال کی ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ حاجی صاحب کی گردن کے اوپر تھی اور دوسری ان کی بغل میں، مگر اس سے بھی تعجب خیز بات یہ تھی کہ حاجی صاحب کو اپنی گرفت میں لے کر گرانے یا مارنے کی بجائے عجیب سی آواز نکالتا ہوا، اپنی زبان سے ان کا منہ چاٹنے لگا۔ پوری طاقت صرف کر کے حاجی صاحب نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کر لیا اور پھر اسے گرانے کے لیے گتھم گتھا ہو گئے۔ دیر تک دونوں میں زور آزمائی ہوتی رہی مگر کوئی فریق نیچے نہ گرا۔ یکایک حاجی صاحب نے موقع پا کر اپنا شکاری چھرا نکالا اور اڑیال کے سینے میں گھونپ کر پیٹ تک چیر دیا۔ اڑیال نڈھال ہو کر پانی میں گرا۔ حاجی صاحب نے اسے فوراً ذبح کر دیا اور اسے نالے سے باہر نکال کر ایک قدرے محفوظ جگہ پر لا ڈالا۔ اس وقت تو ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا، حاجی صاحب کا بھوک اور تھکن سے برا حال تھا اور شکار بنانے اور وہاں سے گھر لے جانے کی بالکل سکت نہ تھی۔ تھوڑی دیر وہ ستائے، پھر اُٹھ کر گاؤں کی طرف واپس ہوئے۔ گاؤں کے راستے اور اسی نالے پر حاجی صاحب کے گاؤں ہی کے ایک میراثی کی پن چکی (جندر) تھی جب وہ وہاں سے گزرنے لگے تو دیکھا پن چکی کی کوٹھری میں روشنی ہے اور کوئی اندر موجود ہے۔ قریب جا کر اندر جھانکا تو کیا دیکھتے ہیں کہ میراثی غلام علی کی بیوی اپنے چار سالہ بچے کے ساتھ بیٹھی ہے اور چولہے پر مکئی کی روٹیاں پکا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر انہیں اطمینان ہوا اور باہر ہی سے آواز لگائی۔

''بھئی میں انسان ہوں، کوئی جن یا بھوت نہیں۔ تم لوگ کیوں ڈر رہے ہو اور مجھے روٹی کیوں نہیں دیتے؟''۔

عورت اپنے بیٹے کو بمشکل گود میں لے کر اُٹھی اور مکئی کی ایک روٹی ان کی طرف بڑھا دی، مگر ایسا کرتے ہوئے وہ سخت خوف زدہ تھی اور اس کے جسم پر لرزہ طاری تھی۔ حاجی صاحب نے روٹی تھامی اور پھر ان کے خوف کی وجہ نہ سمجھتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل دیئے۔ عام حالات میں

وہ چکی میں بیٹھ کر ہی روٹی تناول کرتے، جب وہ اپنے گھر پہنچے تو کوئی بارہ کا عمل تھا۔ گھر پہنچتے ہی تمام روداد اپنے دادا صاحب کے گوش گزار کی جو خود بھی اپنے وقت کے مشہور شکاری تھے اور بڑے بہادر اور سخت اعصاب والے انسان تھے۔ ساری روداد سن کر انہوں نے فیصلہ صادر فرمایا کہ شکار کردہ اڑیال اسی وقت گھر لایا جائے گا اور ہم اس عجیب وغریب اڑیال کا گوشت کھا کر ہی آرام کریں گے۔ انہوں نے حاجی صاحب کے بڑے بھائی جناب بھائی محمد خان صاحب کو دو آدمیوں کے ساتھ فوراً جائے وقوعہ پر روانہ کیا اور ہدایت کی کہ اڑیال کو جلد از جلد اُٹھا کر لاؤ۔

یہ پارٹی بغیر کسی تاخیر کے رات ہی کو روانہ ہوئی اور شکار کیے ہوئے اڑیال کے ساتھ فجر کے وقت واپس گھر پہنچ گئی۔ مگر اس خبر کے ساتھ کہ متذکرہ پن چکی پر غریب میراثی کی بیوی اور اس کا چار سالہ لڑکا دونوں مردہ پائے گئے ہیں اور وہ بھی اسی طرح کہ مکی کی روٹی توے پر تھی اور بیٹا ماں کی گود سے چمٹا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ حاجی صاحب کی روٹی دینے کے فوراً بعد ہی ماں بیٹے کی روحیں قفس عنصری سے پرواز کر گئیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس واقعے کے دوسرے دن حاجی صاحب کے بڑے بھائی محمد خان اچانک کسی عجیب وغریب بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ ہر قسم کا علاج معالجہ کیا گیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر بیماری کا مہینہ مکمل ہونے سے پیشتر ہی راہی ملک عدم ہوئے، مگر خود حاجی صاحب کو کوئی گزند نہ پہنچی اور کچھ دن کے بعد جب اس عجیب وغریب واقعے کا اثر ان کے دماغ سے ذرا کم ہوا تو انہوں نے ایک بار پھر اپنے شکاری معمولات پورے زور شور سے شروع کر دیئے۔ حاجی صاحب اکثر اپنے پوتوں اور نواسوں کے اصرار پر یہ واقعہ پوری تفصیل سے سنایا کرتے تھے۔

اگلے واقعے کا تعلق جناب مظفر عالم صاحب سے ہے جو گلگت کی سابقہ ریاست نیپال کے راجہ صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان کا آبائی گاؤں سلبی ہے اور وہ آج کل بھی وہیں مقیم ہیں۔ مظفر عالم صاحب نے راقم الحروف کا رابطہ اس طرح پیدا کیا کہ اکتوبر 1976ء میں مجھے اپنے دفتر میں اطلاع ملی کہ دریائے گلگت کی ایک معاون وادی اور سابقہ ریاست اشکومن میں ایک صاحب کو یاقوت کے نمونے ملے ہیں۔ چونکہ ہنزہ کی یاقوت کی پٹی (RUBY BELT) کی ارضیاتی تفسیر یا پروجیکشن کے مطابق سابقہ اشکومن اور یاسین کی ریاستوں کے علاقوں میں یاقوت کے ذخائر پائے جانے کا قوی امکان تھا، اس لیے میں نے فوراً ہی جائے وقوعہ کے معائنے کا پروگرام بنایا اور پاکستان معدنی ترقیاتی کارپوریشن کے گلگت پروجیکٹ کے انچارج جناب علی بہادر صاحب کو بحیثیت معاون، کہ وہ اس علاقے سے ملحق سابقہ ریاست گپس کے رہنے والے ہیں، ہمراہ لے کر وادی اشکومن کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ صاحب جنہیں مبینہ طور پر یاقوت ملے تھے، نیپال اور اشکومت کی سرحد پر واقع سلبی گاؤں کے متذکرہ بالا مظفر عالم صاحب تھے، اپنے دولت خانے پر ایک پُرخلوص اور پُرتکلف چائے کی دعوت میں میرے استفسار پر مظفر صاحب نے اپنی شکاری زندگی کا جو عجیب واقعہ سنایا، وہ قارئین کرام کی نذر ہے۔

قیام پاکستان سے قبل مظفر صاحب گلگت کے پولیٹیکل ایجنٹ کے ایک انگریز دوست کو مارخور کا شکار کھلانے کی مہم پر اپنے کئی دیگر مقامی شکاریوں کے ساتھ اشکومن میں دریائے اشکومن کے ایک معاون پھکورہ نالے کی وادی میں گئے۔ ان کے مقامی ساتھیوں میں ان کے دوست علاقہ چٹورکھن کے محمد علی صاحب بھی تھے۔ اس شکاری پارٹی نے پہاڑ پر پہنچ کر ایک قدرے مسطح مقام پر اپنا ٹینٹ نصب کر دیا۔ انگریز مہمان دراصل خود شکار کرنے میں کم، مگر شکاری مہم کی تصویر کشی میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔

مظفر صاحب کا بیان ہے کہ ان کی پارٹی ابھی اپنے کیمپ سے شکار کی اصل مہم پر جانے کی تیاری کر رہی تھی اور کچھ لوگ ساتھ جانے والا سامان ٹھیک ٹھاک کر رہے تھے اور جو فارغ تھے، وہ ٹینٹ کے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ خود مظفر صاحب ٹینٹ سے کچھ فاصلے پر ایک اونچی جگہ کھڑے پہاڑ کا نظارہ کر رہے تھے۔ موسم خوشگوار اور ہوا نرم رو تھی۔ ان کے دیکھتے دیکھتے چوٹی سے برف کا ایک تودہ اپنی جگہ سے نیچے کھسکا اور برق رفتاری سے نیچے کی جانب پھسلنے لگا جیسے جیسے تودہ نیچے آ رہا تھا، ایک بڑے سفید بادل یا بگولے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ابھی یہ اس تماشے کو آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ انہیں پریشان کن احساس ہوا کہ تودہ جو چند ثانیوں میں برف کا ایک عظیم بگولہ بن گیا تھا، تیزی سے انہیں کی طرف آ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اس مصیبت سے آگاہ کرتے ہوئے آواز دی اور خود بھی پناہ لینے ٹینٹ کی طرف لپکے، مگر چند ہی قدم دوڑے ہوں گے کہ ہوا کے ایک زبردست جھکڑ نے انہیں تنکے کی طرح ایک طرف اُچھال دیا اور اس کے فوراً بعد انہوں نے اپنے آپ کو فضا میں ایک بے بس پتے کی طرح اُڑتے ہوئے پایا۔ اس کے بعد یکا یک جیسے انہیں کسی نے زمین پر زور سے پٹخ دیا اور وہ چوٹ سے بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا، تو دیکھا کہ اپنی اصل جگہ سے بہت دور اور اس علاقے کی سب سے خطرناک اور عمودی نالے کی کٹائی کے سرے پر نرم برف کے ایک بڑے تودے میں پھنسے پڑے ہیں۔ سر اور ہاتھ نسبتاً آزاد تھے مگر نچلا دھڑ اور ٹانگیں برف میں دھنسی ہوئی تھیں۔ بڑی جدوجہد کے بعد جسم اس برف سے آزاد ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ مادر زاد ننگے ہیں۔ جسم سے کوٹ جرسی، قمیض، شلوار، جوتے، حتیٰ کہ بنیان اور انڈرویر اور موزے بھی غائب ہیں۔ مظفر صاحب کے مطابق اس وقت تک وہ نیم بے ہوشی یا غنودگی کی کیفیت میں تھے، مگر ایک بات مستقل ان کے ذہن میں آتی تھی کہ اس وادی کی طرف نہ جانا کہ وہاں موت تیری منتظر ہے، مگر دوسرے ہی لمحے پھر کوئی نادیدہ طاقت انہیں اس ہولناک وادی کی طرف کھسکنے پر مجبور کر دیتی۔ نتیجتاً وہ آہستہ آہستہ موت کی اس وادی کی طرف کھسک رہے تھے اور قریب تھا کہ وہ اس میں گر جاتے کہ اسی اثنا میں ان کا دوست محمد علی دیگر ساتھیوں سمیت انہیں تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور لپک کر عین اس وقت انہیں تھام لیا جبکہ دوسرے لمحے وہ اس خطرناک وادی میں گرنے والے تھے۔ یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ وہ مادر زاد ننگے ہیں۔ لوگوں نے اپنے کپڑے اُتار کر انہیں قدرے ڈھانپا اور پھر تیز تیز کیمپ کی طرف لے چلے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے مظفر صاحب کے حواس ذرا بحال ہو گئے تھے۔ ٹینٹ میں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ ان کا انگریز مہمان ٹینٹ کے اندر بچھی ہوئی سفری میز کے نیچے گھسا اپنے کیمرے سے اس کارروائی کی تصاویر اتار رہا ہے۔ وہ نہیں بتا سکے کہ آیا وہ برفیلے جھکڑ سے خوف کھا کر میز کے نیچے گھس گیا تھا اور پھر حواس بحال ہونے پر خفت مٹانے کے لیے وہیں سے تصویر کشی شروع کر دی تھی یا پھر تصویر کشی کے لیے محفوظ مقام سمجھ کر دانستہ وہاں جا بیٹھا تھا۔ بہرحال مظفر صاحب کے لیے یہ بات تعجب خیز تھی کہ باقی کسی شخص پر اس برفیلے بگولے کا اتنا اثر نہ ہوا تھا۔ حتیٰ کہ شکاری پارٹی کی کوئی خاص چیز بھی ضائع نہ ہوئی تھی۔ کسی آدمی کا ہوا میں اُڑ کر ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچنا اور اس کے جسم سے تمام کپڑے غائب ہو جانا تو درکنار..... ہے کوئی جو اس واقعے کی عقلی توجیہ کرے؟

دست بدست

ہتھنی کا نام گومتی تھا۔ لوہے کی مضبوط زنجیر سے اس کا پچھلا پاؤں درخت کے تنے سے بندھا ہوا تھا۔ گومتی نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی اور بار بار اپنے کان پھڑ پھڑا رہی تھی اور سونڈ کو حرکت دے رہی تھی۔ کبھی اگلے پاؤں اُٹھا کر بلبلانا شروع کر دیتی۔ گومتی کا مہاوت علی بہادر جو بڑے سے درخت کی ایک موٹی سی ٹہنی پر بیٹھا چھوٹی کلہاڑی سے پتوں سے بھری نرم نرم شاخیں گومتی کے لیے کاٹ رہا تھا۔ ہتھنی کے بلبلانے کو غلط سمجھا۔ اس کا خیال تھا کہ گومتی بھوک سے بے تاب ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ درخت سے اُترا اور چند پتوں سے لدی ٹہنی گومتی کے آگے ڈال کر دوبارہ درخت پر چڑھ کر ٹہنیاں کاٹنے لگا۔ شیر دبے پاؤں پچھلی جھاڑیوں کی آڑ لے کر درخت کے قریب پہنچ چکا تھا اور اب دونوں اگلے پنجوں کو سمیٹے علی بہادر پر چھلانگ لگانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ یک بیک شیر نے جست لگائی اور علی بہادر سمیت درخت کے نیچے آن گرا۔ خوش قسمتی سے علی بہادر شیر کے اوپر گرا۔ اگر کہیں پانچ سو پونڈ وزنی شیر ایک سو تیس پونڈ کے علی بہادر پر گرتا تو اس کی ہڈی پسلی برابر ہو جاتی۔

بھارت کا ''کاربٹ نیشنل پارک'' جو مشہور زمانہ شیر کے شکاری جم کاربٹ کے نام پر معنون ہے۔ کم و بیش ایک لاکھ تیس ہزار ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس پارک کو قائم کرنے کا مقصد شیروں کی نسل کو فنا ہونے سے بچانا ہے۔

1973ء میں جب یہ پارک قائم کیا گیا جو ہمالیہ کے ترائی کے علاقے میں دہرہ دون سے لے کر بنگال کے دریائے برہم پترا تک پھیلا ہوا ہے۔ شیروں کی تعداد سینکڑوں سے گھٹ کر صرف چوالیس رہ گئی تھی۔ یہ تعداد اب پھر نوے سے اوپر پہنچ گئی، کیونکہ اس علاقے میں شیر کے شکار پر مکمل پابندی ہے۔ علی بہادر کو نیشنل پارک میں کام کرتے ہوئے دس برس ہو گئے تھے۔ 1974ء میں علی بہادر گھاس اور چارہ کاٹنے پر ملازم ہوا تھا۔

نیشنل پارک کا ہیڈ کوارٹر دھیکلہ کے قصبہ میں واقع ہے، جہاں کافی تعداد میں جیپ موٹر گاڑیوں کے علاوہ ہاتھی بھی پائے گئے ہیں، کیونکہ ترائی کے خطرناک جنگلوں میں سفر کرنے کے لیے ہاتھی ہی محفوظ خیال کیا جاتا ہے۔ شیروں کی تعداد گننے کے لیے گیم وارڈن ہاتھی پر بندھے ہودے میں بیٹھتے ہیں پھر بھی ان کے پاس بھری ہوئی دونالی بندوق یا کل دار رائفل ہوتی ہے۔ علی بہادر دو سال تک بطور چرکٹا ملازم رہا پھر جب ایک مہاوت کی موت پر آسامی خالی ہوئی تو یہ گومتی کا مہاوت بن گیا۔ اکثر چرکٹے مہاوت کے طور پر کام کرنا جانتے ہیں، کیونکہ ایک ہاتھی پر ایک مہاوت اور چرکٹا تعینات ہوتا ہے۔ پچھلے آٹھ برسوں میں علی بہادر سینکڑوں دفعہ گیم وارڈن اخبار نویسوں، فوٹو گرافروں اور باہر سے آنے والے جنگلی جانوروں کے دیکھنے کے شوقین یورپی اور امریکنوں کو گومتی پر بٹھا کر ترائی کے جنگلوں کی سیر کرا چکا تھا۔

☆☆☆

1982ء کے شروع میں ایک دل دوز واقعے سے علی بہادر اور اس کے تمام ساتھیوں پر اس تلخ حقیقت کا اظہار ہو گیا کہ جنگل میں تھوڑی

سی لاپرواہی موت سے دوچار کر دیتی ہے۔اس کا ایک ساتھی چرکٹا درگا پرشاد معمول کے مطابق گھاس کاٹنے گیا اور پھر واپس نہ آیا۔دوسرے دن جب اس کی ڈھونڈیا پڑی تو کچھ مہاوت و چرکٹے ایک گیم وارڈن کے ساتھ اس کی تلاش میں جنگل میں گئے اور ایک جھاڑی کے قریب اس کا نچا ہوا سر اور چند چچوڑی ہوئی ہڈیاں ملیں۔درگا پرشاد کسی بھوکے شیر کا شکار ہو گیا تھا۔ہڈیوں کے قریب نرم زمین پر شیر کے پاؤں کے نشان پائے گئے۔عموماً شیر آدمی پر حملہ نہیں کرتا بلکہ اس سے دور ہی رہتا ہے مگر ایک دفعہ شیر کے منہ کو آدمی کا خون لگ جائے تو پھر وہ آدم خور ہو جاتا ہے اور گھات لگا کر انسانوں کو شکار کرتا ہے۔عموماً عورتیں اور نوعمر لڑکے اس کا شکار ہوتے ہیں۔جب ہندوستان پر انگریز کی حکومت تھی تو شیر کا شکار صرف وائسرائے گورنر، کمشنر، فوجی افسر اور راجہ ہی کرتے تھے۔اس زمانے میں جہاں کہیں کسی شیر کے آدم خور ہونے کی اطلاع ملتی تو وہاں کا ڈپٹی کمشنر اس شیر کے مارنے پر انعام کا اعلان کر دیتا اور کوئی انگریز فوجی افسر کسی منجھے ہوئے ہندوستانی شکاری کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا۔مچان باندھا جاتا، بھینس کا کٹا یا بڑا بکرا مچان کے ساتھ باندھ دیا جاتا اور کوئی جی دار گاؤں والا ''گاوا'' کے ساتھ شام کو بیٹھا رہتا تا کہ شیر اس کی آواز اور بو پر جلد آئے۔شکاری مچان پر چڑھ بیٹھتے اور گاؤں کا آدمی بھی ان کے ساتھ شروع رات ہی میں درخت پر چڑھ جاتا جو بھی شیر ''گاوا'' پر آتا، شکاری بندوقوں اور رائفل کی گولیوں سے اسے مار گراتے لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ آدم خور کی بجائے وہ کسی دوسرے شیر کو مار ڈالتے اور دو چار دن بعد جب آدم خور دس پندرہ میل دور کسی دوسرے انسان کو ہلاک کرتا تو پھر ہاہا کار مچ جاتی اور شکاری دوبارہ شیر کا تعاقب کرنے میں لگ جاتے لیکن اب چونکہ شیروں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے، اس لیے جنگلی جانوروں کے تحفظ کا محکمہ پہلے اچھی طرح چھان بین کرتا ہے اور شیر کو زندہ پکڑنے کی کوشش کی جاتی ہے تا کہ اسے کسی چڑیا گھر والوں کو دے دیا جائے۔اور صرف اس صورت کے ناکام ہونے پر ہی شیر کو ہلاک کیا جاتا ہے۔

نیشنل پارک کے ڈائریکٹر چندر بھان نے درگا پرشاد کی موت کے بعد یہ حکم جاری کیا کہ آئندہ جنگل میں گھاس کاٹنے، پتے توڑنے یا اور کسی کام کے لیے کوئی آدمی اکیلا نہیں جائے گا بلکہ دو تین یا چار کی ٹولیوں میں لوگ جائیں گے۔اس حکم پر سختی کے ساتھ عمل درآمد بھی شروع ہو گیا۔

15 فروری 1984ء کی ایک چمکیلی دوپہر کو علی بہادر اور چرکٹا قطب گومتی اور ایک دوسرے ہاتھی کو لے کر جنگل میں پتے توڑنے کے لیے نکلے تو وہاں ایک چھوٹی سی ندی کے قریب درختوں کا ایک جھنڈ تھا جہاں قطب نے اپنے ہاتھی کے پچھلے پیر میں لوہے کی زنجیر ڈال کر اسے ایک مضبوط درخت کے تنے سے باندھ دیا اور خود قریب کے دوسرے درخت پر چڑھ کر پتوں والی نرم ٹہنیاں کاٹنے لگا۔علی بہادر جو ابھی تک گومتی کی گردن پر بیٹھا تھا، نظر اُٹھا کر اپنے لیے بھی کوئی درخت تلاش کرنے لگا مگر باقی درخت یا تو چھوٹے تھے اور یا چھدرے۔اس نے ندی کے پار ایک اور درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا جو بمشکل دو سو گز دور ہوں گے اور پھر قطب سے کہا کہ وہ پار کے جھنڈ سے پتے کاٹے گا، قطب اس کی واپسی کا انتظار کرے تا کہ دونوں ساتھ ساتھ واپس دھکیلہ جائیں۔گومتی کو ندی کے پار ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا اور خود بڑے سے درخت پر چڑھ کر پتوں والی ٹہنیاں کاٹنی شروع کر دیں۔

جب علی بہادر شیر کے اوپر گرا تو چند لمحوں کے لیے تو اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔شیر نے غصے سے غرا کر ایک جھٹکے سے 130 پونڈ کے علی بہادر کو پانچ فٹ دور پھینکا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔علی بہادر زمین پر گرتے ہی اُٹھ کر بھاگ پڑا، مگر شیر نے ایک جست میں اسے گدی سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا

اور ایک قریبی جھاڑی پر اُچھال دیا۔ باوجود اس کے کہ جھاڑی کانٹے والی تھی۔ علی بہادر نے اس کی ایک مضبوط شاخ پکڑ لی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب شیر اسے منہ میں دبا کر اپنی کچھار میں لے جائے گا، مگر شیر نے ایک ہی جست میں اسے پکڑ لیا اور جھاڑی سے الگ کر دیا۔ اب شیر کا منہ علی بہادر کے جبڑے سے صرف ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ بدبو کا ایک زوردار بھبکا، اس کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ علی بہادر نے گھبرا کر پھر دوڑ لگا دی حالانکہ اس کی گردن سے خون بہہ رہا تھا۔ اس وقت سارے جنگل پر موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا اور علی بہادر کے ننگے پیروں کی دھمک دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے تو شیر حیرت زدہ رہ گیا تھا کیونکہ عجیب شکار تھا جو بار بار اس کی گرفت سے نکل جاتا تھا۔ شیر نے پھر جست لگائی اور علی بہادر کو ٹانگوں سے پکڑ لیا اور علی بہادر پھر زمین بوس ہو گیا۔ اب صورتِ حال یوں تھی کہ علی بہادر کی دونوں ٹانگیں شیر کے اگلے پنجوں نے قابو کی ہوئی تھیں اور علی بہادر کولہوں کے بل زمین پر بیٹھا تھا۔ شیر کا منہ علی بہادر کے بہت قریب تھا اور اس کی سرخ انگاروں جیسی آنکھیں علی بہادر پر مرکوز تھیں۔

زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور چاروں نوکیلے دانت صاف دکھائی دے رہے تھے۔ موت کو اتنے قریب دیکھ کر زندہ رہنے کی آرزو علی بہادر کے دل میں پیدا ہوئی اور اس نے ہمت کر کے شیر کی زبان پکڑ لی۔ چند لمحوں کے لیے تو شیر سکتہ میں آ گیا مگر دوسرے لمحے شیر کے نوکیلے دانت علی بہادر کی ہتھیلی کے آر پار ہو گئے۔ علی بہادر نے اپنا دایاں ہاتھ جواب بے کار ہو چکا تھا، فوراً کھینچ لیا اور بائیں ہاتھ سے شیر کے منہ پر مکوں کی بارش برسا دی۔ شیر نے غصے اور گھبراہٹ سے اپنا داہنا پنجہ علی بہادر کے منہ پر مارا جس سے داہنی آنکھ اور داہنا گال نچلے ہونٹ تک ادھڑ گیا اور خون علی بہادر کی ٹھوڑی سے بہنے لگا۔ علی بہادر نے تکلیف سے ایک زوردار چیخ مار کر اپنا سر نیچا کر لیا اور شیر نے اس کی گدی کو پھر اپنے جبڑوں میں دبا کر اسے زمین پر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ اب علی بہادر کو یقین ہو گیا کہ شیر اسے کسی سایہ دار جگہ لے جا کر چیر پھاڑ ڈالے گا۔ اس نے اپنے گلے کی پوری قوت سے چیخنا شروع کر دیا ''بچاؤ بچاؤ، شیر نے پکڑ لیا''۔

شیر علی بہادر کو گھسیٹتا ہوا ندی کی طرف لیے جا رہا تھا اور علی بہادر کی چیخوں نے خاموش فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

ادھر قطب اپنے ہاتھی پر پتوں والی ٹہنیاں لاد کر علی بہادر کے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا، جب علی بہادر کی چیخیں اس تک پہنچیں تو قطب نے اپنا ہاتھی چیخوں کی طرف دوڑا دیا۔ چند ہی منٹوں میں وہ شیر کے سر پر جا پہنچا۔ شیر نے گھبرا کر علی بہادر کو چھوڑ دیا۔ قطب نے ہانک لگائی۔ ''علی ہاتھی کے سامنے آ جا''۔ علی بہادر کی داہنی آنکھ بے کار ہو چکی تھی، داہنا ہاتھ کام نہیں کر رہا تھا مگر جان اتنی عزیز ہوتی ہے کہ وہ آواز پر دوڑ کے ہاتھی کے قریب آ گیا اور قطب کی آواز پر ہاتھی نے اسے سونڈ میں لپیٹ کر اوپر قطب کی طرف دوڑا دیا جہاں قطب نے اسے تھام لیا پھر قطب نے ہاتھی کو دھکیلہ کی طرف دوڑا دیا۔ کچھ دور تو شیر ہاتھی کے ساتھ ساتھ دوڑا مگر ندی پار کرنے کے بعد شیر رُک گیا اور قطب زخمی علی بہادر کو جو اب بے ہوش ہو گیا تھا، لے کر قصبے کی سرکاری ڈسپنسری میں پہنچ گیا۔

خوش قسمتی سے ڈاکٹر نے ابھی ابھی شام کے وقت آنے والے مریضوں کو دیکھنا ہی شروع کیا تھا۔ فوراً ہی علی بہادر کی مرہم پٹی کی گئی۔ اس کی گردن اور منہ پر 32 ٹانکے لگے۔ ڈاکٹر نے بذریعہ جیپ بے ہوش علی بہادر کو قریب کے شہر کے ہسپتال میں بھجوا دیا تھا جہاں اس کو تین بوتل خون چڑھایا گیا۔ گیم وارڈن دو مہاوتوں کو لے کر دوسری جیپ پر واپس جنگل گیا جہاں اس نے علی بہادر اور شیر کی کشمکش کی جگہ کا جائزہ لیا۔ شیر کے پنجوں

کے نشانوں سے واضح ہو گیا تھا کہ یہ وہی شیر تھا جو درگا پرشاد کو ہڑپ کر چکا تھا۔ گومتی کے پیر کی زنجیر کھول کر دونوں مہاوت اور گیم وارڈن واپس ہیڈ کوارٹر پہنچے تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔

علی بہادر تین ماہ تک ہسپتال میں رہنے کے بعد واپس اپنی نوکری پر نیشنل پارک چلا آیا۔ اب وہ پہلے جیسا بے فکرا اور یار باش علی بہادر نہیں رہا تھا۔ موت کو اتنا قریب دیکھ کر اسے مذہب سے زیادہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ اب بجائے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے کے، وہ زیادہ وقت مسجد میں گزارتا۔ اس نے داڑھی بھی رکھ لی اور پنج وقت کا نمازی بن گیا۔ شیر کو قطب نے خوب اچھی طرح دیکھا تھا، اس لیے نیشنل پارک کے ڈائریکٹر چندر بھان کے حکم پر ایک پارٹی ترتیب دی گئی جس نے ایک بکرے کو شیر کی کچھار کے قریب ایک درخت کے نیچے باندھ دیا۔ اسی درخت کی اونچی شاخوں پر ایک مچان بنایا گیا جس پر ایک گیم وارڈن اور دو مضبوط جسم والے چرکٹے ایک بڑا جال اور بھری بندوق لے کر بیٹھ گئے۔ شام کے قریب شیر بکرے کی آواز پر وہاں پہنچ گیا اور جونہی وہ بکرے پر جھپٹا جال والوں نے جال پھینک کر اسے قابو کر لیا اور لکڑی کے ایک بکس نما بڑے پنجرے میں بند کر دیا۔ آج کل یہ شیر کانپور کے چڑیا گھر میں ہے اور لوگ دور دور سے اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

.....❁.....

جنگل کا قانون

ریل سے اتر کر شاہ گڑھ اسٹیشن سے ٹھیک شمال کی طرف روانہ ہوں تو پانچ گاؤں چھوڑ کر آخری گاؤں سکھ داس پور آتا ہے۔ اس کے بعد دو میل سے بھی زیادہ چوڑا میدان پار کر کے نگاہیں ایک سبزی مائل سیاہ دیوار پر رُکتی ہیں جو دائیں ہاتھ پر شاردا نہر کی اونچی پٹڑی سے شروع ہو کر دائیں طرف دھندلی پڑتے پڑتے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ دیوار نہیں ہے بلکہ ترائی کے جنگل کا وہ حصہ ہے جسے مصطفےٰ آباد رینج کہتے ہیں چونکہ اس جنگل میں چوپایوں کی کثرت ہے۔ اس لیے اس میدان میں گیہوں کی فصل کے سوا اور کوئی کاشت نہیں ہوتی۔ وہ بھی اس طرح کہ کنارے کے تمام گاؤں کے لوگ متفق ہو کر جنگل کے کنارے کنارے میلوں تک کانٹے دار درختوں کی شاخوں سے ایک باڑ کھڑی کر دیتے ہیں جس سے کچھ بچاؤ ہو جاتا ہے، ورنہ دراصل یہ دس بارہ میل کا لمبا اور ڈھائی میل کا چوڑا گیہوں کا ایک تختہ خود بچاؤ ہے۔ اتنی بڑی کھیتی میں نقصان ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ رات کے آٹھ بجتے ہیں، جگہ جگہ سانبھر اور چیتل منہ اونچا کر کے پھیلے ہوئے شاخ دار سینگ پیٹ پر ملا کر تھوتنے بھر راستہ ڈھونڈ لینے کے بعد بے تکلف اندر آ جاتے ہیں۔ ان کے پھیلے ہوئے سینگ کانٹے دار لکڑیوں کی دیوار چیر کر ان کے جسم سے زیادہ چوڑا راستہ بنا دیتے ہیں۔ رات بھر چرنے کے بعد دن پھوٹنے کی ہلکی روشنی پر یہ جانور پھر اسی طرح واپس نکل کر جنگل میں گھس جاتے ہیں۔

ہولی جلے پانچ دن ہو چکے ہیں۔ رات کے دو بجے ہیں، چاندنی چٹکی ہوئی ہے، کانٹوں کی باڑھ سے کچھ دو گھنٹوں تک اونچے کھیت میں چھ چیتلیں کھڑی ہوئی اطمینان سے آدھے سوکھے گیہوں کے پتے ایک ایک کر کے بین رہی ہیں۔ کھیت کے کنارے ایک جگہ گیہوں کا دو فٹ کا پگھا اب بھی سبز ہے جیسے کہ اکثر رہ جاتے ہیں۔ اس میں تین اور چیتلیں چمٹی ہوئیں ہیں۔ ان کے برابر ہی کھیت سے باہر شاندار جھانک موٹی گردن اینٹھائے پھیلے ہوئے بارہ سینگ تاج کی طرح لگائے خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا ہے، ہاتھ، پیر، سر یا آنکھیں کسی کو بھی جنبش نہیں ہے۔ صرف کان وقتاً فوقتاً اِدھر اُدھر سے ادھر پھر جاتے ہیں۔ آنکھیں اس قدر تیز نہیں ہیں کہ برابر گھنے جنگل کی تاریکیوں میں پتہ چلا سکیں۔ ہوا بھی مخالف ہے، کھیت سے جنگل کی طرف چل رہی ہے، اس لیے بو بھی نہیں لے سکتا۔ کانوں ہی سے کام لے رہا ہے۔ دور گھنے جنگل میں تھوڑی دیر بعد ہلکی گھس گھس ہوتی ہے، دائیں ہاتھ پر کسی جگہ سے بہت خفیف کھٹ کھٹانے کی آواز آ رہی ہے۔ ان دونوں آوازوں کی اسے مطلق پروا نہیں ہے۔ یہ صاف پہچان گیا ہے کہ یہ آواز نیولی کے بچوں کے کھیلنے کی ہے اور دوسری جنگل کی نیلی کھٹ بڑھئی کے درخت کی چھال سے کیڑے چننے کی ہے۔ جھانک اس فکر میں ہے کہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی، سال کے درختوں میں زمین سے ملی لمبی سی چیز ہلنے کا جو شبہ سا ہوا تھا، وہ دراصل شیر ہی تھا یا کچھ اور سوکھے پتے کی پیر کے نیچے چر چرانے کی ایک خفیف سی آواز اسے سارا ماجرہ بتا دینے کے لیے کافی ہے۔

لیکن کیا مجال کہ شیر یا شیرنی کا پیر بے جا پڑ جائے۔ حالانکہ سال نبی کی تمام زمین پت جھڑ کے پتوں سے بچھی پڑی ہے لیکن یہ دونوں ایک

بھی پتا چڑ چڑائے یا کھس کھسائے بغیر یہاں آ کر دیمک کی بنائی ہوئی چھوٹی سی دیوار کی آڑ میں اسی گلے کی واپسی کے انتظار میں بیٹھ گئے ہیں۔ ان کے اور چیتلوں کے درمیان بھٹ کے چوڑے پتوں اور مروڑ پھلی کی لمبی شاخوں سے اس قدر آڑ ہو گئی کہ نظر ان دونوں کو بھی کچھ نہیں آ رہا ہے پھر بھی دونوں اطمینان سے دبکے بیٹھے ہیں۔ تیز ہوا میں جو کھیت سے جنگل کی طرف چل رہی ہے۔ چیتلوں کی بو اور ان کے ہلنے جلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔

دفعتہً شیرنی کو ہوا میں ایک نئی بو معلوم ہوتی ہے، وہ گھبرا کر شیر کی طرف سر گھماتی ہے۔ شیر نے کوئی بو محسوس نہیں کی۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہتا ہے۔ اتنے میں پھر تیز ہوا کا جھونکا آتا ہے، اب شیر کو بھی یہ نئی بو معلوم ہو جاتی ہے۔ شیر جھنجھلا کر دونوں کان آگے جھکاتا ہے لیکن شیرنی پریشان ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا پھر آتا ہے، اب شبہے کی گنجائش نہیں رہتی۔ دونوں اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر آہستہ سے گھوم کر شمال سے مشرق کی طرف چل دیتے ہیں۔

باہر کھیت میں جھانک اب بھی اسی طرح کھڑا ہے، سبز گچھے پر اب تین کے بجائے پانچ چتیلیں پھدک رہی ہیں، باقی چار انہیں سوکھے گیہوں میں سے پتے کھا رہی ہیں۔ چرتے چرتے ان چاروں کو بھی بو معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایک کر کے چاروں سر اونچا کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک جھانک کی طرف دیکھتی ہے۔ جھانک جنگل کی طرف کان لگائے، اسی طرح بے خبر کھڑا تھا۔ ایک چتیل کو دور سکھ داس پور کی سمت دھندلی سی ہلتی ہوئی کوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔

چیتل فوراً کوکی لمبی آواز لگاتی ہے۔ سنسان رات میں جنگل کے کنارے سے آواز گونجتی ہے۔ باقی تمام چیتلیں چونک کر سر اونچے کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ جھانک بھی گھوم پڑتا ہے۔ یہ تمام جانور پانچ منٹ تک پتھر کی مورتیوں کی طرح بے حس کھڑے رہتے ہیں، بو برابر آ رہی ہے لیکن دور ہلنے والی چیز رُک گئی ہے۔ پانچ منٹ بعد وہ چیز پھر ہلتی ہے، سب چیتل ایک ساتھ جنگل کی طرف جھپٹتے ہیں۔ کانٹوں کی باڑھ جا بجا ٹوٹی ہوئی ہے۔ چیتل انہیں میں سے ایک راستے سے ایک کے بعد ایک قلانچیں بھرتے نکلتے ہیں۔

سب سے آخر میں جھانک بھی اس قطار میں شامل ہو جاتا ہے جو چیتلوں نے بنالی ہے۔ جنگل میں گھستے گھستے وہی چیتل پھر دو دفعہ کوکی آواز لگاتی ہے اور سب چیتل جنگل میں غائب ہو جاتے ہیں۔ سامنے کچھ دور سوکھے گیہوں میں ایک پریشان انسان کھڑا ہے۔

☆☆☆

پھانسی کے تختے پر بے کسی اور بے بسی کی موت سے بچنے کے لیے بہاری گاؤں سے بچتا ہوا شاہ گڑھ اسٹیشن سے دیوانہ وار اس جنگل کی طرف آیا تھا۔ اس کے خیال میں گھنے سرسبز جنگل، پھولوں پھلوں سے لدے، چھوٹے چھوٹے چشموں سے آراستہ دامن پھیلائے، اسے اپنی گہرائیوں میں چھپانے کے لیے تیار کھڑے تھے، لیکن جنگل کے کنارے آتے ہی اس پر اس سمت سے بھی خوف طاری ہو گیا۔ اس کی پشت پر گاؤں کی اکا دکا ٹمٹماتی روشنیاں ملک الموت کی آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے سامنے وہ جنگل قبر کی طرح تاریک اور بھیانک معلوم ہو رہا تھا جسے زندگی کا گہوارہ سمجھ کر وہ اس کا جویا ہوا تھا۔ آنکھوں سے اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ نہ ناک سے کوئی بو محسوس کی تھی، صرف چیتل کی کوکیں سنی تھیں اور انہیں تین آوازوں نے اس کی خیالی جنت ایک ہیبت ناک گھنا بن بنا دی تھی۔

بہاری دیہات کا رہنے والا ضرور تھا، بھوت پریت سے ڈرنا جانتا ہی نہیں تھا لیکن جنگل سے ناواقف تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا، وہ سر پکڑ کر وہیں کھیت میں بیٹھ گیا۔ اپنی بے کسی پر اس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو بہنے لگے۔ اس کے دماغ میں خیالات کا ایک ایسا ہیجان تھا کہ وہ کوئی ایک بات لگاتار سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ کبھی وہ اپنی بدقسمتی کا خیال کرتا تھا، کبھی بے بس بوڑھے باپ اور ماں کی حالت سوچتا تھا، کبھی اپنی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا تھا اور کبھی آئندہ زندگی بسر کرنے کا نقشہ کھینچنا چاہتا تھا لیکن ہر پھر کے ہر خیال میں کسی نہ کسی طرح ایک تصویر آ جاتی تھی۔

چاندنی رات میں ایک کھیت کی مینڈھ ہے، اس پر ایک آدمی خون میں نہایا، اوندھا پڑا ہے۔ اس کے پیروں کی طرف وہ خود گنڈاسا لیے کھڑا ہے۔ اس تصویر سے بہاری لرز جاتا ہے، کانپ اُٹھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے متعلق نہ سوچے مگر بار بار اسے یہی خیال آ جاتا تھا۔ وہ بار بار کہتا تھا، میں بلدیو سنگھ کا قاتل ہوں تو سہی لیکن ہے رام یہ کیسے ہوا؟ کیسے ہوا؟ ہاں میں نے مارا۔ دو گنڈاسے سر پر ہلکے سے مارے تھے اور تیسرا ہی زور سے مارا جو پیٹھ میں گھس گیا، اسی سے تو گر پڑا۔ پیٹھ کا زخم؟ نہیں پیٹھ والے سے کیا ہوا؟ وہ تو پہلا ہی گنڈاسا سر میں گھس گیا، میں نے مارا؟ یہ کیا ہو گیا تھا؟ رام یہ کیا ہو گیا؟۔ ہے بھگوان! اب وہ زندہ ہو سکتا ہے؟ ناہیں ناہیں! ہے بھگوان؟ معافی مل سکتی ہے؟ ناہیں! ناہیں!۔

اسی طرح سوچتے سوچتے ٹھنڈی ہوا نے تھکے ہوئے دماغ میں نیند کے ہلکے ہلکے پردوں میں ملا کر ایک عجیب تصویر پیش کر دی۔ کیا دیکھتا ہے کہ بلدیو سنگھ کا باپ اس کے سامنے لڑکے کو لئے کھڑا ہے اور اس سے کہہ رہا ہے۔ کنور بھیا یو ہے بہاری تمرے سامنے! اب ماپھ کر دیو اچھے ہوئی جائی ہو بلدیو سنگھ کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے سامنے کھڑا ہے اور برابر کہہ رہا ہے "بس کنور اب جان دیو، ماپھ کریو۔ اچھے ہوئی جاؤ پھر بڈھا اس کی طرف غصے سے دیکھ کر کہتا ہے۔ "بہاری! تم بھی ماپھی مانگ لیو بیٹھے کا دیکھ رہے ہو، مانگو ماپھی"۔ بہاری! ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہے۔ بلدیو سنگھ سر ہلا کر باپ سے کہتا ہے، معاف نہیں کروں گا"!۔ اب بہاری اس کے پیروں پر گر پڑتا ہے۔ اس پر وہ کہتا ہے، میں نا معاف کروں گا، بلاؤ سپاہیوں کو۔ "پکڑو پکڑو دوڑو دوڑو اسے پکڑو"۔ بہاری کی آنکھ کھل جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں آدمی دوڑے چلے آ رہے ہیں، وہ چونک کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

صبح کی سہانی روشنی اسے بھیانک معلوم ہوئی، سنہرا زرد گیہوں کا کھیت موت کے ہاتھ سے مٹایا ہوا نظارہ معلوم ہوا۔ کالا جنگل کا کنارہ ایک قلعہ معلوم ہوا جس میں اسے موت سے پناہ مل سکتی تھی۔ وہ فوراً اس کی طرف لپکا، لیکن چار قدم چلنے کے بعد اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا کہ کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے؟ درختوں سے جھانکتے ہوئے سکھ داس پور کے مکانوں پر اس کی نگاہ پڑی، ہر مکان اسے مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ بہاری جنگل کی طرف بھاگا اور کانٹوں دار باڑھ پھاندتا ہوا، جنگل میں غائب گیا۔

☆☆☆

جس وقت دوبارہ مرغے نے اذان دی تو بہاری نے آنکھیں کھول دیں۔ صبح کا ہلکا سا نور پھیل رہا تھا۔ قریب ہی کسی درخت پر کوئی مور رات بھر کے سمٹے ہوئے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس کے سر کی طرف اوپر کی کسی ڈالی پر ایک چھوٹی سی چڑیا چیں چوں چیں چوں چہک رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ روشنی کے ساتھ چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں بڑھ رہی تھیں۔ بہاری نے دن بھر کے سکڑے ہوئے ہاتھ پیروں کو جنبش دی اور محسوس کیا کہ جوڑ جوڑ

میں درد ہو رہا ہے۔ وہ ''اے بھگوان کرپا کر بھگوان'' کہہ کر بیٹھ گیا اور اطمینان سے وہ رسی کھولی جس سے اس نے اپنا سینہ اور کمر برگد کے دو شاخے سے باندھ رکھی تھی تا کہ وہ سوتے میں درخت سے نہ گر پڑے۔ بہاری کو آج جنگل میں آئے آٹھ دن ہو چکے ہیں۔ یہیں اس نے مروڑ پھلی کی چھال سے یہ رسی بٹ لی ہے۔ رات کو کھیت سے گیہوں کی بالیاں توڑ کر ہولوں کی طرح بھون کر کھا لیتا ہے، پھر جنگل کے کنارے ہی کسی موٹے درخت پر چڑھ کر اس کی ڈالیوں میں اپنے آپ کو باندھ کر سو رہتا ہے۔

دن نکلتے ہی پھر اندر گھنے جنگل میں گھس کر جنگل سے گھری ہوئی چادر میں چھپ جاتا ہے۔ جنگل کا جو تصور اس نے باندھا تھا، یہاں آ کر اس میں سے کچھ نہ پایا۔ سال بنی جنگل دراصل ایک میدان کی طرح تھا جس میں فٹ سوا فٹ اونچے بھٹار اور کریاری کے چھوٹے پودوں میں لاکھوں سال کے درختوں کے سیدھے اور ننگے بے شاخوں کے تنے کھڑے ہوئے پچاس ساٹھ فٹ کے اوپر چھتری نما چند ڈالیوں سے ایک چھت تھامے ہوئے تھے۔ رات کو ان درختوں پر چڑھ رہنا اور دن میں ان کے نیچے زمین پر پھرنا ناممکن تھا۔

آٹھ نو بجتے ہی جنگل میں گائے اور بھینسوں کے گلے اور چرواہے آ جاتے ہیں۔ مزروعہ زمین کی طرف جنگل کے کنارے البتہ نیچے اور پھیلی ہوئی ڈالیوں کے درخت بھی تھے۔ گھنی جھاڑیوں کے مجموعے سے بنی ہوئی چھوٹی بڑی بھجیاں بھی تھوڑی تھوڑی دور پر تھیں لیکن دن کے وقت ان کا چھپنا ناممکن اور کسی طرح ٹھیک نہیں تھا۔ سال بنی شمال کی طرف میلوں اسی طرح چلی گئی تھی۔ اس کے مشرق میں شاردا نہر کی شاخ ہردوئی برانچ بہہ رہی تھی اور مغرب کی طرف ناقابلِ گزر کھیر کے جنگل سے ملا ایک چاندر تھا۔ اسی چاندر کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تالاب یا گڈھا تھا جس کے کنارے دلدل یا کیچڑ میں بیٹھ کے اور کھڑے رہ کر بہاری دن گزارتا تھا۔ نیچے کیچڑ میں جونکیں ہاتھ پیر اور پیٹھ پر ڈانس اور آنکھ کے آگے صدہا بھنگے اسے ستاتے تھے۔ جنگل کا چاندر صدہا جنگلی سنیٹوں پتاوروں اور گھاسوں کا ایک ایسا اونچا اور گھنا ٹکڑا ہوتا ہے جس میں انسان کو پورا پیر رکھنا محال ہوتا ہے۔ چاندر میں کبھی کوئی ایسا قدرآور درخت نہیں ہوتا جس پر انسان چھ سات فٹ بھی اوپر چڑھ سکے۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ چاندر کی ٹیٹھرے نما گھاس کچل کر دو فٹ جگہ بنا لے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اس قدر سخت ہوتی ہیں کہ کسی مضبوط ہتھیار کے بغیر نہیں کٹ سکتیں۔ پھر اب موسم بھی اور ہے، ہولی جل چکی ہے۔ سبز لہلہاتے چاندر کو چار مہینے کی سخت سردی نے مار کر سکھا دیا ہے۔ یہاں نہ اب چڑیاں چہچہاتی ہیں، نہ کالا تیتر بولتا ہے، کھڑکھڑاتا ہوا بھورا چاندر ایک چنگاری کا منتظر ہے جو کسی نہ کسی طرح ہر چاندر میں پہنچ کر ان مردہ گھاسوں کو فنا کی آخری منزل میں پہنچا دیتی ہے اور جب چاندر جل کر بھوری اور سیاہ راکھ سے ڈھکا ہوا نکل آتا ہے تو اس ارتھی کی خاک سے آنے والی نسل کے بے خبر نونہال پودے ہنستے ہوئے سر نکالتے ہیں۔ ظالم، ظالم قدرت کے قوانین ظالم ہیں۔

بہاری بڑی دیر تک ہاتھ میں رسی لیے، دوسرے ہاتھی کی انگلی سے برگد کی چھال کریدتا ہوا اسی ڈگالے پر بیٹھا سوچتا رہا، وہ جنگل کی اس زندگی سے اتنا عاجز آ چکا تھا کہ اب اس بات پر بالکل آمادہ تھا کہ پاس کے گاؤں میں جا کر فقیر یا سادھو کے بھیس میں قسمت آزمائے۔ اگر پکڑا بھی گیا تو پھانسی پر بھی لٹکنا پڑا تو اسے گوارا تھا لیکن وہ تکلیفیں جو اب وہ اُٹھا رہا تھا، ناقابلِ برداشت معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے پاس ماچس کے ایک بکس اور چند بے کار روپوؤں کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی۔ کاش ایک چاقو ہی ہوتا، دیا سلائیاں بھی ختم ہونے کے قریب آ چکی تھیں۔ دیا سلائی کا خیال آتے ہی اس نے پھٹے ہوئے کوٹ کی جیب سے ماچس کا بکس نکال کر اس کی تیلیاں گننے کے بعد نہایت احتیاط سے پھر اسے جیب میں رکھ کر ''بھگوان''! دیا کر

بھگوان! کہتے ہوئے درخت سے نیچے اترنا شروع کیا جب آخری ٹہنے پر آگیا تو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس میں لٹک گیا۔ اس کے پیر اب بھی زمین سے چار فٹ اونچے ہوں گے کہ اس نے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور دھم سے زمین پر آرہا۔ سنبھل نہ سکا، ہاتھ زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی اس کے دائیں ہاتھ کی طرف ساٹھ فٹ کے فاصلے پر ایک عورت کی ''ارے دیا'' چلانے کی آواز آئی، سر گھما کر دیکھا تو ایک عورت رفع حاجت کرنے سے لٹیا ڈبیا چھوڑ کر بھاگی چلی جارہی ہے۔

بہاری بھی گھبرا کر اُٹھا، جنگل کے اندر کی طرف بھاگا، مگر فوراً لٹیا کا خیال آیا۔ بھاگتا ہوا اس تک گیا، اسے اُٹھا رہا تھا کہ کپڑے کی بڑی سی ایک پوٹلی اور نظر آئی، اس نے اسے بھی اُٹھالیا اور لٹیا کا پانی گراتا ہوا عورت سے دوسری سمت بھاگا، فاقوں اور مصیبتوں سے جسم لاغر ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دور میں سانس پھول گیا۔ بھاگنا بند کر دیا، تیز قدم اُٹھاتا اسی چاندر میں گھس گیا۔

☆☆☆

چاندر میں پہنچ کر بہاری نے پوٹلی کھولی تو اس میں سے ایک کھرپی، ایک ہنسیا، چھٹانک بھر کے قریب تمباکو، چلم، ایک دیا سلائی کی ڈبیا اور کوئی سوا سیر کی روٹی اور بینگن کی بھاجی نکلی۔ بہاری نے فوراً کھرپی اور ہنسیا کی مدد سے چاندر میں ایک خشک جگہ تھوڑی سی زمین صاف کی، اس کے بعد لٹیا میں پانی بھر کر لایا۔ آٹھ دن ہو چکے تھے۔ سیر ہو کر روٹی کھائی، پھر آگ جلا کر چلم بھری اور اطمینان سے پیتا رہا۔ عرصے بعد یہ نعمتیں ملی تھیں۔ روٹی اور تمباکو دونوں کا نشہ چڑھا وہیں پڑ کر سو گیا۔ دن کے دس بجے سویا، شام کے چار بجے اُٹھا، درخت پر نیند کہاں بھرتی تھی۔ اب جو سو کر اُٹھا تو خواہ مخواہ طبیعت پر ایک طرح بشاشی تھی۔ صبح ہراساں ہو کر وہ گاؤں میں جانے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تھا، لیکن اب اس کے خیالات بدل گئے۔ زندگی کا چسکا پھر زندہ ہو گیا۔ ہنسیا دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گیا کہ گیہوں کی کٹائی شروع ہو گئی ہے۔ اس وقت اسے یہ فکر تھی کہ جلد سے جلد جس قدر گیہوں کھیتوں سے کاٹ سکتا ہو، کاٹ کر جنگل ہی میں کہیں چھپا دے، ورنہ گیہوں نہ رہیں گے تو کیا کھائے گا۔ آبادی میں واپس جانے کو اب اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی، اسے یقین تھا کہ وہ انسانوں میں گیا نہیں کہ پکڑا گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے فی الحال تو جنگل میں چھپا رہے۔ دنوں بعد پیٹ بھر روٹی نے اس میں ایک نئی روح ڈال دی تھی۔

شام ہوتے ہی وہ آئندہ کے منصوبے گانٹھتا ہوا چاندر سے نکل کر جنگل کی سوفٹی سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ آرہا تھا کہ اس کے بائیں ہاتھ کی طرف سڑک کے دوسرے کنارے پر اس کی نگاہ پڑی، کیا دیکھتا ہے کہ سامنے سے شیر چلا آرہا ہے، سر سے پیر تک پسینہ آگیا۔ بت بن کر جہاں کا تہاں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ بہاری کو یقین سا ہو چکا تھا کہ اس جنگل میں شیر اسے دو دفعہ پہلے دیکھ چکا تھا اور آج تیسری دفعہ آمنا سامنا ہی ہو گیا۔ شیر نے اسے دیکھ کر اپنا بھاری شاہانہ چہرہ تمکنت سے پیچھے پھیر کر ایک لمحے کے لیے کچھ دیکھا پھر نہایت شان اور اطمینان کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہوا بالکل آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ بہاری سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا کہ شیر کے پیچھے ایک اور شیر تیز قدم آرہا تھا، یہ شیرنی تھی۔

پورے دن پیٹ سے ہونے کی وجہ سے اس کی طبیعت چڑچڑی ہو گئی تھی جیسے ہی شیر کے قریب آئی، اس کی نگاہ بہاری پر پڑی، ہلکی سی غراہٹ اس کے منہ سے نکلی، شیر اور آہستہ ہو گیا۔ جونہی شیرنی اسکے بائیں ہاتھ کی طرف برابر آئی شیر پاس کے جنگل کی طرف گھوم پڑا اور اس طرح

ناراض شیرنی کو اپنے پہلو سے دھکیلتا ہوا ہٹا لے گیا۔ بہاری کے اس قدر اوسان خطا ہو گئے تھے کہ شیر اور شیرنی کے جنگل میں غائب ہو جانے کے بعد بھی وہ وہیں کھڑا تھا، عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کدھر جائے، کیا کرے؟۔ آخر پھر روانہ ہوا، تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اس کی پشت سے مور چلایا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں شیر اس سے کترا کر کچھ دور جنگل کے اندر اندر چل کر پھر سڑک پر نکل آئے تھے اور اس طرح اسے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ بہاری کی متواتر جنگل میں موجودگی سے غصہ دونوں ہی کو آ رہا تھا مگر شیر سمجھ دار مطمئن طبیعت کا تھا، اس نے دیکھا کہ معاملات نازک ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی ملکہ پیٹ سے ہے، تنہائی کی سخت ضرورت ہے، یہاں یہ انسان ہر وقت موجود رہتا ہے۔

دوسرے اس کی موجودگی سے دس بیس کا ٹکرا اور پاڑے جو اس ٹکڑے میں مستقل طریقے سے رہتے تھے، کوچ کر گئے ہیں اور نہ صرف یہی بلکہ چیتل اور سانبھروں کی ٹولیوں نے بھی اِدھر آنا بند کر دیا ہے۔ غذا کی کمی ہوتی جاتی ہے، بہتر ہے کہ یہ ٹکڑا چھوڑ کر چوکا ڈھایا کے نرکلوں میں رہا جائے، چنانچہ شیرنی کو لیے نکلا چلا گیا۔ چار میل کی معمولی چہل قدمی کے بعد دونوں سارہ کی اصل نہر کینال پر پہنچ گئے۔ سامنے چوکا ڈھایا کا پل تھا مگر انہیں اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے دو قدم اِدھر ہی نہر میں انہوں نے پانی پیا اور پھر تیرتے ہوئے پار نکل گئے۔

☆☆☆

رات گئے تک بہاری گیہوں میں لگا رہا تھا، صبح دھوپ نکل آئی تھی، اس کی آنکھ کھلی، اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا، دور کھیت میں تین چار لال صافے دیکھ کر اس کی روح خشک ہو گئی۔ جلدی سے رسی کھول کر درخت سے نیچے اُترا۔ درخت کی جڑ میں چاروں طرف بن کروندوں کی گھنی جھاڑیوں نے اور اس پر پھیلی ہوئی بیلوں نے پوری آڑ کر رکھی تھی۔ یہ وہیں سمٹ کر بیٹھ گیا، ڈر کے مارے سانس بھی پوری طرح نہ لیتا تھا، دل کی دھڑکن سے محور تھا جس کی آواز اسے نقارے کی چوٹوں کی طرح معلوم ہو رہی تھی اور جب سپاہیوں اور آدمیوں کے پیروں کی آہٹ اسی کی طرف بڑھتی سنائی دینے لگی تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے کہا ''ہے رام ایک میں اور سارا جگ میرا دشمن؟ مجھ سے کیا خطا ہو گئی ہے۔ میں نے کس جنم میں کونوں پاپ کیے تھے''۔ اس کے تصور نے چاندنی رات کا وہ نقشہ پھر اس کے سامنے کر دیا جب کہ اس کا گنڈاسا پہلی دفعہ بلدیو سنگھ کے سر میں کھسکھساتا ہوا گھستا چلا گیا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ کو تیز دھار گندہ ہڈی میں گھسنے کا احساس ہونے لگا۔ بہاری نے پھریری لے کر وہ خیال مٹا دیا اور نہ معلوم کیوں اور کس لیے وہ اپنے آپ ہی سے بحث کرنے لگا۔

''میں مجرم ضرور ہوں لیکن سزا کا مستحق نہیں ہوں۔ میں ہرگز ایسا نہ کرتا، اگر میرے دوستوں نے مجھے شراب نہ پلا دی ہوتی اور اگر بلدیو سنگھ کے باپ نے میرے اوپر اس قدر ظلم نہ کیے ہوتے۔ بے دخل کیا، زمین چھینی، باغ چھینا، لیکن اُس کا بدلہ، لڑکے کو مار ڈالنا؟ قتل! قتل! قتل؟ ہاں قتل!، میں نشے میں تھا۔ پھر اسی حالت میں رمضاتی نے آ کر جوش دلایا۔ جمنا میری منگیتر ہے۔ میری منگیتر ہے، اس کے گھر میں بھی تو بلدیو تھا جمنا! جمنا! اب کس کی ہے؟ ہے رام کرپا کر''۔ بالکل قریب آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ اسی طرف آ رہے تھے۔ ''بڑے داروغہ!'' خان کی آواز آئی۔ ''پاگل ہوئے ہو کہیں ڈاکو کھیت کاٹتے ہیں؟ گیہوں چراتے ہیں؟ ڈاکو ہوتا ہے تو کہیں نہ کہیں واردات ضرور کرتا''

ایک آواز۔ ''سرکار اکیلا ہی لگتا ہے''۔

داروغہ جی۔ ''ابے الو کی دم یہ ہم بھی جانتے ہیں، یہاں تو پیروں کے نشان دیکھنا چاہتے ہیں اور چاندر میں جا کر کیا چھ آدمی ڈھونڈ لیں گے؟ پانچ سو آدمی بھی ہوں تو نہیں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یہ تو گاؤں ہی میں پکڑا جائے گا، تھوڑے دن میں گھبرا کر ضرور کسی نہ کسی گاؤں میں جائے گا۔ تم لوگ خیال رکھنا۔ جو پکڑ لائے گا یا اطلاع دے گا، اسے بہت انعام ملے گا''۔

☆☆☆

دنیا بھر سے زیادہ پیاری جان۔ تیری حفاظت ہر طرح کی جاتی ہے۔ سڑک کے کنارے اندھی لنگڑی بڑھیا سسک سسک کر بھیک مانگتی ہے۔ جوانی کے وہ دن! عشاق کے ہجوم، عیش و عشرت، روپیہ پیسہ، بال بچے، گھر بار، سب رخصت ہو گئے۔ کچھ نہ رہا۔

الوداع! اے انسانو کی بستیو! الوداع! بہاری اب کبھی تمہاری طرف رُخ نہیں کرے گا۔

انسانی رہ گزر سے کوسوں دور گھنی سبز اور شاداب جھاڑیوں اور طرح طرح کے فرنوں سے ڈھکا چوکا ڈھایا ڈھلوان اترتا ہوا اپنے میں ٹھنڈی سبز بید کی جھاڑیاں شامل کر لیتا ہے تو پھر وہاں انتہائی گھنا پندرہ فٹ اونچا نرکل کا تختہ اس سے آملتا ہے، جب تمام جنگل سوکھ جاتا ہے اور ہر طرف آگیں لگی ہوتی ہیں تو یہاں مہکتے ہوئے پھولوں میں صدہا چڑیاں جھولا جھولتی ہیں اور قدرت کے راگ گاتی ہیں۔ اسی نرکل میں ایک جگہ سے چھچاندی چھچاندی بو آتی ہے۔ تر زمین پر نازک نرکل بچھا کر شیر اور شیرنی نے بچے دیئے ہیں جنہیں وہ لیٹی ہوئی بڑے غرور سے دیکھ رہی ہے۔ اس کی پشت پر شیر غافل پڑا سو رہا ہے، بچوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں، وہ آپس میں کھیل رہے ہیں۔ سنہرے بدن پر ہلکی دھاریاں بھی نظر آنے لگی ہیں، شام ہو گئی ہے۔ شیرنی کو انتظار ہے کہ کب اس کا سرتاج شیر اٹھے اور کب وہ ڈھائے سے اوپر سانپ لائن سے کچھ دور روہنی کی جھاڑیوں میں جائے جہاں کل کا بچا ہوا آدھا سانبھر اب بھی پڑا ہے۔ شیر انگڑائی لے کر لیٹے سے سر اُٹھا کر اسے اور بچوں کو دیکھتا ہے۔ شیرنی فوراً بدن کو جھکولا دے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ گول مٹول بھورے بھورے دونوں بچے جو اس کے اوپر سوار ایک دوسرے پر داؤ لگا رہے ہیں۔ لدلد زمین پر گر کر لڑھک جاتے ہیں جیسے شیر اُٹھ کر بیٹھتا ہے، شیرنی نرکلوں میں آمد و رفت سے بنی ہوئی گلی کا رُخ کرتی ہے، شیرنی چونکہ دودھ پلا رہی ہے، اس کی اشتہا بڑھی ہوئی ہے وہ بھوکی ہو رہی ہے، آخر شیر بھی روانہ ہو گیا جب نرکلوں سے باہر آگیا تو اس نے ایک لمبی چوڑی انگڑائی پھر لی اور شیرنی کے پیچھے پیچھے اطمینان سے چل دیا۔

بید کی جھاڑیوں سے نکل کر جیسے وہ دونوں سانپ لائن پر آئے، ایک ساکھو کی ساٹھ فٹ کی بلندی سے مور نے می اوں می کے نعرے لگائے، بلدو کے درخت پر بیسیوں بندروں کی کٹکٹی بندھ گئی۔ ان دونوں کو آج شکار تو مارنا نہیں تھا، اس لیے چھپ کر پھرنے کی ضرورت نہیں تھی، ان کے نکلنے کی اگر جنگل کو اطلاع ہو گئی تو ہو جائے اطمینان سے کھلم کھلا سانپ لائن پر چلتے رہے اور جب روہنی کے جنگل کے نیچے پہنچ گئے تو باری باری ایک جست لگا کر ڈھائے پر چڑھ گئے اور روہنی میں تھوڑی دور چل کر سانبھر کی بچی کھچی ٹھٹھری پر پہنچے لیکن یہاں آتے ہی دونوں کے شاہانہ سکوت اور اطمینان میں قہر اور غصے کا تغیر پیدا ہو گیا۔ شیر غضب ناک ہونے لگا، اس کی نرم و نازک لچکتی ہوئی ملکہ خون خوار جھنجلاتی ہوئی شیرنی ہو گئی، گوشت چرایا گیا ہے، انسان کی بو آرہی ہے۔ شیر کی سیدھی دم کی نوک دائیں اور بائیں لہرا لہر کر طبیعت کا انتشار ظاہر کرنے لگی، شیرنی کو غصہ زیادہ تھا، ناگن کی سی دو پھنکاروں کی سی آوازیں اس کے منہ سے نکلیں وہ سانبھر کی بچی ہوئی کھال اور ہڈیاں سونگھتی ہوئی اس کے چاروں طرف گھومی پھر ایک طرف روانہ

ہوگئی۔ آج وہ ضرور اس موذی چور سے بدلہ لے گی یہ تیسری بار ہے کہ اس کا شکار چوری ہوا ہے۔ شیر بھی اس کے ساتھ ساتھ روانہ ہوگیا لیکن اب اس پر وہی فطری متانت آگئی تھی، وہ بڑھ کر شیرنی کے آگے ہولیا۔ جاتے جاتے تین فرلانگ بعد جیسے ہی کنارے کی گھنی پتاور سے کھلی ہوئی فائر لائن پر شیر نے باہر کو سر نکالا، دو سو قدم پر بھاگتا ہوا انسان نظر آیا۔ شیر آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف گھوم پڑا اور اسی طرف کتنا ہوا شیرنی کو نہر کی پٹڑی پر نکال لے گیا۔

اگر کوئی چیز انسانی دماغ پر ایک ہی وقت میں دو متضاد اثرات پیدا کر سکتی ہے تو ترائی کے جنگل ہیں..... جنہوں نے خود ان جنگلوں کی سیر نہیں کی ہے، وہ مشکل ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ شام کے وقت چوکاندی کے ڈھائے کے کنارے کسی فائر لائن پر کھڑے ہوں، تو دونوں طرف کے اونچے سال کے جنگلوں میں لاکھوں قد آور درختوں کے تنے ہی اوپر کے سبز پتوں سے بنی ہوئی چھت کے اندھیرے میں نگاہ سے اوجھل پڑتے پڑتے غائب ہو جاتے ہیں۔ ڈھائے کی طرف صدہا جھاڑیاں ان پر بیلیں اور دھانی رنگ کے نازک پودوں کے بعد ہر کچی بید کی بیلوں سے بنی ہوئی جھاڑیوں سے ہوتی ہوئی نگاہ نرکل کے لہلہاتے تختے پر میلوں جا کر دھندلی پڑتے پڑتے کسی دور دراز جنگل میں مل جاتی ہے جو فاصلے کی وجہ سے دھندلے غبار کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

جنگل میں ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہوتی ہے، دفعتہً ایک مرغی کڑکڑاتی ہے اور اس کے بعد ہی مور چلاتا ہے، می آؤں، می آؤں اور پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ منظر ایک ہی وقت میں انتہائی دل فریب بھی معلوم ہوتا ہے اور انتہائی بھیانک بھی۔ انسان خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگنا بھی چاہتا ہے اور ہٹنے کو دل بھی نہیں چاہتا لیکن یہ سب کچھ اسی وقت تک ہے جب تک دن کی روشنی پوری طرح موجود ہے جیسے جیسے اندھیرا بڑھتا ہے، اس کی دل فریبی بھیانک پن میں بدلتی جاتی ہے، جوں جوں شام ہوتی ہے دل کی حرکت تیز ہوتی ہے اور جھٹ پٹے کے وقت دیکھنے والے کو یہ جنگل موت کا بھیانک سمندر معلوم ہوتا ہے۔ درخت اور جھاڑیاں سیاہ کمبل اوڑھ کر منحوس شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔ اس وقت سیر کرنے والے کا دل روشنی اور انسانی صحبت کے لیے تڑپتا ہے۔ وہ جلد جنگل سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے اور جب ایک دفعہ پھر وہ لیمپ کی روشنی میں اپنے ہم جنسوں میں جا بیٹھتا ہے تو اس کا دل خود بخود خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

لیکن صرف چار مہینے کے قلیل عرصے میں پیاری جان کی حفاظت کا جذبہ بہاری کا دماغ ان احساسات سے اسے معطل کر چکا ہے۔ انسانی خیالات اور محسوسات ساکت ہو چلے ہیں۔ ان کے بجائے خالص حیوانیت ترقی کر رہی ہے۔ سر اور داڑھی کے خود رو پریشان بالوں سے گھرا ہوا چہرہ انسان کے چہرے سے بہت کچھ جدا معلوم ہوتا ہے۔ کمر سے گھٹنوں تک اب بھی کپڑے کی چندلیریں لٹکی ہوئی ہیں۔ حرکات میں وحشت، چال میں چیتے کی سی جھپک اور آنکھوں میں ہرن کا سا چوکنا پن ہے۔ اب وہ بیٹھ کر اپنی بدقسمتی کے واقعات سوچنے کے بجائے جنگل کی آوازوں پر کان لگا کر ان کے مطلب اخذ کرتا ہے۔ جنگل کی جڑوں اور پتوں سے بڑھ کر پرندوں کے انڈے، بسیرا لیتے پرندے، مرے گرے جانور اور دوسروں کا مارا ہوا شکار کھاتا ہے۔

☆☆☆

ایک دن حسب دستور مور نے کوک کر، میناؤں نے شور مچا کر اور بید کی رہنے والی مرغیوں نے کڑکڑا کر اطلاع کر دی تھی کہ جنگل کا بادشاہ اور اس کی ملکہ رات کے کاروبار سے فراغت کر کے دن بھر سونے کے لیے نرکلوں میں گھس گئے ہیں اور جب بندروں نے بھی درختوں سے اترنا شروع کیا تو بہاری بھی درخت سے اُترا۔ رات کو سانبھروں کے بے تحاشا بھاگنے، چیتلوں کے پوق پوق چلانے کے بعد چوکا کی طرف سے شیر کے فتح مندانہ گرجنے کی آواز سن چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج پھر تازہ شکار مارا گیا ہے۔

اب اس کے لیے یہی بہتر تھا کہ شام ہونے سے پہلے اس شکار کو ڈھونڈ لے جسے کہ شیر اور شیرنی نے انتہائی کمال سے کہیں چھپا دیا ہوگا۔ بہاری اس کی تلاش میں روانہ ہوا لیکن ڈھونڈتے ڈھونڈتے دن ڈھل گیا، وہ ناامید ہو کر یہ جستجو دوسرے دن کے لیے ملتوی کرنے ہی والا تھا کہ شکار کی گھسٹیتی پر اس کی نگاہ پڑ گئی، فوراً بہاری نشان پر روانہ ہوا۔ نرکلوں سے آدھ میل جنوب کی طرف سانپ لائن سے ہو کر یہ وہاں جا پہنچا جہاں نرکل ختم ہو کر پانی اور کیچڑ میں گھنا پیڑ کھڑا تھا۔ اب گوشت کچھ دور نہیں تھا۔ ضرور اسی پیڑ میں ہوگا، ایک کوا بھی وہاں بیٹھا تھا لیکن شام ہو چلی تھی، وہاں جانا مخدوش تھا۔ شیر کے نکلنے کا وقت آ گیا تھا، مگر بہاری کو تین دن کا فاقہ آ چکا تھا۔ اس نے ہمت کر جلدی سے تھوڑا گوشت کاٹ لیا، پانی میں چھپتا چھپاتا پیڑ کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا، تیزی سے بڑھا۔ پتوں سے ڈھکے سانبھر تک پہنچا تھا کہ دور مور چلایا، مرغیاں کڑکڑائیں۔ بہاری سانبھر پر جھکا ہوا تھا، ایک سکینڈ کے لیے ٹھٹک گیا لیکن فوراً اس نے ارادہ کیا کہ ایک ہی ٹکڑا کاٹ لے۔ کھائی اور چری ہوئی سانبھر کی لاش پر ایک ہی وقت میں ایک جگہ دونوں ہاتھ ہنسیا سے گوشت کاٹنے میں لگ گئے اور دوسری جگہ اس کے دانت کچھ گوشت میں مصروف ہو گئے۔ دو لقمے پیٹ میں اور سیر بھر کا ٹکڑا ہاتھ میں لے کر بہاری بھاگا۔ پیڑ سے نکل کر جھاڑیوں میں سے ہو کر جس وقت وہ سانپ لائن پر آیا تو وہیں شیرنی کھڑی تھی۔ خاموش بجلی سی کوندی، شیرنی کا چار من کا جسم ایک ہی چھلانگ میں بھاگتے ہوئے بہاری پر گرا۔ کمر اور پسلیاں سٹیوں کی طرح چرچراتی چلی گئیں۔ بہاری شیرنی کے اگلے پیروں کے نیچے ایسا پڑا تھا جیسے کھونٹی سے گری ہوئی اچکن پڑی ہو۔

شیر پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ ان واقعات سے بے خبر ٹہلتا ہوا جیسے ہی قریب آیا، ٹھٹک کر رُک گیا۔ شیرنی نے لاش اس طرح منہ میں اُٹھالی جیسے بلی نیم مردہ چوہا اُٹھاتی ہے۔ شیرنی اسے جھٹکے دینے لگی۔ شیر کے منہ سے گھٹی ہوئی غراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ بہاری کے زمین پر گھسٹتے ہوئے پیر اور لٹکتے ہوئے ہاتھ ہلتے دیکھ کر خوف سے شیر کی گردن کے بال کھڑے ہو گئے۔ شیر انسان سے نہیں ڈرتا تھا لیکن جنگل کے قوانین اس طرح شکن آلود ہوتے دیکھ کر تھرا گیا۔ وہ آہستہ سے گھوما اور خوں خوں خوں غراتا ہوا شیرنی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ڈھائے سے اُتر کر پیڑ اور اس کے بعد کلک کے جنگل سے نکلتا ہوا چوکا کو تیر کر نیپال کی طرف نکل گیا۔

انسان کے گوشت اور خون میں ایک عجیب صفت ہوتی ہے جس طرح کتے کے کاٹے سے انسان بولایا ہو جاتا ہے، اسی طرح درندے انسان کے گوشت سے بولا جاتے ہیں پھر انہیں ہر وقت انسان ہی کی جستجو رہتی ہے۔ شیرنی کا بھی یہی حال ہوا۔ ایک بنر کھے اور دو گاڑی والوں کو مارنے کے بعد جب اسے اور آدمی چوکا ڈھایا کی طرف نہ ملے تو اپنے بچوں سمیت وہ نہر پار کر کے گھومتی گھومتی مزروعہ زمین اور گاؤں سے طے مینا کوٹ کی زمین داری کے جنگل میں آ گئی، یہاں آ کر اس نے متواتر کئی خون کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن دوپہر کے وقت ہانکا کر کے طرح طرح کی آوازوں سے

ڈرا کر اسے نئے اگے چاندر سے نکلا، دونوں چھوٹے بچے ساتھ تھے جن کی وجہ سے یہ بھاگ بھی نہیں سکتی تھی، جونہی یہ بچوں کو لیے چاندر سے نکلی، سامنے درختوں پر بندھے ہوئے مچانوں سے تڑاتڑ بندوقوں کے فائر ہوئے، دو گولیاں اس کے لگیں اور ایک اس کے بچے کو دونوں وہیں ڈھیر ہو گئے۔ محمود کی گولی گردن پر، احمد میاں کی پاکھے پر کبھی خطا ہی نہیں ہوئی۔ دوسرا بچہ پھر چاندر میں گھس گیا جو کمبل اور کپڑے ڈال کر زندہ ہی پکڑ لیا گیا۔

آج اس واقعے کو برسوں گزر گئے ہیں، اب بھی کہیں ایک سفید بڈھا لکڑی ٹیکے ٹیکے پھر کر زندگی کے کاروبار بھی کرتا ہے اور دن میں کئی دفعہ لکڑی کے سہارے بیٹھ کر اپنے اکلوتے بیٹے بلدیو سنگھ کو یاد کر کے آنسو بہاتا ہے اور کہتا ہے "اے بھگوان" میں نے کونوں پاپ کیے تھے جو مجھے یہ سزا ملی" اور اب بھی کہیں ایک گیارہ فٹ لمبا شاندار شیر اپنا لاغر جسم لچکاتا ہوا گھنٹوں کٹہرے کی سلاخوں کے آگے گھومتا ہے اور جب سلاخوں سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تو بیٹھ کر کسی دور دراز خیال میں غرق ہو جاتا ہے، تماشائی تالیاں بھی بجاتے ہیں، کنکریاں بھی پھینکتے ہیں مگر اسے خبر نہیں ہوتی۔ وہ کسی گہرے خیال میں ہوتا ہے، شیر کیا سوچتا ہوگا؟ یارب! یہ دنیا کن گناہوں کا کفارہ ہے؟

http://kitaabghar.com

.....❀.....

سنجیدہ خاتون کے قلم سے پراسرار ماورائی داستان

جن زاد

- آدم زادوں کے درمیان ایک جن پر کیا گزری؟
- پیر شکر کی پراسرار مائی کون تھی؟
- جنات اور کالے علم کے ساحروں کا خوفناک ٹکراؤ
- ایک جن کی محبت کا قصہ
- ایک نٹ کمٹ جن کی انوکھی پراسرار داستان

قیمت فی حصہ 60 روپے

سی آئی اے کے اندر پلنے والی خوفناک سازش کی کہانی
اس شخص کی داستان جو خود بادشاہ نہیں تھا، لیکن بادشاہ گر تھا
میٹرکس..... ایک خفیہ تنظیم جو امریکی صدارت اور وائٹ ہاؤس پر قبضہ کرنا چاہتی تھی
امریکی سیاست کا اہم ترین راز ایک بلی کے پٹے میں چھپا ہوا تھا

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک شاہکار جاسوسی ناول

بادشاہ

قیمت -/150 روپے

محی الدین نواب کے قلم سے ایک شاہکار ناول

زہریلا پھول

قیمت -/150 روپے

اپنے قریبی بکسٹال یا ہاکر سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
Ph: 7247414

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

چنار گڑھ کا چیتا

میں ان دنوں چنار گڑھ میں فاریسٹ آفیسر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس علاقے میں برسات بڑی زور سے ہوتی، جونہی برسات کا موسم شروع ہوتا تو اس علاقے میں چھوٹے چھوٹے بکھرے ہوئے دیہاتوں کے لوگ مختلف طریقوں سے بارشوں سے بچاؤ کی کوشش شروع کر دیتے لیکن اس کے باوجود ہر سال بہت سے کچے مکان گر جاتے تھے۔ اس موسم میں جانوروں کے لیے بھی شکار کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس لیے بعض اوقات چیتے اور شیر جیسے بڑے جانور آدم خوری پر اُتر آتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ پہاڑی ریچھ بھوک سے تنگ آ کر انسان پر حملے بھی کر دیتے تھے۔ برسات کے موسم میں یہاں کے لوگ گاؤں کے قریب ہی رہتے اور اپنے مویشیوں کو دور جنگل میں جانے نہیں دیتے تھے۔ علاقہ کیونکہ پہاڑی اور میدانی ملا جلا تھا، پہاڑی ڈھلوانوں پر تو درخت کثرت سے تھے۔ یہ چیڑ اور دیودار کے بڑے گہرے سرسبز درخت تھے جو ڈھلوانوں پر کٹاؤ اور پتھروں کے ٹوٹنے کو روکے رکھتے تھے لیکن نچلے میدانی علاقوں میں درخت چھوٹے چھوٹے ہو جاتے تھے یہاں کثرت سے سرسبز جھاڑیاں ہوتیں اور بعض اوقات یہ جھاڑیاں اتنا پھیل جاتیں کہ سالم ہاتھی ان میں چھپ سکتا تھا۔ ایسی جگہوں پر درخت بھی کافی تھے لیکن یہ زیادہ بلند قامت نہ تھے۔

میرا ریسٹ ہاؤس ان علاقوں میں بکھرے بے نام سے ایک گاؤں کے مشرق میں کھلی جگہ پر تھا۔ اِرد گرد درخت بہت کم تھے، بڑے اور گھنے درختوں کو صاف کر دیا گیا تھا تاکہ قریبی سڑک تک راستہ حاصل کیا جا سکے۔ ایک دن میں شہر سے ضروری سامان لے کر واپس آیا تو گاؤں سے اُترتے ہی سب سے پہلی خبر جو میرے کانوں میں ڈالی گئی، وہ یہ تھی کہ پچھلے چند روز سے ایک چیتے نے ریسٹ ہاؤس کے قریبی گاؤں میں اودھم مچا رکھا تھا۔ ایک آدھ دن چھوڑ کر وہ گاؤں سے بکری اُٹھا لے جاتا۔ رات کے وقت یہ درندہ اتنی چالاکی، مہارت اور دلیری سے حملہ کرتا کہ باوجود پہرے کے اس کے شکار میں فرق نہیں آیا تھا اور سب سے اہم اطلاع یہ تھی کہ آج اس گاؤں کے قریب چرتی ہوئی ایک گائے پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا۔ اس حادثے کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ جب گائے کے رکھوالے نے شور مچا کر چیتے کو ڈرانے کی کوشش کی تو اس نے رکھوالے پر حملہ کر دیا لیکن خدا کی قدرت کے چیتے کا پنجہ جونہی رکھوالے کے کندھے پر پڑا تو وہ ڈر کے بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آنے پر اس نے دیکھا کہ اس کے کاندھے پر چیتے کے پنجوں نے ہلکی خراش ڈال دی تھیں اور اس کے بے ہوش ہو کر گرنے کے بعد چیتا گائے کو گھسیٹتا ہوا کافی دور لے گیا تھا۔ رکھوالے نے پہلا کام یہ کیا کہ سرپٹ گاؤں کی طرف بھاگ اُٹھا۔

اب گاؤں کا مکھیا، گائے کے رکھوالے کے ساتھ میرے پاس درخواست لے کر آیا تھا کہ میں چیتے کو شکار کروں، ورنہ شاید چند روز میں یہ جانور انسانوں کا شکار شروع کر دے۔ مکھیا کے ساتھ اس کا نوجوان بھتیجا بنسی رام بھی تھا جو اپنے چچا سے ملنے گاؤں آیا ہوا تھا وہ چیتے کو شکار کرنے میں بہت پُرجوش دکھائی دیتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس بارہ بور کی بندوق بھی ہے جس سے وہ شکار کرتا رہا ہے اور اگر اب بھی اس کے پاس

بندوق ہو تو وہ چیتے کو بھی شکار کر سکتا ہے۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ پرندوں اور چیتے کے شکار میں بڑا فرق ہوتا ہے لیکن اس کا لہجہ دیکھ کر میں خاموش رہا کیونکہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا نوجوان دماغ میری کوئی دلیل نہیں مانے گا۔ اس وقت شام ہونے والی تھی، میں اگرچہ تھکا ہوا تھا لیکن پھر بھی میں نے انہیں مدد کا یقین دلایا جس وقت تک میں نہا کر تازہ دم ہوا، اس وقت تک بنسی رام اپنے چچا کو اپنی شکار بیتی کے عجیب و غریب واقعات سنا چکا تھا۔ جوش میں وہ کھڑا ہو جاتا اور اپنی اجلی دھوتی سنبھال کر اِدھر اُدھر پھرتا اور پھر کوئی نیا واقعہ سنانے لگتا۔

میں نے نہانے کے بعد اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لیا۔ بنسی رام مکھیا اور گائے کا رکھوالا بھی میرے ساتھ تھے۔ بنسی رام نے ضد کر کے مجھ سے ایک رائفل لے لی۔ مجھے کیونکہ پہلے سے کچھ اندازہ تھا، اس لیے ہم نے ایک کی بجائے دو مچانیں باندھنے کا سامان ساتھ لیا جس وقت ہم گائے کی لاش تک پہنچے، اس وقت تک روشنی کافی کم ہو چکی تھی۔ میں نے گھاس سے خالی تھوڑی جگہ پر چیتے کے پیروں کے نشانات ڈھونڈے تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بھاری جسامت کا چیتا ہے جو بارش کے موسم میں زیادہ شکار نہ ملنے کی وجہ سے آبادیوں کے قریب آ گیا ہے۔ چیتا گائے کو گھسیٹتا ہوا کافی دور لے آیا تھا۔ اس نے گائے کو ذرا بھی نہیں کھایا تھا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ چیتا رات کو ضرور آئے گا۔ اس کے بعد میں نے ان درختوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا جس پر مچان باندھا جا سکتا تھا۔ گائے کی لاش جس درخت کے پاس پڑی تھی، وہ اچھی جسامت کا تھا جبکہ اس سے کچھ فاصلے پر ایک اور درخت تھا جس کا پھیلاؤ زیادہ تھا لیکن اونچائی زیادہ نہ تھی۔ دونوں درختوں پر مچانیں باندھ دی گئیں تو میں نے بنسی رام سے کہا کہ اس مچان پر بیٹھ جائے جو زیادہ اونچائی پر ہے۔ یہ مچان قریباً مردہ گائے کے جسم کے اوپر بیس اکیس فٹ کی بلندی پر تھا اور اس مچان سے زیادہ محفوظ تھا جس پر مجھے بیٹھنا تھا۔

میں نے مکھیا یعنی گاؤں کے نمبردار اور اپنے آدمیوں کو واپس بھیج دیا اور سختی سے ہدایت کی کہ اس وقت تک کوئی بھی مچان تک نہ آئے جب تک متواتر تین فائروں کی آواز نہ سن لے۔ ان کے جانے کے بعد میں اور بنسی رام اپنی اپنی مچانوں پر بیٹھ گئے، کیونکہ اندھیرا بڑا جلدی پھیلتا جا رہا تھا۔ میری اور بنسی رام کی مچان کے درمیان کوئی تیس گز کا فاصلہ تھا جہاں سے میں بنسی رام کی حرکات کو غور سے دیکھنے پر محسوس کر سکتا تھا۔ مچان پر بیٹھ کر میں نے جنگل کے ماحول کو محسوس کیا۔ چاروں طرف جانوروں اور پرندوں کی رنگ برنگی آوازیں گونج رہی تھیں۔ میرے پیچھے کی پہاڑی ڈھلوان سے بندروں کا شور پورے تسلسل سے جاری تھا۔ کبھی کبھی مور کی اونچی گونج دار آواز بازگشت بن کر اُبھرتی اور پہاڑیوں میں بکھر جاتی لیکن جوں جوں اندھیرا پھیل رہا تھا، اسی حساب سے پرندوں کی آوازیں کم پڑتی جا رہی تھیں لیکن جانور اب پہلے کی نسبت زیادہ بول رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گھپ اندھیرا ہو گیا۔ آسمان صاف تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد چاند اُبھر آیا جس سے چیزیں بڑی واضح نظر آنے لگیں۔ اب اِکا دُکا جانور کی گونج دار آواز پہاڑیوں میں چکراتی ہوئی دم توڑ دیتی۔ میرا خیال تھا کہ چیتا نصف شب کے قریب آئے گا، لیکن اچانک پہاڑی ڈھلوان پر بندر زور سے خوخیائے۔ میں نے احتیاط سے گھڑی دیکھی، ساڑھے دس ہونے والے تھے۔ بندروں نے اعلان کر دیا تھا کہ چیتا آن پہنچا ہے جس کے آنے کی مجھے اتنی جلدی امید نہ تھی لیکن بندروں نے خطرے کی آواز نکالی تو میری سبھی حسیات بیدار ہو گئیں۔

سامنے درخت پر بنسی رام کا ہیولا بھی نظر آ رہا تھا، لگتا تھا کہ وہ بھی چیتے کی آمد کے بارے میں جان چکا ہے۔

میں نے خاموشی کے ساتھ چیتے کی حرکات کو سننے کی کوشش کی لیکن چالاک درندہ ذرا بھی آواز پیدا نہیں کر رہا تھا اور پھر اچانک ہی میں نے

اس کا وجود محسوس کرلیا۔ مردہ گائے سے بائیں طرف کی جھاڑیوں میں چیتے نے آہستہ سے گردن نکالی، اس وقت تک چاندنی خوب پھیل چکی تھی۔ چیتا چند لمحے وہیں رکا پھر باہر نکل آیا وہ واقعی بڑی جسامت کا تھا جو احتیاط سے مردہ گائے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری پوزیشن ایسی تھی کہ اگر میں اس کا نشانہ لینا چاہتا تو مجھے رائفل سامنے کے رُخ پر لانا پڑتی اگر میں رائفل ہلاتا تو مجھے یقین تھا کہ چیتا میری حرکت کو دیکھ کر فوراً بھاگ جاتا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ چیتا دائیں ہاتھ پچھلی طرف سے آئے گا تو رائفل بھی اسی طرف رکھ لی تھی لیکن چیتا بائیں ہاتھ سامنے جھاڑیوں میں سے نمودار ہوا تھا۔

اتنی دیر میں چیتا گائے تک پہنچ گیا۔ اس نے بیٹھ کر دونوں پنجے گائے کی پچھلی ٹانگ پر رکھے اور گوشت اُدھیڑنے لگا۔ میں حیران تھا کہ بنسی رام فائر کیوں نہیں کر رہا۔ یہ سوچ کر میں نے غیر اِرادی طور پر مچان کی طرف نظر اُٹھائی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ بنسی چیتے کے خوف سے بت بن چکا ہے۔ دوبارہ جب چیتا گائے کا گوشت اُدھیڑنے میں مصروف ہوا تو میں نے آہستہ سے رائفل سیدھی کر لی۔ اگلی بار رائفل کندھے تک اُٹھا کر میں نے شست باندھی اور ٹھیک اس لمحے جب میری انگلی ٹرائیگر کو چھو رہی تھی، اچانک ایسا واقعہ ہوا کہ اگر اچانک اس رات سورج بھی نکل آتا تو میں اتنا نہ گھبراتا۔ اچانک ہی جنگل کی خاموش فضا چراں.....کی خوفناک آواز سے گونج اُٹھی اور وہ موٹی شاخ جس پر بنسی رام کا مچان بندھا ہوا تھا، بمعہ مچان کے چیتے پر آن گری، اس وقت اندازہ کرنا مشکل تھا کہ میرے اور چیتے میں سے کون زیادہ خوف زدہ ہے۔ چیتے نے ایک دہشت انگیز چیخ بلند کی اور چشم زدن میں جھاڑیوں میں غائب ہو گیا، تب ایک اور چیخ گونجی میں نے گھبرا کر سامنے دیکھا تو بنسی رام اس شاخ سے لٹکتا نظر آیا جو مچان کے بالکل اوپر تھی۔ یہ سارا واقعہ شاید پانچ سے دس سیکنڈ میں رونما ہو گیا۔ جس وقت مجھے احساس ہوا کہ کیا ہو چکا ہے تو بے اختیار میری دبی دبی ہنسی نکل گئی، اِدھر بنسی رام جس شاخ سے لٹکا ہوا تھا، وہ اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے جھاڑیوں میں پہلا فائر کیا تو سارا جنگل خوفناک دھماکے سے گونج اُٹھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دوسرا فائر کیا اور بنسی رام کو آواز دی کہ وہ شاخ سے اُتر کر میری مچان پر آجائے۔ جتنی دیر میں سہما ہوا بنسی رام میری مچان تک آیا، میں چاروں طرف دیکھتا رہا ویسے مجھے اُمید نہیں تھی کہ دو فائروں کے دھماکے کے بعد چیتا کہیں قریب رُکا ہوگا۔

بنسی کے آنے کے بعد میں نے رائفل اس کو تھمائی اور خود سکون سے ستانے لگا۔ بنسی کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ اس لیے میں نے اسے مزید تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

صبح جس وقت مکھیا اور میرے آدمی مجھے لینے آئے تو بنسی رام بخار کی شدت سے تپ رہا تھا۔ مچان گائے کے مردہ جسم پر پڑا تھا اور میں سو رہا تھا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ اگلے چوبیس دن مجھے چیتے کے شکار میں خوار ہونا پڑا اور جب وہ ساتویں بکری کا شکار کرنے آیا تو میرا شکار بن گیا، لیکن بنسی رام کے ساتھ بہت بُرا ہوا۔ تین دن وہ بخار میں ہزیان بکتا رہا۔ میں اسے جیپ میں ڈال کر شہر کے ہسپتال میں لے گیا جہاں اسے تندرست ہونے میں کافی دن لگے، لیکن اب بھی جب کبھی مچان گرنے کا یہ واقعہ یاد آجاتا ہے تو بے اختیار مسکرا کے رہ جاتا ہوں۔

.....❁.....

ریچھ کی بدمعاشی

میری دائیں ٹانگ پر ٹخنے سے ذرا نیچے تین لکیریں سی بنی ہوئی ہیں کسی روز اگر اچانک ان پر نظر پڑ جائے تو میں ان پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگتا ہوں، کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں ٹانگ پر ہاتھ رکھے رکھے سوچوں میں کھو جاتا ہوں، سوچیں مجھے ماہ وسال کی قید سے دور پھر جوانی کے اسی دور میں لے جاتی ہیں جب خطرات مول لینے میں مزہ آتا تھا۔

فاریسٹ آفیسر میں اگر شکار کا شوق موجود ہو تو پھر اس کی زندگی میں خطرات کو گھیر کر لانے کے بہت سے مواقع موجود ہوتے ہیں، یہی کچھ میرے ساتھ ہوا اور کئی بار ہوا۔ جنگلات کا سروے کرتے پودوں کے بارے میں مختلف اعداد وشمار اکٹھے کرتے بہت سے مواقع ایسے آتے رہتے کہ جنگلی جانوروں سے لڑائی کی نوبت آجاتی۔ ایسے میں اگر بندہ اچھا، دلیر اور محتاط شکاری نہ ہو تو جانور بڑی جلدی اسے زندگی اور انگریزوں کی نوکری سے آزاد کروا دیتا ہے، کیونکہ بعض اوقات جنگلات کی کٹائی کے لیے بہت سے مزدوروں کی ضرورت پڑتی تھی جس کی وجہ سے جانوروں کو وہ علاقہ چھوڑنا پڑتا بعض اوقات جانور غصے میں حملہ بھی کر دیتے یا ایسے گوشت خور جانور جیسے شیر، تیندوے اور چیتے آدم خوری پر بھی اتر آتے تھے، کیونکہ جنگل کے تیز رفتار جانوروں کی نسبت انسان ان کے لیے آسان شکار ثابت ہوتا تھا۔

لکڑی کاٹنے والے مزدور جنگل میں کیمپ سا بنا لیتے جہاں تھوڑے تھوڑے عرصہ بعد کوئی نہ کوئی واردات ضرور ہو جاتی۔ میری ٹانگ کی تین لکیریں بھی ایک ایسے ہی کیمپ کی یادگار ہیں۔ ہمارا کیمپ شمیر گڑھ سے تقریباً بیس کلومیٹر کی دوری پر گھنے جنگل میں تھا۔ شمیر گڑھ گھنے جنگلوں کے کنارے پر آخری قصبہ تھا۔ حکومت کا خیال تھا کہ شمیر گڑھ سے لے کر کنریالہ تک سڑک بنا دی جائے۔ یہ تقریباً ایک سو پچاس کلومیٹر کا فاصلہ تھا اور سڑک کا زیادہ تر حصہ گھنے جنگل میں بنایا جانا تھا۔ چنانچہ جنگلات کی کٹائی کا کام شروع کر دیا گیا، مزدوروں نے شمیر گڑھ سے بیس کلومیٹر پر اپنا کیمپ بنا لیا تاکہ ہر روز واپس شمیر گڑھ تک کا فاصلہ طے نہ کرنا پڑے۔

کیمپ میں آئے ہوئے ابھی سات آٹھ روز ہی ہوئے تھے کہ جب پہلی واردات ہوئی، مزدوروں کو اندازہ تھا کہ جنگل میں جانور کثرت سے ہیں، چنانچہ سونے سے پہلے کیمپ کے بیرونی کناروں اور درمیان میں آگ کا الاؤ روشن کر لیتے تھے تاکہ جانور آگ کے ڈر سے دور ہی رہیں لیکن اس رات مزدوروں کا خیال غلط ثابت ہوا، میری آنکھ مزدوروں کے شور سے کھل گئی، گھبرا کر باہر نکلا تو دیکھا ہر کوئی افراتفری میں اِدھر اُدھر بھاگ رہا ہے۔ صرف اتنا پتہ چل رہا تھا کہ کیمپ میں شیر آگیا ہے، میں نے جلدی سے رائفل اُٹھائی اور جائے واردات کی طرف بھاگا۔ مزدوروں نے چھوٹے چھوٹے خیمے سے بنائے ہوئے تھے اور شیر کنارے والے خیمے میں خاموشی سے داخل ہو کر ایک مزدور کو منہ میں دبائے چلتا بنا تھا۔

مزدور کی گھٹی گھٹی چیخوں سے اس کے دوسرے ساتھی بھی جاگ اُٹھے اور اب ہر کوئی اپنے اندازے کے مطابق شیر کی لمبائی بتا رہا تھا۔ ان

کی باتوں سے لگتا تھا کہ شیر گدھے سے لے کر ہاتھی سے ذرا بڑا ہو سکتا ہے۔ بعد میں جب تفصیلاً بات ہوئی تو پتہ چلا کہ جس شخص کو پہرے پر مقرر کیا گیا تھا وہ سکون سے اپنے خیمے میں سویا ہوا تھا، ورنہ شاید شیر کی آمد کا پتہ چل جاتا اور مزدور کی جان بچ جاتی۔

اس حادثے کے بعد باقی ساری رات مزدوروں نے اونگھتے جاگتے گزاری۔ ذرا سی آہٹ پر سبھی ہڑبڑا کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ مجھے اندازہ تھا کہ شکار کرنے کے بعد کم از کم آج تو شیر اس طرف نہیں آئے گا۔ دوسری طرف مجھے حیرانی بھی تھی کہ اس علاقے میں آدم خور کیسے آ گیا ہے کیونکہ ابھی تک یہاں کسی آدم خور شیر کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

صبح سویرے میں نے شیر کے پاؤں کے نشان ڈھونڈنے کی کوشش کی، لیکن ہر طرف مزدوروں کے ننگے پاؤں کے نشانات ہی نظر آئے۔ زمین پر لاش کے گھسیٹنے کا کوئی واضح نشان نہ تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شیر کافی طاقتور ہے اور لاش کو منہ میں اُٹھا کر لے گیا ہے، لیکن خیمے کے اندر جدوجہد کے کافی ثبوت تھے۔

میں نے اپنے ساتھ دلیر مزدور لیے اور اندازے سے ہی شیر کی تلاش میں نکل پڑا۔ کیونکہ کوئی بھی مزدور اس وقت کام کرنے کو تیار نہ تھا جب تک کہ شیر کو مار نہ دیا جاتا۔ کیمپ سے باہر آ کر تھوڑی دور ہی مجھے خون کے ہلکے ہلکے نشانات نظر آنے لگے۔ آگے چل کر قد آدم جھاڑیاں اور درخت اتنے گھنے ہو گئے کہ خون کے نشان تلاش کرنا پڑے تھے۔ اِرد گرد درختوں سے سینکڑوں پرندوں کی آوازوں سے جنگل گونج رہا تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ یا تو شیر اس علاقے سے نکل چکا ہے یا ابھی کسی جگہ پر سویا ہوا ہے، چلتے چلتے ہمیں کوئی تین چار گھنٹے ہو گئے، جنگل میں دبی دبی سی گرمی بھر گئی تھی، کم جگہوں پر ہی روشنی زمین تک پہنچی تھی۔ جس کی وجہ سے درختوں کے نیچے خوشگوار ٹھنڈک کا احساس ہونے لگتا۔ ہم نے ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر وہاں ستاتے رہے۔ جب ہم آگے بڑھے تو دھوپ ڈھلنے لگی تھی، میرے دونوں ساتھی زیادہ پریشان نہ تھے۔ ایک اونچا لمبا گھنی مونچھوں والا سکھ تھا جس کا نام شائدرام سنگھ یا مان سنگھ تھا۔ دوسرا ایک نوجوان مسلمان بشیر حسین تھا، دونوں دلیر اور محنتی تھے۔ کیونکہ انہوں نے کبھی شیر اور وہ بھی آدم خور کے شکار میں حصہ نہیں لیا تھا، اس لیے انہیں ان خطرات کا احساس نہ تھا جو شیر کے شکار میں شکاری کو گھیرے رکھتے ہیں لیکن میں اپنے اِرد گرد گھنے جنگل سے مسلسل خطرہ محسوس کر رہا تھا کیونکہ ہم جس شیر کو ہلاک کرنے آئے تھے، وہ عام درندہ نہیں بلکہ آدم خور تھا اور آدم خور شیر نہایت چالاک، بے رحم اور نڈر ہو جاتا ہے۔

تھوڑا آگے بڑھنے پر چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں سی آ گئیں۔ یہ مٹی اور پتھروں کی بنی پہاڑیاں تھیں جن میں بل کھودنا آسان تھا۔ اس لیے بہت سے جانور ایسی جگہوں پر رہتے تھے ہم گھوم کر پہاڑی سے آگے بڑھنے لگے۔ ابھی چلتے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک جھاڑیوں کے پیچھے سے خوفناک چیخ مارتا ہوا ایک بڑی جسامت کا ریچھ نکل آیا۔ فاصلہ اتنا کم تھا کہ میں سنبھل بھی نہ سکا۔ ریچھ کا پہلا پنجہ میرے بائیں کندھے کے پچھلی جانب اتنی زور سے لگا کہ میں قلابازی کھا کر پانچ فٹ دور جا گرا۔ چند لمحوں کے لیے تو میرا ذہن بالکل سن ہو کر رہ گیا، لیکن اس وقت ہوش و حواس کھونا گویا ریچھ کو دعوت دینا تھا کہ آؤ اور مجھے شکار کر لو۔ گھبراہٹ میں میں نے رائفل کی تلاش میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارے لیکن اس زبردست جھٹکے سے رائفل اُچھل کر چار پانچ فٹ دور جھاڑی میں جا گری تھی۔ اِدھر ریچھ سخت غیض و غصے سے مجھ سے چند قدم دور دونوں ٹانگوں پر کھڑا تھا، وہ جب بھی

غراتا تو سفید دانتوں کی لمبی قطار نظر آنے لگتی۔ میری اُمید رائفل کے ساتھ مجھ سے چند قدم دور پڑی ہوئی تھی، تب میری نظر مان سنگھ اور بشیر پر پڑی۔ مان سنگھ حملے کے صدمے سے جیسے بت بن گیا تھا اور ایک نامعقول سے انداز میں ساکن کھڑا تھا۔ بشیر حسین کو نا جانے کیا سوجھی، اس نے اونچی آواز میں چیخیں مارنا شروع کر دیں، مجھے غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنی بندوق سے ریچھ کو گولی کیوں نہیں مار رہا۔ اسی لمحے ریچھ نہایت غصے میں مڑا، ابھی اس نے بشیر کی طرف تیسرا یا چوتھا قدم اُٹھایا تھا کہ میں نے لپک کر رائفل اُٹھالی۔ سات آٹھ فٹ کی دوری پر رائفل کی وزنی گولی نے ریچھ کو ساکن کر دیا، وہ ایک لمحے سے بھی کم مدت میں میری طرف مڑا تو اس کا منہ کھل چکا تھا، آنکھوں اور دانتوں کی قطاروں سے خون چمک رہا تھا۔ وہ جیسے نشے میں اِدھر اُدھر جھول رہا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب کسی لمحے بھی ریچھ گر پڑے گا، لیکن پھر ریچھ نے ایسی تیزی سے حملہ کیا کہ میں اس کی طرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا جس وقت ریچھ کے پنجے نے رائفل کی نالی کو چھوا تو میں دوسری گولی چلا چکا تھا۔

ریچھ کے جھٹکے سے میں اور گولی کی قوت سے ریچھ پیچھے گر پڑا۔ لیکن اگلے سیکنڈ میں اس کے بڑے پنجے نے میری دائیں ٹانگ ادھیڑ ڈالی۔ درد کی ایک تیز لہر میرے دماغ تک پھیل گئی۔ آخری چیز جو مجھے یاد تھی وہ یہ کہ بشیر حسین نے اپنی بندوق لاٹھی کی طرح ریچھ کے سر پر دے ماری۔ ایک آدھ منٹ بعد ہی میرے اوسان بحال ہوئے تو اس وقت بشیر اور مان سنگھ مجھے گھسیٹ کر ریچھ سے تھوڑی دور لے آئے تھے۔ میں نے اُٹھ کر دیکھا تو ریچھ مر چکا تھا لیکن میری دائیں ٹانگ پر اس کے لمبے ناخن تقریباً آدھ انچ گہرے اور گیارہ بارہ انچ لمبے زخم لگا کر مجھے لہولہان کر چکے تھے۔ زخموں سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا چنانچہ بشیر اور مان نے کپڑے سے کس کر میری ٹانگ باندھ دی۔

ریچھ وہیں چھوڑ کر دونوں نے مجھے سہارا دیا اور ہم واپس چل پڑے، راستے میں جب میں نے بشیر سے پوچھا کہ اس نے گولی کیوں نہ چلائی تو اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ ریچھ اور میں اتنے قریب تھے کہ کارتوس چلانے پر مجھے یقیناً چھرے لگ جاتے۔ بشیر کو جہاں خوشی تھی کہ میری جان بچ گئی، وہاں اسے افسوس بھی تھا کہ اس کی محنت سے خریدی ہوئی بندوق ریچھ کی کھوپڑی پر مارنے سے دو ٹکڑے ہو چکی تھی۔

جس وقت ہم کیمپ پہنچے تو ہلکا سرمئی اندھیرا پھیل چکا تھا، میں نے جاتے ہی دوائی سے زخم دھوئے اور چند دوسری گولیاں کھا کر سو گیا۔ کیونکہ مجھے ہلکا ہلکا بخار ہو رہا تھا۔ میں ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں زخموں میں زہر نہ پھیل جائے، لیکن اس وقت اگر واپس چلا جاتا تو کیمپ کے سارے مزدور بھاگ جاتے۔ ساری رات مزدور باری باری پہرہ دیتے رہے اور کئی بار شیر کے بولنے کی آوازیں کیمپ کے اِردگرد سے آتی رہیں۔ آدم خور بھوک مٹانے کی فکر میں تھا لیکن اب شاید اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

دوسری صبح میں جاگا تو بخار تیز ہو گیا تھا لیکن میں نے محسوس نہ ہونے دیا۔ مان سنگھ اور بشیر کو ساتھ لے کر میں پھر شیر کی تلاش میں نکل پڑا۔ آج خطرہ کل کی نسبت زیادہ تھا، آدم خور کی بھوک اس سے زیادہ قاتل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہم زیادہ احتیاط سے قدم رکھ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر شیر کہیں قریب ہوا تو پرندوں یا درختوں پر لٹکے بے شمار بندر ضرور چیخیں گے۔ اچانک دائیں ہاتھ کافی فاصلے پر چیتل کی خطرے سے آگاہ کرنے والی پکار سنائی دی، لگتا تھا شیر یا اور کوئی درندہ چیتل کے قریب ہے، ہم اسی طرف بڑھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد چھوٹی سی خشک چٹان آ گئی جس پر کہیں کہیں گھاس کی جھاڑیاں سی تھیں۔ بشیر میرے آگے تھا اور مان سنگھ نے دو قدم پیچھے رہ

کر چٹان پر چڑھنا شروع کیا۔ اچانک بشیر پتھروں پر لیٹ گیا اور خاموشی سے مجھے آگے آنے کو کہا، اس وقت بخار کی وجہ سے مجھے لگ رہا تھا جیسے کانوں اور سر سے دھواں سا اُٹھ رہا ہے۔ بڑی مشکل سے رینگتا ہوا بشیر کے پاس چلا گیا۔ اس نے مجھے پہاڑی سے دوسری طرف دیکھنے کو کہا، میں نے ذرا سی گردن اُٹھائی تو وہ مجھے نظر آ گئے۔ یہ شیرنی اور اس کے تین بچے تھے۔ چاروں تقریباً سو گز دور چھوٹے سے گھاس کے میدان میں کسی گول سی چیز سے کھیل رہے تھے۔ شیرنی اور اس کے بچے فٹ بال کی طرح اس گول چیز کو لڑھکاتے اور پھر اِدھر اُدھر قلابازیاں کھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتے۔

بشیر نے مجھے متوجہ کر کے کہا جناب وہ سر..... میں نے غور سے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے میرا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ شیرنی اور اس کے بچے جس چیز سے کھیل رہے تھے وہ کوئی پتھر نہیں بلکہ انسانی سر تھا، جس وقت میں نے رائفل کاندھے سے لگا کر شیرنی کا نشانہ لیا تو میری حالت عجیب سی ہو رہی تھی، دل چاہتا تھا کہ شیرنی کو نہ ماروں کیونکہ ابھی اس کے بچے چھوٹے ہیں، لیکن دماغ کہتا تھا کہ اگر اسے مارا نہ گیا تو یہ مزید کئی انسانی جانوں کا نقصان کرے گی اور ہو سکتا ہے کہ تینوں بچے بھی انسانی گوشت کھا کھا کر آدم خوری پر اُتر آئیں، تب مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ بچوں کی وجہ سے شیرنی زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کیمپ میں سے مزدور کو شکار کر لائی تھی۔

چند لمحے جب میں نے فائر نہ کیا تو مان سنگھ بولا ''صاحب کیا سوچتے ہو، شیرنی بھاگ جائے گی'' میں نے ٹرائیگر پر انگلی رکھی، جس وقت میں ٹرائیگر دبا رہا تھا، اسی لمحے شیرنی کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ خوف ناک وحشت سے اس نے گردن اُٹھالی لیکن میری انگلی ٹرائیگر دبا چکی تھی۔ شیرنی نے زبردست جھٹکا کھایا اور وہیں لوٹ پوٹ ہو گئی۔ دھماکے کے ڈر سے تینوں بچے بھاگ گئے۔ ہم نے تھوڑی دیر انتظار کیا اور پھر آگے چلے گئے۔ اگرچہ آدم خور شکار ہو چکی تھی لیکن نجانے کیوں دل پر بوجھ سا پڑ گیا تھا۔

اسی روز شام کو مجھے شہر کے بڑے ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا کیونکہ بخار تیز ہوتا جا رہا تھا، تین دن بعد بشیر مسکراتا ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ پھندہ لگا کر شیرنی کے تینوں بچے بھی پکڑ لیے گئے ہیں، جنہیں افسران نے چڑیا گھر کے حوالے کر دیا تھا۔

اگلے ستائیس دن میں ہسپتال کے بستر پر پڑا، شیرنی اور اس کے بچوں اور بدمعاش ریچھ کے بارے میں سکون سے سوچتا رہا۔

خوفناک جنگل

دلیر مجرم کی بے پناہ پذیرائی کے بعد پیش خدمت ہے ابن صفی کی جاسوسی دُنیا سیریز کا دوسرا ناول..... خوفناک جنگل۔ ایک پراسرار اور خوفناک جنگل جہاں عجیب و غریب واقعات ہوتے تھے اور لاشیں برآمد ہو رہی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بھوتوں کی کارگزاری ہے۔ حمید اور فریدی کس طرح اس راز سے پردہ اٹھاتے ہیں، معلوم کرنے کے لیے پڑھیے **خوفناک جنگل**۔

سندر بن کا آدم خور

میں اپنے ایک دوست کی شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے ڈھاکہ گیا ہوا تھا کہ مجھے سندر بن کے آدم خور شیر کی چیرہ دستیوں کی اطلاع موصول ہوئی۔ شادی کی محفل میں میرے دوست نے مجھے ایک صاحب سے متعارف کرایا جو میری طرح درندوں کے شکار کا شوق رکھتے تھے اور مسلسل ایک ماہ تک سندر بن میں اس شیر کا تعاقب کرنے کے بعد بے نیل مرام واپس آ گئے تھے۔ ان کی زبانی اس درندے کی چالاکی، سفاکی اور جسارت کے عجیب و غریب واقعات سننے میں آئے، انہوں نے بتایا کہ درندہ اب تک سولہ انسانوں اور پچاس سے زائد مویشیوں کو ہلاک کر چکا ہے۔ اکثر مویشیوں کی ہلاکت کے واقعات اس کے آدم خور بننے سے پہلے پیش آئے تھے۔ آدم خور بننے کے بعد بھی اس درندے نے چند مویشیوں کو ہلاک کیا مگر وہ صرف اس صورت میں جب کئی روز کی مسلسل تگ و دو کے باوجود اسے کوئی انسان اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے دستیاب نہ ہو سکا، اس کا سب سے پہلا شکار داؤد نامی ایک کاشت کار تھا جو گاؤں کے باہر اپنی زمین میں دھان بو رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا، داؤد، اس کی بیوی اور بیوی کا خالہ زاد بھائی، تینوں مل کر اپنے کھیتوں میں دھان بو رہے تھے۔ داؤد کی چار گائیں کھیتوں کے باہر ٹیلے پر گھاس چر رہی تھیں کہ اچانک داؤد کو ان کے ڈکرانے کی آوازیں آئیں، پیشتر اس کے کہ یہ لوگ صورت حال کو سمجھنے کے قابل ہوتے، چاروں گائیں خوف سے چیختی ڈکراتی ٹیلے سے نیچے اتریں اور بدحواسی کے عالم میں گاؤں کی سمت بھاگنے لگیں، دوسرے لمحے ٹیلے سے متصل قد آدم جھاڑیوں میں سے ایک پورے قد کا جوان شیر لمبی جست لگا کر نمودار ہوا، غراتا ہوا، ان پر لپکا۔ داؤد، اس کی بیوی اور سالے نے شیر کو دیکھ کر شور مچانا شروع کر دیا۔ داؤد نے لپک کر منڈیر سے لاٹھی اُٹھائی اور شور مچاتا ہوا شیر کے پیچھے بھاگا۔

پیشتر اس کے کہ داؤد شیر کے قریب پہنچتا، شیر نے سب سے پچھلی گائے پر حملہ کیا اور دائیں پنجے کی ایک بھرپور ضرب سے اسے زمین پر گرا دیا۔ زخمی گائے نے تڑپ کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر شیر نے اپنے خوف ناک دانت اس کی گردن میں پیوست کر دیئے۔ اس اثناء میں جوانی اور انتقام کے جوش میں بپھرے ہوئے داؤد نے شیر کے قریب پہنچ کر اس کے سر پر لاٹھی رسید کی شیر نے گائے کو چھوڑ دیا اور دھاڑتا ہوا داؤد پر حملہ آور ہوا۔ داؤد کی بیوی اور سالا یہ صورتِ حال دیکھ کر خوف سے چیختے چلاتے گاؤں کی سمت بھاگے، چند لمحوں کے بعد جب گاؤں کے لوگ لاٹھیاں کلہاڑیاں اور ڈنڈے ہاتھوں میں لیے شور مچاتے ہوئے اس مقام پر پہنچے تو وہاں مری ہوئی گائے کی لاش گیلی زمین پر شیر کے پنجوں اور داؤد کی کشمکش کے نشانات کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ شیر داؤد کو ہلاک کرنے کے بعد اسے گھسیٹتا ہوا جنگل میں لے جا چکا تھا۔ اس حادثے کے بعد شیر آدم خور ہو گیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے بہت سے لوگوں کو ہلاک کیا۔ سندر بن کے آس پاس کے گاؤں شیر کی دہشت سے خالی ہونے لگے۔

ان صاحب کو شیر کی خون آشامی کی اطلاعات جب موصول ہوئیں، تب تک شیر بارہ انسانوں کو جن میں دو بچے بھی تھے، اپنی خوراک بنا

چکا تھا۔ ان کے سندر بن پہنچنے سے پہلے کئی شکاری وہاں جا کر قسمت آزمائی کر چکے تھے۔ شیر کو پھانسنے اور ہلاک کرنے کی تمام تدبیریں ناکام ہو چکی تھیں، کیونکہ شیر اتنا مکار اور نڈر تھا کہ ماہر شکاریوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بچ نکلتا۔ ایک مرتبہ تو اس نے دو مسلح شکاریوں کو بھی مچان سے گھسیٹ کر ہلاک کر ڈالا۔ اس حادثے کی خبر سنتے ہی ان صاحب نے سندر بن جانے کا فیصلہ کر لیا اور دوسرے روز اپنے ساتھیوں اور چار ملازموں کے ہمراہ بڑے اہتمام سے سندر بن جا پہنچے۔

مسلسل چار راتوں تک یہ صاحب اور ان کے تین ساتھی بانسوں کی مضبوط مچانوں پر بیٹھے شیر کی آمد کا انتظار کرتے رہے مگر اس دوران میں شیر اس علاقے سے دس میل پرے مچھیروں کی ایک چھوٹی سے بستی پر حملہ آور ہوا اور ایک جوان لڑکی کو گھسیٹ کر جنگل میں لے گیا، وہ اکثر رات کی تاریکی میں گاؤں میں داخل ہوتا اور جھونپڑیوں کی کمزور دیواروں کو توڑ کر اپنے شکار کو دبوچ لیتا۔ بدنصیب انسان کے چیخنے چلانے کے باوجود دوسرے لوگ اس کی مدد کرنے کی ہمت نہ کرتے اور اپنے اپنے جھونپڑوں میں دبک کر بیٹھے رہتے۔ شیر شکار کو گھسیٹتا ہوا جنگل میں لے جاتا اور پھر اس کی لاش بھی دستیاب نہ ہوتی۔ اب تک جتنے آدمی ہلاک ہوئے تھے ان میں سے کسی کی لاش کا پتہ نہیں چلا تھا، کیونکہ درندے کے خوف کے مارے کسی میں جنگل کے اندر داخل ہونے کی ہمت نہیں تھی۔

یہ صاحب اور ان کے ساتھی مچان چھوڑ کر اس گاؤں میں جا پہنچے، گاؤں کے قریبی جنگل میں ایک بڑے درخت پر نئی مچان تیار کرائی گئی۔ ایک جوان فربہ گائے خرید کر اسے جنگل میں باندھ گیا۔ تین راتیں مسلسل یہاں بھی ضائع ہوئیں، چوتھے روز پتہ چلا کہ شیر نے سندر بن کے مشرقی حصے میں ندی کے کنارے ایک مچھیرے کو ہلاک کر دیا ہے۔ مچھیرے کے ساتھ اس کا نوعمر لڑکا بھی تھا جو کشتی میں بیٹھا جال ٹھیک کر رہا تھا۔ باپ کشتی کی رسی کنارے پر لگے ہوئے بانسوں کے جنگلے سے باندھ رہا تھا کہ شیر نے جنگل سے نکل کر دبے پاؤں اس پر جست لگائی اور اس کو دبوچ لیا۔ لڑکے نے جال سے نظریں ہٹا کر باپ کی طرف دیکھا تو شیر اسے پشت پر لادے جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بے چارہ مچھیرا شیر کے چنگل سے رہائی حاصل کرنے کے لیے بے اختیار ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا مگر شیر نے اس کی گردن میں دانت گاڑ رکھے تھے۔ لڑکا روتا پیٹتا ہوا، دیوانوں کی طرح کشتی گھسیٹتا ہوا، گاؤں واپس آیا اور ایک مہینے تک بخار میں پھنکتا رہا۔

قصہ کوتاہ ایک ماہ تک مسلسل وہ صاحب ان کے تین شکاری دوست اور چار ملازم سندر بن کی خاک چھان کر ناکام و نامراد واپس آ گئے اور اس عرصہ میں انہیں شیر کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ ان صاحب کی زبان سے یہ تمام تفصیل سننے کے بعد میں نے سندر بن جانے کا فیصلہ کر لیا اور شادی کے ہنگاموں سے فرصت پاتے ہی سندر بن روانہ ہو گیا۔

سندر بن کا جاہ و جلال دیکھ کر خوف اور حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سندر بن کے بارے میں میں نے سنا تھا کہ یہ ایشیا کا سب سے بڑا اور خوف ناک جنگل ہے، اب وہاں پہنچنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ سندر بن صرف ایشیا کا ہی نہیں بلکہ دنیا کا سب سے بڑا اور خوف ناک جنگل ہے۔ شروع کے تین چار دن میں کشتی کرائے پر لے کر سندر بن کے اندر دور دور تک چکر کاٹتا رہا۔ یہ ایک چھوٹی سی موٹر لانچ تھی جس کے اندر تین ملاح تھے۔ یہ لوگ بھی شیر سے بے حد خوف زدہ تھے، مگر جب میں نے انہیں بتایا کہ میں ہزاروں میل دور سے اس شیر کو ہلاک کرنے کا عزم لے کر یہاں آیا

ہوں تو ان کے حوصلے کچھ بڑھے اور وہ میری رفاقت پر آمادہ ہو گئے۔

چار دن تک میں جنگل کے مختلف گوشوں میں گھومتا رہا، ان گنت جنگلی درندے دریاؤں کے کنارے کنارے مجھے نظر آئے، سندر بن کے بیشتر مقامات ایسے ہیں جہاں دوپہر کے وقت بھی رات کا سا گھپ اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ جگہ جگہ دلدلی قطعے ہیں جو بظاہر خشک معلوم ہوتے ہیں مگر وہاں اگر ہاتھی بھی پاؤں رکھ دے تو چشم زدن میں دلدل کی تہ میں جا پہنچے گا۔ سندر بن میں ایک آدم خور کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے، جگہ جگہ ایسی کمین گاہیں موجود ہیں جہاں بڑے سے بڑا درندہ آسانی سے چھپ سکتا ہے اور شکار کو اپنی موجودگی کا احساس دلائے بغیر اسے دبوچ سکتا ہے۔

پانچویں دن صبح سویرے جب میں نیل کمل ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل رہا تھا تو ملازم کی زبانی مجھے اطلاع موصول ہوئی کہ بائیں سمت چھ سات میل کے فاصلے پر شیر نے ایک شکاری کو ہلاک کر دیا ہے۔ میں فوراً کشتی پر بیٹھ کر اسی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ چند نوجوان شکاری جو میری طرح اس آدم خور درندے کی تلاش میں سندر بن آئے تھے، کشتی سے اُتر کر جنگل میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے درندے نے اچانک ان میں سے ایک کو دبوچ لیا۔ باقی ماندہ نوجوان بدحواسی کے عالم میں اپنے ساتھی کی مدد کرنے کی بجائے کشتی کی طرف بھاگے اور بندوقوں سمیت ندی میں کود کر کشتی میں سوار ہو گئے۔ شیر انہیں بھاگتا دیکھ کر لاش کو جنگل میں لے جانے کی بجائے وہیں بیٹھ کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کشتی میں سوار ہونے کے بعد خوف زدہ نوجوانوں نے بندوقیں سنبھالیں، انہیں لوڈ کیا اور شیر کی طرف اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے حالانکہ اس وقت اگر وہ اپنے اوسان قائم رکھتے اور نشانہ لے کر فائرنگ کرتے تو شیر ضرور ہلاک ہو جاتا مگر ان کی اندھا دھند فائرنگ کا یہ نتیجہ نکلا کہ شیر بندوقوں کے دھماکوں سے خوف زدہ ہو کر وہاں سے اُٹھا اور انتہائی پھرتی سے ایک جست لگا کر جنگل میں غائب ہو گیا۔

جس وقت میری موٹر لانچ وہاں پہنچی تو وہ لوگ بدستور کشتی میں سوار چیخ و پکار کر رہے تھے اور شیر کے بھاگنے پر ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے۔ ان کے دائیں بائیں چھ سات کشتیاں اور بھی موجود تھیں۔ لگ بھگ بیس پچیس آدمی کشتیوں میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے کنارے سے تھوڑے فاصلے پر اس بدنصیب شکاری نوجوان کی خون آلودہ لاش پڑی ہوئی تھی مگر اتنے آدمیوں میں سے کسی ایک میں بھی جرأت نہ تھی کہ وہ کشتی سے اُتر کر جنگل کی طرف بڑھتا اور لاش کو اُٹھا کر لے آتا۔ لاش کو وہاں دیکھ کر معاً میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی، میں نے انہیں سمجھایا کہ اب شور و غل بے کار ہے جو ہونا تھا سو ہو چکا ہے۔ آپ لوگ اگر اس ظالم درندے سے اپنے ساتھی کا اور دوسرے بے گناہ انسانوں کا انتقام لینا چاہتے ہیں تو اس وقت میرے مشورے پر عمل کریں۔

سب لوگ خاموشی سے میرا چہرہ تکنے لگے پھر میں نے موزوں الفاظ میں انہیں اپنی ترکیب سمجھائی۔ ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے رائفل تھام کر تنہا لانچ سے نیچے اُترا، لاش کے قریب گیا، چند قدم آگے بڑھ کر جھاڑیوں کا معائنہ کیا اور پھر ساحل پر ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے کہنے پر میری لانچ کے ملاح ڈرتے کانپتے نیچے اُترے اور لانچ میں رکھی ہوئی دو لمبی سلاخوں سے لاشوں کے قریب ایک گڑھا سا کھودنے لگے۔

جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے اسی طرح میرا اور میرے ساتھی ملاحوں کا حوصلہ دیکھ کر باقی ماندہ لوگوں کی بھی ہمت بڑھی اور دوسری

کشتیوں کے آٹھ دس ملاح بھی اپنے اپنے داؤ لے کر نیچے اُترے اور ان کے ساتھ مل کر گڑھا کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ نوجوان شکاری بھی جو اس حادثے کی وجہ سے بے حد خوف زدہ تھے، اتنے لوگوں کو اپنے ساتھی کی لاش کے پاس کھڑا دیکھ کر کشتی سے اُترے، بھاری بھاری قدموں سے چل کر لاش کے قریب آئے اور اسے دیکھ کر شدتِ غم سے زار و قطار رونے لگے۔

دس بارہ آدمیوں نے نصف گھنٹے کے اندر اندر اتنا بڑا گڑھا تیار کر لیا جس میں میں بخوبی بیٹھ سکتا تھا اور سر اُٹھا کر اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کو دیکھ سکتا تھا پھر میری ہدایت پر انہوں نے گڑھے کی مٹی اِدھر اُدھر پھیلا دی۔ جھاڑیوں اور شاخوں کا ایک ڈھیر جمع کر کے گڑھے کے کنارے رکھ دیا۔ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے اپنی کامیابی کی دعا مانگنے کے بعد گڑھے میں اترا، میرے اشارے پر ان لوگوں نے لمبی لمبی شاخوں سے گڑھے کو ڈھانپ دیا اور پھر ان شاخوں پر گھاس جھاڑیاں اور پتے پھیلا دیئے، اس کے بعد سب لوگ مجھے خدا حافظ کہہ کر کشتیوں میں سوار ہو گئے اور کشتیاں دریا کے پرلے ساحل کی طرف روانہ ہو گئیں۔

جب تک مجھے موٹر لانچ کے انجن اور کشتیوں کے چپوؤں کی آوازیں آتی رہیں، میں اطمینان سے پاؤں پھیلائے رائفل ہاتھوں میں تھامے گڑھے میں بیٹھا رہا۔ لیکن یہ شور تھمتے ہی اچانک مجھ پر اضطراری کیفیت سی طاری ہونے لگی، میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میرے ہاتھ پاؤں بے اختیار لرزنے لگے۔ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر خون میں نہائی ہوئی ایک لاش پڑی تھی، میرے چاروں طرف جنگل بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور میں تنہا تھا، بالکل تنہا۔ میں نے دل ہی دل میں آیت الکرسی اور درودِ تاج کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ اس کیفیت میں تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ اچانک میرے اندر توانائی کی ایک لہر اُٹھی، ہاتھ پاؤں کی لرزش ختم ہو گئی اور میرا دل پیش آنے والے خطرے سے بے خوف ہو گیا۔ میں نے رائفل کے کندے کو سینے سے لگایا اور نال کو لاش کی طرف اُٹھا کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ قریب کی جھاڑیوں میں کسی بھاری بھرکم جانور کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے آہستہ سے سر اُٹھا کر شاخوں کی جھری میں سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔

میرے دائیں طرف لاش کے سر سے دس بارہ قدموں کے فاصلے پر ایک خوف ناک شیر کھڑا اپنی خوف ناک آنکھوں سے دریا کی سمت گھور رہا تھا، پھر اس نے پلٹ کر لاش کی طرف دیکھا۔ سانس کی آمد و رفت کے ساتھ اس کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اس کا منہ خون آلود تھا، اسے دیکھ کر میرے اندر کا درندہ بھی جاگ اُٹھا۔

''آؤ پیارے، ذرا قریب آؤ، ذرا اور قریب آؤ'' میں نے دانت پیستے ہوئے دل ہی دل میں درندے کو مخاطب کیا اور رائفل کی نال اس کی پیشانی کی طرف گھمالی۔ شیر ہر طرف سے مطمئن ہو کر لاش کے قریب پہنچا اور گردن کا خون چاٹنا شروع کر دیا۔

میں نے احتیاط سے نشانہ لے کر ٹریگر کو حرکت دی، ایک دھماکے کی آواز آئی اور رائفل کی گولی شیر کی پیشانی میں اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیوست ہو گئی۔ وہ زور سے دھاڑ کر زمین سے اُچھلا اور ہوا میں قلابازی کھا کر اوندھے منہ زمین پر گر پڑا، میں نے فوراً دوسرا فائر کیا۔ اب کی مرتبہ گولی درندے کا سینہ پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے جسم سے خون کا ایک فوارہ پھوٹا، جوش کے عالم میں میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بائیں ہاتھ سے میں نے شاخوں کو اُچھال کر دور پھینک دیا اور اچھل کر گڑھے سے باہر نکل آیا۔ اس وقت درندے پر جان کنی کیفیت طاری تھی، اس کا تمام جسم لرز رہا تھا،

میرے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک جھٹکا لیا اور اس کی سرخ آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ میں چند لمحوں تک خاموشی سے کھڑا ہوا اس کی سمت دیکھتا رہا پھر میں نے آگے بڑھ کر اس کے خون آلود سر کو اپنے فل بوٹ سے ٹھوکر ماری اور آسمان کی طرف رائفل کی نال اُٹھا کر پے در پے تین فائر کیے۔

چند ہی لمحوں کے بعد دریا کے پرلے کنارے سے پُرمسرت نعروں کا ایک شور سنائی دیا اور خوشی سے رقص کرتے ہوئے مانجھیوں کی کشتیاں تیزی سے میری طرف بڑھنے لگیں۔

.....❁.....

محی الدین نواب کے قلم سے شہرہ آفاق کتب

نوسرباز
قیمت 90 روپے

علاج
قیمت 90 روپے

کاغذی پیرہن
قیمت -/150

ایم۔اے راحت کے قلم نئے اُفق میں سے دھوم مچا دینے والی مشہور سلسلہ وار داستان

درندگی و بربریت کے پیکر
ایک پتھر صفت انسان
کی سرگزشت

ازدھا
مکمل پانچ حصّے
قیمت فی حصہ 60 روپے

طاہر جاوید مغل کے قلم سے شہرہ آفاق سلسلہ وار سرگزشت

تاوان 12

تاوان کے ایک تا بارہ حصّے دستیاب ہیں

قیمت فی حصہ 60 روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
Ph: 7247414

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

پاگل شیرنی

پہاڑ کے نیچے میں کرنل ولسن کے شکاری کیمپ میں پہنچا ہی تھا کہ سورج غروب ہوگیا۔ کرنل کی حالت زار دیکھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ میلے کپڑے، بڑھی ہوئی سنہرے رنگ کی داڑھی اور بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں غم کی جھلکیاں۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں رسالدار ہوں۔ ڈیرہ دون سے آپ کی خدمت میں مجھے کرنل ہیرن نے بھیجا ہے۔ وہ بولے میں نے ہی کرنل ہیرن کو لکھا تھا کہ آپ کو بھیج دیں۔ میں آپ کو جانتا ہوں، نیپال کی ایک شکاری مہم میں آپ کرنل وارن، راجہ جنگ بہادر اور کیپٹن اسٹر شریک تھے۔ کیپٹن اسٹر کا ہاتھ شیر نے منہ میں لے کر چبا ڈالا تھا، جو بعد میں کاٹ دیا گیا، آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ میں بدقسمت کیپٹن اسٹر کا چھوٹا بھائی ہوں، ہمیں ہندوستان میں شکاری زندگی راس نہیں آئی۔ یہ تصویر دیکھیے۔

میں نے تصویر دیکھی ایک نوجوان انتہائی خوب صورت یورپین لڑکی کا فوٹو تھا۔ کرنل ولسن نے گلوگیر آواز میں اپنے اور میریا کے رومان اور شادی کی جوالمناک داستان سنائی۔ وہ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کرنل ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ میں ایک تجربہ کار شکاری ہوں لیکن ان پہاڑوں میں ایک مہینہ ٹکریں مارنے کے باوجود میریا کی پُراسرار موت کا معمہ حل نہ کرسکا۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے وہ کیا بلا ہے جس نے میریا کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا ہے؟

رات گزر گئی۔ دوسرے دن میں اور کرنل ولسن ایک جنگلی راستے پر چل پڑے۔ یہ سانپ کی طرح بل کھاتا تنگ راستہ تھا جس کے دونوں طرف جھاڑیوں، لمبی گھاس اور درختوں کی بھرمار تھی جب گھنے جنگل میں داخل ہوئے تو ہمارے سر پر آسمان سے باتیں کرتی ہوئی سرسبز پہاڑی چوٹی تھی۔ اس مقام کے قریب ہی شمال کی جانب چناروں کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ ہم اس جھنڈ میں داخل ہوئے تو بمشکل چند قدم دور دیکھ سکتے تھے۔ کرنل نے کہا۔ ''یہ جگہ میریا کو بہت پسند تھی۔ وہ آبشار ہے یہ آپ کے سر پر اوپر درخت پر جو مچان بندھا ہوا ہے میں اور میریا کئی راتیں اس مچان پر بیٹھے رہے۔ کوئی درندہ نہ آیا''۔

ذرا آگے بڑھے، سامنے ایک بھیانک نشیب تھا جس کے اِردگرد سال کے درخت کھڑے تھے، ہم نشیب میں اُتر گئے وہاں سبز گھاس کا فرش اور چھوٹے چھوٹے درخت تھے جن کی ٹہنیاں اور شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ خودرو بیلوں نے جال تنا ہوا تھا۔ وہیں ایک چشمہ بھی تھا۔ کرنل نے کہا۔ ''ہمارا مقصد شکار کھیلنا نہیں تھا بلکہ ہم نے ہنی مون منانے کے لیے ان دشوار گزار وادیوں کو منتخب کیا تھا اور ہمارا ارادہ جس جگہ دریائی جمنا نکلتا ہے یعنی جمونتری پہنچنے کا تھا۔ وہ یہاں سے سو میل دور ایک پہاڑی مقام پر واقع ہے۔ وہیں دریائے جمنا کا منبع ہے، وہ سامنے دریا اسی جگہ سے ادھر آرہا ہے لیکن میریا حسن فطرت کا یہ دل کش منظر دیکھ کر یہیں کی ہو رہی۔ ایک دوپہر کو میں مرغ کا شکار کر کے لایا تو میریا نہیں تھی۔ مجھے گھڑ والی

ملازموں سے پتہ چلا کہ وہ چشمے پر گئی ہے۔ میں یہاں آیا اس چشمے کے کنارے میریاں کا بایاں ہاتھ کٹا پڑا تھا۔ کلائی سے گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ قریب ہی خون کے ایک بڑے دھبے پر اس کی بندوق اور کتاب پڑی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر مجھ پر بجلی سی گری۔ رات کو کچھ حواس درست ہوئے تو خیمے کے اندر میرے ملازم رنج وغم کی تصویر بنے چھٹی چھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ بعد میں، میں نے میریا کی پُراسرار موت کے معمہ کو حل کرنے کے لیے جو جدوجہد کی وہ بیان نہیں کرسکتا، بالآخر ناکام ہوکر میں حوصلہ ہار بیٹھا"۔

کرنل کے آنسو نکل آئے۔ میں نے حقائق پر غور کیا، بازو کو جسم سے کاٹ کر پھینک دیا۔ لاش لے جانا بڑا عجیب سا واقعہ تھا۔ کرنل کے بیان کے مطابق بازو پر شیر کے دانت کا نشان نہیں تھا۔ تاہم میں آٹھ راتیں کسی انجانی بلا کے انتظار میں چشمے کے اوپر درخت پر بیٹھا رہا۔ کوئی قابلِ ذکر واقعہ رونما نہ ہوا۔ میں نے کرنل سے کہا کہ مجھے اس مہم کو سر کرنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیجیے، میں کیمپ سے غیر حاضر رہوں گا اور مقصد حل ہوتے ہی کوئی کارروائی کرنے سے پیشتر آپ کو خبر دوں گا۔ صبح کا وقت تھا، میں چشمے پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا، یک لخت مجھ پر جنون سا طاری ہوا اور میں نے سامنے کھڑی فلک بوس پہاڑی کی چوٹی پر چڑھنے کا فیصلہ کرلیا۔ کھانے سے فارغ ہوکر پانی پیا اور پھر بندوق اور بھنے ہوئے چنوں کا تھیلا گلے میں ڈالا اور کمر پر گرم کمبل باندھ کر پہاڑی پر چڑھنا شروع کردیا۔ آگے ایک خطرناک عمودی چٹان آگئی۔ میں اب اوپر کی طرف رینگ رہا تھا۔ ایک نظر نیچے کی طرف دیکھا تو اتنی گہری کھائیاں تھی کہ میرا رواں رواں لرز اُٹھا، میں آنکھیں بند کرکے چھپکلی کی طرح اس چٹان پر چڑھ گیا۔

آگے ہموار پہاڑی سلسلہ تھا۔ پہاڑ کی چوٹی بہت بلند تھی۔ تھوڑی دور چل کر اس قدر گھنا پہاڑی جنگل آیا کہ سورج بھی نظر نہ آتا تھا۔ تاریک جنگل ختم ہوا تو ایک انتہائی دل کش اور جاذب نظر مقام آگیا۔ اس مقام کے تین طرف سفید چمکدار پہاڑی فصیل تھی اور مغرب کی جانب درختوں کی دیوار کھڑی تھی۔ قریب ہی شفاف پانی کا ایک دل فریب تالاب تھا جس کے چاروں طرف سبزے کا فرش اور خودرو پھلواریاں اُگی ہوئی تھیں۔ سورج غروب ہوا تو میں نے وضو کرکے مغرب کی نماز ادا کی، پھر بھنے ہوئے چنے کھا کر رات بسر کرنے کی غرض سے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بندروں کی خرخر کی آواز آئی، میں نے تالاب کی طرف دیکھا، شام کے دھندلکے میں بڑا ہولناک منظر تھا۔ ایک قوی ہیکل بندر نے کافی لمبے سیاہ ناگ کا پھن ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور وہ سانپ بندر کے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ بندر ناگ کے منہ پر تھوک تھوک کر اسے پتھر پر رگڑ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سانپ کی گرفت ڈھیلی ہوگئی اور وہ مرگیا۔ بندر کا جسم آزاد ہوگیا۔ اتنے میں رات کی تاریکی پھیل گئی۔ میں درخت کے موٹے تنے پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد چاند نکل آیا، میرے قریب کے درخت پر بیٹھے ہوئے بندر خرخر کرنے لگے۔ یکایک اس درخت سے ایک بندر لڑھکنیاں کھاتا ہوا زمین پر گرا، میں نے غور سے دیکھا تو وہی ناگ کا قاتل تنومند بندر تھا۔ ایک کالے رنگ کی ناگن اس کی گردن سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر تالاب کی طرف بھاگا اور گھاس پر گر کر مرگیا۔ وہ ناگن رینگتی ہوئی سامنے ایک غار کی طرف روپوش ہوگئی۔

سنا کرتے تھے کہ ناگن اپنے ناگ کا انتقام لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھتی لیکن اس روایت پر کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ میں اس بندر کا انجام دیکھ کر حیران وششدر رہ گیا۔ میں نے پھر تالاب کی طرف دیکھا تو ڈر کے مارے میرا دل بیٹھ گیا۔ تالاب کے اندر انسانی کھوپڑیاں تیر رہی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے میرا سانس رُک گیا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بہت سے پُراسرار انسان سطح آب پر سر نکالے پانی کے اندر تیر رہے ہوں۔ میں مشہور انگریز

شکاریوں کے ہمراہ انتہائی بھیانک اور تاریک جنگلوں میں شکار کھیل چکا تھا لیکن ایسا ہیبت ناک منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کھوپڑیوں میں زرد چیتے کی سی آنکھیں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ مجھ پر موت کا سکوت طاری تھا اور میں اپنی غلطی پر سخت پشیمان تھا۔ رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اس دشوار گزار پہاڑی پر چڑھنے سے میریا کے قاتل کا کیا تعلق؟ میں نے جائے واردات کو چھوڑ کر اس پہاڑ پر چڑھ کر سخت غلطی کی تھی۔

دوسرے لمحے ہمت کر کے میں نے پھر تالاب کی جانب دیکھا تو اپنی بزدلی پر سخت نادم ہوا کیونکہ ایک ادو بلاؤ کو نہ دیکھتا تو فوراً واپس جا کر کرنل ولسن کو بتاتا کہ یہ پہاڑ بدروحوں کا مسکن ہے اور میریا کی موت میں ان ہی کا ہاتھ ہے۔ ادو بلاؤ گوشت خور جانور ہے، یہ خشکی پر بھی چل پھر سکتا ہے لیکن اس کے جسم کی بناوٹ پانی کی زندگی کے لیے زیادہ موزوں ہے، یہ جتھے بنا کر مچھلیاں شکار کرتے ہیں اور دریاؤں اور جھیلوں کے کنارے بل بنا کر رہتے ہیں۔ رات درخت پر ہی گزار دی۔ صبح ہوئی تو پرندے چہچہانے لگے۔ میں درخت سے اُترا تو ایک سور نے میرا استقبال کیا، میں نے فائر کیا اس کی کھوپڑی اُڑ گئی، میں چوٹی کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دور چل کر ایک آبشار آیا میں وہاں چنے کھا کر لیٹ گیا۔ دوپہر ڈھلے اُٹھ کر آگے چل دیا۔ میرے سامنے خوب صورت پہاڑی نظاروں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ اچانک اس جنگل میں بین بجنے کی سریلی آواز سنائی دی۔ میں نے اِدھر اُدھر بین بجانے والے کو تلاش کیا مگر پتہ نہ چلا، پھر وہ دل کش آواز بند ہو گئی۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا، سامنے سے بہت لمبا سفید رنگ کا ایک انتہائی حسین سانپ رینگتا ہوا آیا، میں نے رائفل شانے سے لگائی اور گھوڑا دبا دیا۔ اس سانپ کے دو ٹکڑے ہو گئے، دفعتہً عقب سے آواز آئی۔ ''جناب یہ سانپ کیوں مار ڈالا'' میں نے پیچھے دیکھا ایک معمر شخص ہاتھ میں توڑے دار بندوق لیے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ میں نے پوچھا۔ یہ سانپ آپ کا تھا؟

''جناب میں اسے پکڑنا چاہتا تھا۔ یہ بہت نایاب ناگ تھا، میں اس کے منہ مانگے دام وصول کرتا، آپ شکار کی غرض سے یہاں آئے ہیں، آپ کو کیا بتاؤں کہ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں۔ مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوئی ہے''۔

''پہیلیوں میں بات مت کیجئے۔ میں نے کہا۔ مجھے بتایئے کیا معاملہ ہے''۔

''کبھی میں بھی شکاری تھا۔'' اس نے کہا۔ ''پیشہ ور شکاری معاوضہ دینے میں بہت کنجوس ہوتے ہیں، اس لیے شکاری زندگی کو خیر باد کہہ کر میں نے سانپ پکڑنے شروع کر دیئے۔ ناگ، ڈیرہ دون اور مسوری میں یورپین سیّیروں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہوں۔ میرا نام نظام الدین ہے، میں ضلع آگرہ کا رہنے والا ہوں۔''

میں نے اسے بتایا کہ میں فوج میں رسالدار ہوں۔

اس نے کہا'' آپ میرے ساتھ چلیں، وہیں باتیں ہوں گی''۔

میں نظام الدین کے ہمراہ پہاڑی چوٹی کے عین نیچے ایک کھلے پہاڑ پر پہنچا۔ اس جگہ سے سینکڑوں میل دور تک پہاڑی مناظر صاف نظر آ رہے تھے۔ فطرت کی جلوہ آرائیاں انتہائی جاذب نظر تھیں۔ وہیں نظام الدین کا پٹارہ رکھا تھا۔ اس پٹارے میں سیاہ رنگ کے چار زہریلے ناگ تھے۔ میں نے نظام الدین سے پوچھا کہ کیا بین کی آواز سانپ کو واقعی مدہوش کر دیتی ہے؟ وہ مسکرا کر کہنے لگا کہ سانپ کے کان نہیں ہوتے۔ بین تو محض دل بہلانے کا مشغلہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو سانپ پکڑنے کی کبھی ضرورت نہ ہو گی۔ اس لیے اس فن کو راز ہی رہنے دیجئے۔

وہ مجھے وہاں بٹھا کر چلا گیا اور مرغ شکار کر کے لے آیا۔ آگ کے الاؤ پر انہیں بھونا۔ ہم دونوں پیٹ بھر کر مرغ کھا چکے تو مغرب کی نماز ادا کی۔ کچھ سردی کی سی لہر آئی۔ میرے دانت بجنے لگے، کمبل اوڑھا اور الاؤ میں مزید لکڑیاں ڈال کر آگ جلائی تو طبیعت بحال ہوئی۔ میں پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھنے لگا۔ بڑا دل کش منظر تھا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں نے چوٹی پر جمی ہوئی سفید برف کو گلنار بنا رکھا تھا۔ اس رنگین برف کے اندر کہیں کہیں پہاڑی درختوں کے سبز پتے چمک رہے تھے۔

اچانک خوف ناک کڑک کے ساتھ شعلہ سا لپکا اور برف کے اندر کھڑے ہوئے ایک درخت میں آگ بھڑک اُٹھی۔ آگ کے خوف ناک شعلے آسمان کی طرف لپکنے لگے۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر دیکھا۔ پہاڑی کی چوٹی کے چاروں طرف سیاہ رنگ کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بجلی پھر چمکی اور میں سمجھ گیا کہ درخت پر بجلی گری ہے۔ نظام الدین نے بتایا کہ ان پہاڑوں پر بجلی گرنے کا یہ معمول ہے۔

میں نے اسے میریا کی پُراسرار موت کا واقعہ سنایا تو نظام الدین چونک پڑا اور کہنے لگا۔ ''اچھا وہ بلا ابھی تک نیچے پہاڑ پر موجود ہے۔ جناب یہ معجزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ملاقات مجھ سے کرادی'' وہ کچھ سوچ کر بولا کہ آپ میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔ بڑا حیرت انگیز معاملہ ہے۔ ہاں البتہ اس مہم میں آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔

دوسرے دن ہم دونوں اس خطرناک پہاڑی سے اُتر کر کرنل ولسن کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ کرنل بہت فکر مند تھا میں نے نظام الدین سے تعارف کے بعد کرنل کو اس کے ناگ دکھائے اور بتایا کہ میں نے انہیں اپنی مہم میں شامل کر لیا ہے۔ دوسرے دن نظام الدین، میں اور کرنل ولسن چشمے پر پہنچے پھر وہ ہمیں ساتھ لیے ہوئے ایک گہرے کھڈ میں اتر گیا۔ اس کھڈ کے اندر ایک تاریک غار تھا۔ ہم بندوقیں سیدھی کر کے ٹارچوں کی روشنی میں غار میں گھس گئے۔ آگے ایک موڑ آیا پھر غار کے اندر ہولناک منظر دیکھا۔ وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ غار کی دیوار خشک لہو سے لتھڑی ہوئی تھی اور اس خون سے رنگین دیوار کے نیچے تین انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے پڑے تھے۔ ایک ڈھانچے کا بایاں ہاتھ غائب تھا۔ کرنل آبدیدہ ہو کر بولا۔ یہ میریا کا ڈھانچہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ سوکھی ہوئی کھوپڑی میں کہیں کہیں لمبے سنہرے بال موجود تھے۔ ان ڈھانچوں کے قریب ہی چیتل اور ہرنوں کے سوکھے ہوئے سر اور ان کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ تعفن سے ہمارے دماغ پھٹے جا رہے تھے۔ کرنل نے بائیں جانب ٹارچ کی روشنی پھینکی، اِدھر میریا کے جوتے پڑے دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ نظام الدین بولا۔ ''کرنل صاحب صبر کیجئے، میں بھی زخم زدہ ہوں، یہ ڈھانچہ میرے جگری دوست ظفر کا ہے۔ ظفر بھی میریا کی قاتل بلا کی بھینٹ چڑھا تھا۔ اب ہم انتقام لیں گے۔ اس نے پتھر پر ایک سفید نشان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہ خشک پیپ کا نشان ہے۔ یہ ثبوت ہے کہ وہ ان پہاڑیوں میں موجود ہے۔''

نظام الدین ہمیں اس مقام پر لے گیا جس جگہ دو کھڑے پہاڑوں کے درمیان دریائے جمنا، اس زور و شور سے بہہ رہا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ دریا کے ساتھ ساتھ کچھ دور چل کر نظام الدین رُک گیا اور بولا یہ دیکھئے یہ وہی غار والا پیپ کا نشان ہے۔ آیئے وہ اس جنگل میں داخل ہو چکی ہے۔ ہم دائیں طرف دریا سے تھوڑے فاصلے پر پہاڑ کے نیچے کم درختوں اور سرکنڈوں جیسے پودوں کے جنگل میں پہنچ گئے۔ چار دن اور چار راتیں اس جنگل کو چھاننے کے باوجود نتیجہ صفر نکلا۔

پانچویں روز ہی پیپ کا پُراسرار دھبہ پتھریلی زمین پر پھر نظر آیا جو تازہ تھا، اس میں خون ملا ہوا تھا۔ نظام الدین خوشی سے چلایا۔ ہماری مہم آخری

منزل پر ہے، دیکھنا شیر جنگل کا ہم رنگ ہوتا ہے۔ شیر درختوں کے سائے میں بیٹھا ہو، سورج چمک رہا ہو، کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر زمین پر گرتی ہوں تو زمین پر دھوپ اور سائے اس طرح ملے ہوتے ہیں جس طرح شیر کے جسم پر سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں۔ اس لیے شیر کا رنگ اس کے لیے فائدہ مند اور شکاریوں کے لیے ضرر رساں ہوتا ہے۔ میں آپ لوگوں کو ہوشیار کر رہا ہوں کہ یہ جنگل شیر کے لیے مفید اور انسان کے لیے خطرناک ہے"۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور اچانک ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہنے لگا۔ "وہ دیکھئے شیر ہے۔" واقعی ایک درخت کے نیچے شیر لیٹا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر نہایت آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھا۔ ہمارے قریب کوئی درخت نہیں تھا جس سے ہم مچان کا کام لیتے۔ جنگل کے شہنشاہ کے چلنے کا شاہانہ وقار دیکھ کر ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اس نے انگڑائی لے کر منہ کھولا۔ لمبے اور نوکیلے دانت دیکھ کر ہم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ جن لوگوں کا شیر سے پالا پڑا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ بغیر مچان کے آمنے سامنے مقابلہ کر کے شیر کو مار دینا انسان کی بہادری کم اور معجزہ زیادہ ہوتا ہے۔ شیر گولی کھا کر بھی ہمت نہیں ہارتا بلکہ گولی چلانے والے پر پورے غیظ و غضب سے حملہ کرتا ہے۔ میرے متعلق مشہور تھا کہ میں بغیر مچان کے شیر کو ہلاک کر دیتا ہوں لیکن میں ہی جانتا تھا کہ وہ جرأت کا کام نہیں بلکہ جنگل کے بادشاہ کے ساتھ دھوکہ ہوتا تھا۔ دو بدو مقابلے کے لیے شکاری کی پشت پر تناور درخت کا ہونا ضروری ہوتا ہے، لیکن میں کرنل، ولسن اور نظام الدین بہت بُرے پھنسے تھے۔ ہمارے قریب کوئی درخت اور کسی قسم کی کوئی اوٹ نہیں تھی۔

شیر متکبرانہ ادا سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ نہ غراہٹ تھی، نہ دھاڑ۔ وہ ہم سے بیس گز سے زیادہ دور نہ تھا۔ نظام الدین کے پاس توڑے دار بندوق تھی۔ میں نے اور کرنل ولسن نے شیر کے منہ کا نشانہ لے کر اپنی اپنی رائفل سے ایک ساتھ دو فائر کیے، دھماکے کے ساتھ ہی میں اور شیر گتھم گتھا تھے۔ یہ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے قطعاً علم نہ ہو سکا کہ یہ کیسے ہوا، پھر اچانک ہی میں اس کی گرفت سے نکل کر نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ مجھے اتنی مہلت مل گئی کہ میں نے کھڑے ہو کر شیر کی طرف دیکھا، وہ جنگل کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کپڑے دیکھے، خون میں تر تھے۔ کرنل ولسن اور نظام الدین آ گئے۔ مجھے لہو میں نہایا دیکھ کر وہ گھبرا گئے، انہوں نے میرے جسم کی بوٹی بوٹی کا معائنہ کیا، نظام الدین خوش ہو کر بولا۔ "یہ بہت بڑا معجزہ ہے،" کرنل ولسن بولا"۔ نظام الدین، یہ آپ کا کارنامہ ہے کہ ان کی زندگی بچ گئی۔ آپ نے ان سے کشتی لڑتے ہوئے شیر کی گردن میں خنجر گھونپ کر بڑی جرأت کا کام کیا ہے۔ شیر اس قدر شدید زخمی ہے کہ اس کا زندہ بھاگ جانا حیرت ناک ہے۔ وہ دریا کی سمت گیا ہے، دو گولیاں اس کے جسم میں گھس گئی ہیں اور نظام الدین کا خنجر اس کی گردن میں پیوست ہے۔"

میرا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تاہم میں نے ہمت کر کے کہا کہ ہمیں فوری طور پر زخمی شیر کا تعاقب کرنا چاہیے۔ ہم اس کے خون کے نشان دیکھتے چل پڑے، میرے حواس مکمل طور پر درست نہیں ہوئے تھے۔ قسمت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ میں اپنے ساتھیوں سے جدا ہو گیا کیونکہ جنگل گھنا اور میں زخمی تھا۔ آگے پگڈنڈی پر مجھے خون کا بڑا نشان ملا اور میرے سامنے تازہ لہو ٹپکتا جا رہا تھا۔ خون کا یہ نشان مجھے چشمے کی جانب لے گیا۔ میں چشمے کے قریب پہنچا تو سورج ڈوب گیا اور تاریکی پھیلنے لگی۔ قریب کی جھاڑیوں میں کسی انسان کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے ٹارچ روشن کر کے اِدھر دیکھا، کرنل ولسن کا ایک گھڑ والی ملازم کرم سنگھ خون میں لت پت پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے اسے اُٹھایا، کراہنے کی آواز کے ساتھ یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلے کہ "ریجا کو ناگ نے ڈس لیا ہے، میں آپ لوگوں کی تلاش....." الفاظ اس کے منہ میں اٹک کر رہ گئے اور اس کا سر ڈھلک گیا۔ وہ میرے ہاتھوں میں دم توڑ گیا۔

اتنے میں کرنل صاحب اور نظام الدین آ گئے وہ کرم سنگھ کی لاش دیکھ کر حیران رہ گئے۔ شیر نے اس کے پیٹ اور سینے کو چیر پھاڑ دیا تھا۔ انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ہم لاش اُٹھا کر کیمپ میں پہنچے۔ ریجا بُری طرح تڑپ رہا تھا اور اس کے منہ سے خون جاری تھا۔ چھ گھڑ والی ملازم پریشانی کے عالم میں اس کے پاس بیٹھے تھے۔ کرم سنگھ کی لاش دیکھ کر وہ زار و قطار رونے لگے۔ بڑا روح فرسا منظر تھا، ایک گھڑ والی بولا۔ ''ریجا کو نظام الدین کے ناگ نے ڈس لیا ہے۔ یہ پٹارہ کھول کر سانپ دیکھ رہا تھا، کرم سنگھ آپ لوگوں کی تلاش میں گیا اور شیر کی جھپٹ میں آ گیا۔ نظام الدین کہنے لگا، زخمی شیر نے مرتے مرتے کرم سنگھ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ شیر کو ہم تلاش کر لیں گے، وہ زندہ نہیں بچ سکتا''۔

نظام الدین نے ریجا کے ہاتھ کے زخم کو منہ سے چوسا۔ پھر اس پر دوائی لگائی اور ایک سفوف پانی میں گھول کر اسے پلایا اور اس نے کہا۔ ''انشاءاللہ ریجا بچ جائے گا۔ اب ہمیں رات کی پروا نہ کرتے ہوئے زخمی شیر کو تلاش کرنا چاہیے''۔

جس جگہ میریا کی لاش کا پنجر دیکھا تھا۔ ہم اس غار کے منہ پر پہنچے۔ اندر سے زخمی شیر کے زور زور سے سانس لینے کی آواز آئی۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، شیر غار کے دہانے سے تھوڑی دور اندر پڑا سسک رہا تھا۔ نظام الدین نے خوشی سے اُچھل کر کہا کہ میریا کی قاتل یہی شیرنی ہے۔ شیرنی مر رہی تھی۔ کرنل ولسن نے اپنی رائفل کی گولی اس کی چھاتی پر داغ دی، اس کے بدن کا خون پہلے نکل چکا تھا۔ گولی کھاتے ہی مر گئی، میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن سے نظام الدین کا خنجر نکالا پھر نظام الدین نے ہمیں اس کا منہ چیر کر دکھایا۔ میری اور کرنل ولسن کی دو گولیاں اس کے کھلے ہوئے منہ میں داخل ہو کر پچھلا حصہ توڑ کر نکل گئی تھیں۔ دماغ صحیح سالم تھا پھر اس نے شیرنی کی زبان دکھائی۔ ایک گھڑی کا پرزہ اور شیشے کا ٹکڑا اس کی زبان میں پیوست تھا جو ناسور بن گیا تھا۔ اس ناسور سے لہو اور پیپ رستی رہتی تھی۔ نظام الدین نے ایک فتح مند جنرل کی طرح خوش ہو کر کہا، یہ دہاڑ نہیں سکتی تھی''۔

گھڑ والیوں کو بلا کر ہم شیرنی کی لاش کیمپ میں لے گئے۔ صبح کے وقت گھڑ والیوں نے کرم سنگھ کی لاش چتا میں جلا دی۔ ریجا کی حالت سنبھل گئی تھی۔ نظام الدین نے اسے مزید دوا پلائی پھر وہ ہمیں ساتھ لے کر اسی غار کے قریب پہنچا۔ وہاں ایک درخت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''دو سال پہلے اس پیڑ کے نیچے ہمارا کیمپ تھا ایک شام میں اور میرا شکاری دوست ظفر، ہرن کا گوشت کاٹ رہے تھے۔ اچانک اس غار سے ایک شیر کا بچہ نمودار ہوا، ظفر نے تھوڑا سا ہرن کا گوشت بچے کی طرف پھینک دیا۔ وہ گوشت چاٹنے لگا۔ اسی لمحے ایک بیمار شیرنی غار سے نکلی۔ ہم گوشت اُٹھا کر درخت پر چڑھ گئے۔ وہ بچہ گوشت چھوڑ کر اپنی ماں کے تھنوں کو چوسنے لگا۔ شیرنی بیمار اور بھوکی تھی، دودھ خشک تھا، ظفر نے گوشت کے کئی ٹکڑے شیرنی کی جانب پھینک دیئے۔ وہ گوشت کھا کر اپنے بچے کو ساتھ لے کر واپس غار میں چلی گئی۔

''یہ معمول بن گیا۔ ہمارے شکار کا بڑا حصہ وہ شیرنی کھانے لگی۔ اس میں جان آ گئی، بچہ جو بھوک سے نڈھال تھا، چوکڑیاں بھرنے لگا۔ ایک دن خرگوش کا گوشت بنا کر اسے پتھر پر رکھ کر میں وضو کرنے لگا۔ وضو کرتے وقت میں نے گھڑی کھول کر گوشت پر رکھ دی، اسی لمحے شیرنی آ گئی میں ڈر کر درخت پر چڑھ گیا۔ گوشت کھاتے وقت میری گھڑی شیرنی کے منہ میں چلی گئی۔ وہ یک لخت گھبرا کر اُچھلی۔ پھر اس نے اپنا منہ زمین کی طرف کھول دیا۔ اس کی زبان سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ اس نے غصے میں میری جانب دیکھا اور پھر وہ بھاگ کر غار میں گھس گئی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

☆☆☆

تیسرے دن ظفر کو ملیریا بخار ہو گیا تھا۔ اس کے لیے مرغ شکار کرنے چلا گیا۔ شکار لے کر واپس آیا تو ظفر غائب تھا اور درخت کے نیچے خون کے اوپر اس کی گھڑی پڑی تھی، میں سمجھ گیا کہ شیرنی میری گھڑی کھا کر نفسیاتی مرض کا شکار ہو چکی ہے۔ ظفر بخار کی شدت کی وجہ سے درخت پر نہ چڑھ سکا۔ شیرنی کی تیز نگاہوں نے اس کی بازو پر گھڑ بندھی ہوئی دیکھی تو آپے سے باہر ہو گئی اور انتقامی جذبے کے تحت اسے چیر پھاڑ کر لاش کہیں لے گئی اور نہایت ہوشیاری سے اس کی گھڑی نکال کر یہیں ڈال گئی۔ یہ سب کچھ میری غلطی کا نتیجہ ہے اگر میں ظفر کو درخت پر چڑھا دیتا تو یہ حادثہ نہ ہوتا۔ اپنے جگری دوست ظفر کا قاتل میں ہوں۔ مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں اپنی جان کو داؤ پر لگائے ٹارچ لے کر غار میں گھس گیا۔ اس وقت غار کے اندر شیرنی نہیں تھی۔ وہیں ظفر کی لاش پڑی تھی۔ اس کا بایاں بازو اور چہرہ قیمہ ہو چکا تھا۔ میں غار سے نکل کر باہر بیٹھ گیا۔

''شیرنی کئی روز نظر نہ آئی۔ ایک شام شیرنی بچے کو ساتھ لے ہوئے غار کی طرف آئی، میں نے درخت پر چڑھ کر اس پر گولی چلا دی لیکن گولی سے بچہ ڈھیر ہو گیا۔ بپھری ہوئی شیرنی نے غصے میں میری جانب جست لگائی اور درخت کے تنے سے ٹکرائی اور ڈر کر بھاگ گئی۔ اس واقعے کے دس منٹ بعد ایک گورا آیا، اس نے دکھ بھرے لب و لہجے میں مجھے بتایا کہ ہم چشمے کے قریب خیمے میں تھے۔ میرا چھوٹا بھائی باہر لیٹا ہوا تھا۔ یکا یک اس کے حلق سے چیخ بلند ہوئی، میں خیمے کے اندر سے نکلا، میرا بھائی غائب تھا۔ البتہ اس کا بایاں ہاتھ جس پر گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ خیمے کے پیچھے پڑا تھا۔ یہ سب کچھ بجلی کی سی سرعت سے ہوا، میں اس طرف آیا تو بندوق کا دھماکہ سنائی دیا۔ میں اس گورے کو ساتھ لے کر جدھر سے شیرنی آئی تھی، ادھر گیا تو ایک نالے میں اس کے بھائی کی لاش پڑی تھی۔ بایاں ہاتھ نہیں تھا، اس کا سر بُری طرح بھنبھوڑ رکھا تھا، پھر میں نے اور اس گورے شکاری نے شیرنی کا ایک مہینہ تک پیچھا کیا۔ وہ کئی مرتبہ نظر آئی، وہ جس جگہ منہ مارتی تھی وہاں خون یا پیپ کا دھبہ نظر آتا تھا۔ پھر وہ یکا یک غائب ہو گئی''۔

اچانک نظام الدین خاموش ہو گیا، میں نے بے تابی سے پوچھا، آگے کیا ہوا؟ دزدیدہ نگاہوں سے کرنل ولسن کی جانب دیکھ کر کہا۔ جناب میریا کی قاتل یہی شیرنی تھی جس کو مار کر آپ نے اپنا انتقام لے لیا ہے۔ یہ میری شکاری زندگی کا انوکھا واقعہ ہے کہ شیرنی صرف ان انسانوں کو مارتی تھی جن کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوتی تھی۔ وہ انسان کا گوشت نہیں کھاتی تھی۔ گھڑی والے بازو کو جسم سے الگ کر کے سر اور چہرے کو کچل دیتی تھی۔

.....❁.....

(ختم شد)